جدید تحقیق کی روشنی میں ترمیم واضافہ اور اغلاط کی تصحیح کے ساتھ
تاریخِ ادبِ اردو
مع تعلیقات
مصنف
رام بابو سکسینہ
مترجم
مرزا محمد عسکری
حواشی و تعلیقات
تبسم کاشمیری
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

جدید تحقیق کی روشنی میں ترمیم واضافہ اور اغلاط کی تصحیح کے ساتھ

تاریخِ ادبِ اُردو

مع تعلیقات

مصنف : رام بابو سکسینہ

مترجم : مرزا محمد عسکری

حواشی و تعلیقات : تبسم کاشمیری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU
MÁ TALIQAT

by

RAM BABU SAXENA

Translated by

MIRZA MOHD. ASKARI

Hawashi-o-Taliqat

TABASSUM KASHMIRI

Year of Edition: 2007

ISBN : 81-8223-266-X

Price : Rs.100/-

نام کتاب	تاریخِ ادبِ اُردو مع تعلیقات
مصنف	رام بابو سکسینہ
مترجم	مرزا محمد عسکری
حواشی وتعلیقات	تبسم کاشمیری
سن اشاعت	۲۰۰۷ء
قیمت	۱۰۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

فہرست

(حصہ نظم)

فہرست

حصہ نثر

باب ۱۹

تاریخ ادبِ اُردو

اہلِ نظر کی رائے میں

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

چیئرمین اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی لاہور

تبسم کاشمیری نے ایک نہایت مفید کام کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادبِ اردو کا ترجمہ (از عسکری) صحیح کر کے چھاپا ہے اور اس میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا ہے اور ذیلی حاشیوں میں جابجا زیرِ بحث واقعات کے سلسلے میں جدید ترین تحقیق کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے ان حواشی پر نظر ڈالی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے ایک مفید کتاب کو مفید تر بنا دیا ہے۔ میری رائے میں تبسم کی کاوش و کوشش قدر و تحسین کی مستحق ہے۔

'قومی زبان'، کراچی

جون ۱۹۶۸ء

تبسم صاحب ہمارے ان نوجوان محققوں میں سے ہیں جن کے بارے میں بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے۔

بالائے سرش ز ہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

انہوں نے اس کتاب پر جابجا مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے جن سے اصل کی اغلاط کی تصحیح ہی نہیں ہوتی بلکہ تاریخ ادب کے مختلف گوشوں پر جو تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ فاضل مرتب نے ان حواشی میں وہ خلا بھی پُر کئے ہیں جو اصل اور پھر اس کے بعد ترجمے میں رہ گئے تھے نیز بعض ایسے مقامات پر جہاں اجمال یا ابہام تھا وہاں تفصیل و توضیح سے کام لیا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ تاریخ ادب پہلے سے کہیں بہتر اور مفید نظر آتی ہے۔

'کتاب'، لاہور
دسمبر ۱۹۶۷ء

تبسم کاشمیری صاحب اردو ادب کے طلبہ اور اساتذہ کے بالخصوص اور قارئین ادب کے بالعموم شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جدید تحقیق کی روشنی میں ترمیم و اضافے اور اغلاط کی تصحیح کے ساتھ یہ تاریخی اہمیت کی کتاب خوب صورتی سے شائع کروائی۔ اتنی خوب صورتی اور خوش سلیقگی سے کہ اس کا پہلا اور اصل ایڈیشن بھی اتنا اچھا نہ چھپا تھا۔ اضافے، ترمیمیں اور تصحیحات مستزاد ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا یہ ایڈیشن اس کے دوسرے تمام ایڈیشنوں اور نسخوں کے لحاظ سے باطنی و ظاہری۔ بہتر اور فائق ہے۔

'ادب لطیف'، لاہور
دسمبر ۱۹۶۷ء

تبسم کاشمیری اردو زبان و ادب کے فاضل استاد اور ذہین نقّاد ہیں۔ انہوں نے جدید تحقیق و تنقید کی روشنی میں بڑی محنت، کاوش اور جستجو سے تاریخ ادب اردو کو مرتب کر کے یقیناً ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس ایڈیشن میں مرتب نے نہ صرف وہ غلطیاں دور کی ہیں جو اب تک ایڈیشنوں میں برقرار تھیں بلکہ واقعات و سنین کی تصحیح کے علاوہ جامع حواشی دے کر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں نئے دریافت شدہ حقائق کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اس طرح اس اہم تاریخی کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ بنا دیا ہے۔

پیش لفظ

(طبع ثانی)

رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا جدید ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اس امر کی بھرپور کوشش کی گئی تھی کہ حواشی میں تمام متعلقہ مواد کو نئی ترتیب میں جمع کر دیا جائے۔ اس ایڈیشن کا نہایت حوصلہ افزا جواب ملا تھا اور ملک کے علمی و ادبی حلقوں اور ممتاز جرائد نے اس کام کی تعریف کی تھی۔ اور اب عرصہ دس سال بعد اس ایڈیشن کو مزید اضافوں اور متن کی تصحیح کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

پیش نظر ایڈیشن میں خصوصی طور پر دکنی مصنفین کے بارے میں اضافے کئے جا رہے ہیں۔ جو کتاب کے آخر میں تعلیقات کی صورت میں لگا دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اس تاریخ کی ایک نمایاں کمی اور کمزوری کو دور کیا گیا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں بھی تعلیقات پیش کی گئی ہیں اور اب موجودہ صورت میں یہ ایڈیشن اپنی بہتر صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔

تبسم کاشمیری
شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور۔

۲۸ر جون ۱۹۸۰ء

پیش لفظ

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تصنیف "تاریخ ادب اردو" کا پہلا ایڈیشن انگریزی میں ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک ان کی یہ کتاب ادب اردو کی تاریخ کے طالب علموں کے لیے دلچسپی کا باعث رہی ہے جب یہ کتاب چھپی تو اپنی نوعیت کی واحد کتاب تھی۔ جس میں اردو نظم و نثر کی تاریخ کا انگریزی ادب کی تاریخوں کے مطابق جائزہ لیا گیا تھا۔ ادبی تاریخ کے متعلق جو نقطہ نظر آج ہمارا ہے۔ سکسینہ بھی اس سے واقف تھے۔ وہ ادب کو سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر اور منظر میں سمجھنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ مگر افسوس وہ ہر دور کا نقشہ اس طرح پیش نہ کر سکے۔ سکسینہ کا تنقیدی نظام بھی کچھ مضبوط نہیں ہے۔ وہ آزاد اور شبلی کے طریق کار سے خود کو آزاد نہیں کرا سکے ہیں۔ تنقید کا انداز تاثراتی ہے۔ تجزیاتی نہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ ہمارے قدیم اندازِ تنقید کا کامیاب نمونہ ہے۔ سکسینہ کی اس تاریخ میں محققین نے اب تک بہت سی خامیاں نکالی ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ کا یہ نقشِ اول آج بھی پاک و ہند کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس وقت تک اردو ادب پر تحقیق کے لیے اس قدر مصادر نہیں تھے۔ جس قدر کہ آج حاصل ہیں، یہی وجہ ہے کہ محققین کو آج اس میں بے شمار اغلاط نظر آتی ہیں۔ کتاب کے زیر نظر ایڈیشن کو اسی نقطہ نظر کے مطابق جدید تحقیق کی روشنی میں از سر نو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کے اصل متن کے ساتھ حواشی دیئے جا رہے ہیں۔ ان حواشی میں نہ صرف سنین و واقعات کی تصحیح اصل حقائق کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اکثر ادیبوں کے حالات میں نئے مواد کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ مکمل طور پر سامنے آ سکیں۔ یہ کتاب بنیادی طور پر طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی۔ مرتب نے بھی حواشی ترتیب دیتے وقت اس ضرورت کو سامنے رکھا ہے۔ حواشی کو حوالوں کی کثرت سے بوجھل نہیں بنایا گیا۔ متن کو درست کرتے وقت ممکن حد تک تمام مصادر سے رجوع کیا گیا ہے مگر صرف انہی حوالوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو واضح طور پر کسی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ حواشی کے سلسلہ میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جو حاشیہ مرتب نے لکھا ہے۔ اس کے ساتھ لفظ (مرتب) لکھ دیا گیا ہے۔ چند حواشی مترجم کتاب مرزا محمد عسکری کے بھی ہیں۔ نول کشور کے ایڈیشن میں ایسے حواشی کے سامنے ۱۲ کا نشان لگایا گیا تھا۔ اس ایڈیشن میں بھی مرزا محمد عسکری کے حواشی کے ساتھ یہ نشان برقرار رکھا گیا ہے

تبسم کاشمیری

۲۳ر ستمبر ۱۹۶۷ء

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

رام بابو سکسینہ ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے ۱۹۱۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں پاس کیا اور اوّل آئے۔ اسی برس ایل ایل بی کا بھی امتحان اسی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں ڈپٹی کلکٹر نامزد ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں مہاراجہ بڑودہ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ اسی زمانہ میں مہاراجہ کچھ عرصہ کے لیے انگلستان چلے گئے اور رام بابو کو ان کی عدم موجودگی میں تاریخ ادب اردو تیار کرنے کے لیے وقت حاصل ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ممبر بنے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں سرکاری عملہ کے ساتھ شرکت کی اور یورپ کی سیاحت کی۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک حکومتِ ہند کی جانب سے لیجسلیٹو کونسل میں چیف وہپ رہے۔ ۱۹۳۸ء میں دوبارہ یورپ کی سیر کی۔ وہاں کے بعض ادیبوں سے ان کے تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ سکسینہ دو بار آئی۔ سی۔ ایس کے لیے نامزد ہوئے۔ یوپی میں ڈائریکٹر پبلسٹی اور سیکرٹری اطلاعات رہے۔ حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری رہے۔ انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کے لیے حکومتِ ہند کے وفد کے رکن نامزد ہوئے۔ ہندوستان میں پی۔ ای۔ این سوسائٹی کے قائم کرنے والوں میں سے تھے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کے قیام میں بھی شریک رہے۔ ۱۹۵۵ء[1] میں ساہتیہ اکیڈیمی میں اردو کے نمائندہ کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ ہند کی بے شمار کانفرنسوں کی صدارت کی۔ ورلڈ اورینٹلسٹ کانفرنس برسلز (۱۹۵۱ء) کی سب کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہوا۔

تصانیف

(۱) تاریخ ادب اردو (۲) یورپین شعرائے اردو (۳) اوراقِ پریشاں (۴) مرقع شعراء، (۵) مثنویاتِ میر بہ خطِ میر۔ اس کے علاوہ جب ان کا انتقال ہوا تو بعض کتابوں کے مسودات اشاعت کے لیے تیار تھے۔ ان میں ایک اشاریت (سمبلزم) کے موضوع پر، اور دوسری اردو فارسی کے ان شعراء کے حالات پر مشتمل تھی جو ہندی میں بھی لکھتے تھے۔ بقول سیّد احتشام حسین یہ دونوں کتابیں وفات کے وقت پریس میں تھیں[2]، نہ معلوم ان کا کیا حشر ہوا؟ اس کے علاوہ وہ "انگلش مین آف لیٹرس سیریز" کی طرز پر میر پر ایک کتاب ختم کر چکے تھے۔ اسی نوعیت کی ایک کتاب سودا پر لکھی تھی۔ جس پر نظرِ ثانی کا کام باقی تھا۔ غالباً ان کی اشاعت کی نوبت ہی نہ آئی۔ انیس پر بھی اسی ڈھب کی ایک کتاب کا آغاز کر چکے تھے۔ اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ پی۔ ای۔ این کے لیے لکھ رہے تھے جو نامکمل رہی[2]۔ جدید اردو ادب پر دو جلدوں میں کتاب لکھنے کے لیے مواد فراہم کر لیا تھا۔ اسے بھی عملی صورت نہ دے سکے۔ (مرتب)

---

[1] آج کل مارچ ۱۹۵۸ء اور جون ۱۹۵۵ء [2] ایضاً

مرزا محمد عسکری

مرزا محمد عسکری ۱۸۶۹ء میں بمقام لکھنؤ محلہ محمود نگر میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام مرزا محمد تقی تھا۔ جو مرزا خانی کے بیٹے تھے۔ مرزا خانی عہدِ غالب میں طویل عرصہ دلی کے کوتوال رہے تھے۔ مرزا عسکری اس وقت پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد پچاس برس کے ہو چکے تھے۔ اس لیے لاڈ پیار میں پلے۔ ۹ برس تک حروفِ ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ اس سن میں مولوی ہدایت حسین اور مولوی شمس الضحیٰ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ گلستان، بوستان، انوار سہیلی اور عربی کی کتب مولوی محمد یحییٰ سے پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئے تو انگریزی پڑھنی چاہی۔ بزرگوں نے شدید مخالفت کی۔ مگر تعلیم جاری رہی۔ انٹرنس درجہ اوّل میں پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۱ء میں کیننگ کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی اور تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۸۹۵ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۰۷ء کے قریب حکومتِ ہند کے لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ ٹرانسلیٹر ہو کر چلے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں مہاراجہ محمود آباد کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ اور دیگر سہولتیں ملیں۔ مگر اکتا گئے۔ ۱۹۲۲ء میں دوبارہ کلکتہ پرانے شعبہ میں چلے گئے۔ یہاں سے ۱۹۲۵ء میں سبکدوش ہو کر لکھنؤ چلے آئے اور ادارہ نول کشور سے متعلق ہوئے۔ مگر ۱۹۳۰ء میں یہاں سے قطع تعلق کر لیا[۱] اور اپنے تصنیف و تالیف کے مشاغل میں مصروف ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

کُتب :

(۱) واقعات محاصرۂ گولکنڈہ (ترجمہ وقائع نعمت خاں عالی) (۲) ادبی خطوط غالب،
(۳) دیوان اوّل میر (تصحیح اور نوٹ کے ساتھ) (۴) کلیاتِ نظیر اکبر آبادی (۵) غوث الاعظمؒ
(۶) لغت خیالات ترجمہ (— DICTIONARY of THOUGHT. —) اس کے کچھ حصے رسالہ "ندیم" میں شائع ہوئے۔ (۷) تاریخ ادب اردو (ترجمہ) (۸) نوادر
(۹) کلیاتِ انشاء (۱۰) مجموعہ مضامین اور تراجم (تین جلدیں)
(۱۱) شیخ جی (۱۲) من کیستم (آپ بیتی)
(۱۳) آئینہ بلاغت
(۱۴) مرزا غالب کی شاعری

(مرتب)

---

۱ : آجکل یکم جولائی ۱۹۴۷ء

(از مصنف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کئے جائیں۔ اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کئے جائیں جس میں وہ شعرا اور نثار گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ ان خیالات وخصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانہ پر تھا۔ اس کی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ زمانۂ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کی جائے تاکہ انگریزی دان جماعت بھی اردو ادب سے کماحقہٗ واقف ہو جائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے۔ تقریباً چار برس کا عرصہ گزرا کہ اس نے باوجود اپنی سرکاری مشغولیتوں کے اس کتاب کو ختم کر دیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں رد و بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانۂ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہو جائیں۔ یہی وجہ اس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اُردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدے کے لئے تیار کی جائے، اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جس قدر میں آگے بڑھتا گیا اور اس کی غرض بدلتی گئی۔ حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہونی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ نقص آئندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔

اس بات کی شکایت کا موقع بھی ہو سکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیئے گئے میں نے یہ فروگذاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سینٹسبری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جس کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ بھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا

اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جس میں ہر دور کے خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس مع ان کے انگریزی ترجمہ کے اگر ممکن ہوا تو منظوم ترجمے کے بالتفصیل دیئے جائیں۔ یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیئے جا سکے اس کی تلافی انشاء اللہ یوں ہو جائے گی کہ ایک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اردو" ہوگا شائع کیا جائے گا۔

ایک اور اہم فروگذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ موجودہ دور کے اُردو شعراء کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس کتاب کے متعلق پروفیسر سینٹسبری کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کروں گا "اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہے تو وہ مسخرہ بھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو وہ اس سے بڑھ کر احمق ہے" مجھ کو اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جن کی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کی جا سکی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائے گی۔ اگر میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کے دل میں اس ادب شریعت یعنی ادب اردو کا صحیح ذوق پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور ان کو شوق دلاؤں کہ وہ اس قصر عالی کو جس کی میں نے صرف بنیاد ڈالی ہے۔ تکمیل تک پہنچا دیں۔

میں تہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جن کی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور ان سے فائدہ اٹھایا مگر اس کا اعتراف متن میں نہ کر سکا۔ (۲) ان تمام اصحاب کا جنھوں نے مجھ کو کتابیں پڑھنے کے لیے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخ دلی سے دیا (۳) ان حضرات کا جنھوں نے مسودۂ کتاب پڑھا اور تصحیح پروف میں میری مدد کی (۴) ان کا جنھوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے لہٰذا میں ان سب کا مجموعی حیثیت سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رام بابو سکسینہ (از بریلی دیوپی)

التماس مترجم

ادب اُردو تشنہ تھا کہ اس کی قدیم تاریخ یعنی اس کی نشوونما، اس کی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اس میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں۔ ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو ان لوگوں سے بالکل مختلف ہو جنھوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے۔ صدہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت وضاحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دَوروں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ متاخرین میں آب حیات اور جلوۂ خضر کہہ سکتے ہیں۔ جن سے ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اس کی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرض شک میں ضرور پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی اپنی صنعت میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جس کا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جب کہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو ان کو بآسانی معلوم ہو سکے۔ قلمبند کر دیئے اور کچھ نمونے ان کے کلام کے پیش کر دیئے اور مختصر طور پر اپنی رائے ان کے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور وہ تغیرات جو ان کے عہد تک زبان میں ہوئے تھے اس کے بیان کرنے کے نہ وہ شائق تھے اور نہ اس کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ میری رائے میں اس کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی ابتدا و ارتقا اور اس کے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی مگر میری ناچیز رائے میں اتنی بات ان سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرز ادا بجائے سادہ اور سائنٹفک رکھنے کے انھوں نے نہایت رنگین اور پر تصنع رکھا جیسا کہ ان کی دیگر تصانیف کا ہے اور اس کا خیال نہیں رکھا کہ یہ تصنیف ایک خاص انداز کی ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ان کی کتاب اس قدر دلچسپ ہو گئی کہ اگر ایک مرتبہ اس کو شروع کیجئے تو پھر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد طبیعت اس سے اکتاتی نہیں اور یہ بات گلستان سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زمانہ اس پر بے دردی سے کئے جا رہے ہیں یہ بھی اس عبارت کی رنگینی کا نتیجہ

ہے کہ کتاب کو پر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہارِ واقعات میں ایک مورخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے یا ایسے پر زور اور رنگین الفاظ استعمال کئے گئے جو اس موقع کے حسب حال نہ تھے۔ تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات کی بوچھار جو اس پر ہو رہی ہے، میری رائے میں ایک نتیجہ لازمی بلکہ خمیازہ اس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنف مبرور نے اپنی عبارت اور طرزِ ادا کے اختیار کرنے میں شروع کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا ...... دور اپنے ہی زمانے میں ملتا ہے جس میں لالہ سری رام صاحب کی مشہور و معروف تصنیف خمخانۂ جاوید ہے جس میں سلاست عبارت، روانی بیان اور متانت کے ساتھ بے حد کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ ان لوگوں کا بھی تذکرہ جو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس تذکرہ کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا مولوی عبد الحئی صاحب مرحوم کا اور شعر الہند مولوی عبد السلام صاحب ندوی اور سیر المصنفین جناب تنہا (نثاروں کا تذکرہ) بھی ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو اب تک پردۂ خفا میں تھیں معرضِ ظہور میں آ گئیں۔

مگر غالباً غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہے اور انہی وجوہات سے ان تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اس طرح تذکرۂ گل رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے ایراد پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے باکمالوں کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے یا نظر انداز ہو گئے ہیں۔ شعر الہند بحیثیت مجموعی شعراء اردو کی ایک تاریخ ہے مگر ژولیدہ بیانی نے اس کو بھی حدودِ معین سے نکال دیا ہے۔ سیر المصنفین یا نثر نگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص نثر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ ادبِ اردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور گراں بہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

"ہسٹری آف اردو لٹریچر" جناب رام بابو صاحب سکسینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو انہوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش، جس کوشش، زورِ مطالعہ اور وسعت نظر سے اس میں کام لیا ہے۔ اسلوب بیان، تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے۔ شعراء اور نثاروں کے کلام کا توازن کر کے ان پر جیسی صحیح بے باکانہ اور

بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ تلاش و تجسس کا یہ عالم ہے کہ ان واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے۔ ایک ایک لفظ سے ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں توازن و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز کیجئے زمانہ حال میں جس قدر کتابیں زبان اردو کی تحقیق یا اس کی نظم و نثر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں ان کے مصنفین زبان انگریزی سے کما حقہ، واقفیت تقریباً پندرہ بیس فی صدی سے زیادہ نہیں رکھتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ پرانے رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا۔ موجودہ انگریزی داں طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور ان کی آنکھ انہی باتوں کو ڈھونڈھتی ہے جو زبان انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت اور دلچسپی میں ضرور ترقی ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اسی روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مورخین سینٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کے یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب ان اصحاب کے واسطے بہت مفید ہو گئی جنھوں نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری یا آئی، سی، ایس کے واسطے ادب اردو لیا ہو۔ جس قدر سوالات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جا سکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ بخوبی اور بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود سوالات بنانے میں بھی بہت معین ہوگی مگر چونکہ اردو داں طبقہ اس سے محروم تھے نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہئے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہئے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لئے مخصوص تھی اس وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جس کو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں۔ اس کے لئے میرے نزدیک اسی مطالعہ اسی تعمق نظر اسی وسعت معلومات، کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات دوسری زبان میں لانا اور پھر ان کی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اردو ہے اور اردو ہی کے جامہ میں اس کو پھر منتقل کرنا تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست رائے بہادر کنور رم بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انہیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ میں اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اردو ہی میں تھیں مگر قدیم تذکرہ نویسوں نے اس کو فارسی میں بیان کیا ہے

پھر انھیں کو اردو میں بیان کیا اور پھر اردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لئے ان میں کچھ دیچھ تباین ہو گیا۔ اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر ان کو اُردو میں دوبارہ پھر اسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوذ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو ان کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا ہے بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصنف نے اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا۔ مگر اُردو میں ان کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی۔ ان کو بھی اس میں بیان کیا گیا اور اس میں تحقیق و تنقیح کما ینبغی کی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور دقیع نہ تھا۔ اس لئے اصل کتاب میں اس طرف توجہ نہیں دی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں اکثر کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔

کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اردو کے لئے نقد و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لئے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ورنہ ظاہر ہے گلشن بیخار میں نظیر اکبر آبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جس میں وہ سب اساتذۂ دہلی معرض تحقیر میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیخار (یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ) سے برائے نام بھی تعلق تھا اسی طرح سے قاطع برہان دیکھئے، اور قاطع برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بے پایاں طوفان برپا کیا تھا۔ اس کی مہیب آوازیں آج تک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کا معاملہ درپیش ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لئے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جس کے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے اس لئے اس میں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئیں گی جو اصل کتاب میں تھیں کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے غرض یہ کہ یہ ایک کوشش و کاوش ہے جو ارباب نظر کی خدمت میں ہدیۂ ناز بنا کر پیش کی جاتی ہے اور نگاہ منتظر طغرای قبول کی متمنی ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں، جو ایک ادیب کی معلومات کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ یعنی زبان اردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اس کا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اس سے سرنگوں ہونا اور مٹ جانا۔ نظم کے ادوار مختلفہ ان کے مشہور و معروف افراد۔ ان پر تنقیدیں۔ موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام اصناف نظم پر روشنی ۔ ان کی ابتدا و انتہا کے تاریخی نقطۂ نظر سے انکشافات۔ نثر اردو کے مشہور مصنفین۔ اس کی عہد بعہد کی ترقیاں۔ ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور شاعروں کا ذکر اور نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں غرضکہ سبھی کچھ ان اوراق پریشاں میں موجود ہے۔ اُردو سے

جدید کی جو روش بعض ناعاقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اصلی طور پر خواہ اس کا کوئی بھی ذمہ دار ہو مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست، شیرینی، روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنا دے گی۔ میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ وہ اس قدر دشوار ہو جائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں گنجلک نہ ہو۔

مرزا محمد عسکری لکھنؤ۔ ۱۵ فروری ۱۹۲۹ء

باب ۱

زبانِ اُردو اور اس کی اصل

اردو سے کیا مراد ہے عام طور پر لوگ اردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دار السلطنتوں میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے کہ اس میں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اس کی شاعری کی بحریں اور اس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اس غلطی کی بنا پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصۂ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اُردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز ان کی استعداد قبولیت عام کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے۔ گو کہ "اُردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صَرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میر امن اور بعض قدیم اردو نثاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلّی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو و نما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جس کو زبان ترکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں کو قبول کر لینے کا مادہ اس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اس زمانے میں انگریزی تقلید میں اردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں مگر یہ لفظ ہماری رائے

میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستھانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی۔ گو اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اردو کی اصل سمجھی جاسکتی ہے۔

اردو اور ہندی کا تعلق

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اس کی شاخیں ہیں یعنی بنگارو، برج بھاشا قنوجی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت لفظ رکھ دیئے گئے۔ اسی اعلیٰ ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے ہیں مگر سچ پوچھئے تو اردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے اگر کچھ ہے بھی تو نشو و نما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اردو چونکہ مسلمانوں کے سایہ عاطفت میں پلی اس لئے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی برخلاف ہندی کے جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

زبان اور ادب اردو فارسی کا احسان مند ہے

شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی جوں جوں اس میں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اسی قدر اس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدت کی چاشنی دینے کے لئے ان کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصل زبان سے بالکل اجنبی تھیں اور اس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جاسکتے تھے اردو شاعری پر بھی فارسی شاعری کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں استعمال

ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین، طرز بیان، تخئیل، تلمیحات، خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ نثر کا بھی یہی حال تھا وہی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نثر کی جان تھی اردو میں ان کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اردو پر اس قدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں۔ اظہار خیالات، مضامین اور طرز ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ترقی شان اس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اردو کی صرف و نحو کی کتابیں فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتاً زبان فارسی جو ان کی مادری زبان تھی ہندوستان کی "شاہی زبان" بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اسی طرز ادا اور عبارات وغیرہ کی تتبع اور ناقل ہو گئی۔ لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اس وقت کے لوگ بھی پرانا طرز چھوڑتے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے دیسی زبان میں جو اب شرفا اور معزز شہری لوگوں سے چھوٹتی جاتی تھی اور اطراف شہر دیہات میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رُخ کیا اور اس کو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے مثلاً چند کوی کی "پرتھی راج راسو" کو دیکھئے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔ دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اسکا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لئے اسکو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا۔ شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انہیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے۔ جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا۔ مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی ان کا پایۂ تخت بن گیا۔ اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لئے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسال آتے تھے اور مال غنیمت لے کر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط و ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور ان کو اپنے طرز پر استعمال کرے۔ اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا۔ کیونکہ فارسی کے زبان دان اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش

سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے یہ تغیر گو کہ ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں
جوں مسلمانوں کی جڑ مضبوط ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا
اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے یہ
حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط ہو
گئی اور اس کی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی - عربی - ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے
کیونکہ وہ سننے میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زوردار تھے اور ان کے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ
سمجھے جاتے تھے، اس کے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے ملتیں اور تقرب
شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتداً ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے جب
قدیم ایام انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "اینگلو سیکسن" کی بھی "نارمن
فرنچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی۔ پس جس طرح زبان انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں
پائی جاتی ہیں وہی صورت اردو کی بھی سمجھنا چاہئے۔

اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں۔ مسلمان جب بحیثیت فاتح اس ملک
میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں
مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جا سکتے تھے اس لئے بجنسہٖ وہی
فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام
مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان
تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو رزم بزم، حسن و عشق کے افسانوں کے لئے نہایت موزوں تھی۔ اس لئے
لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی بولنا پسند کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار
معلوم ہوتے تھے۔ ایسے پر زور لفظوں کے سامنے پرانے دیسی الفاظ اور محاوروں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا
پڑا اس لئے کہ زمانہ ان کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے جب یونانی
اور لاطینی علوم کا احیاء اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اس زمانہ میں بھی موٹے موٹے عالمانہ الفاظ بولنے کا فیشن
ہو گیا تھا۔ بہرحال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی
کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آ سکے اور چونکہ مفتوح اپنے
مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی زبان سے زیادہ
اخذ کیا بہ نسبت اس کے کہ ان کے مالکوں نے ان کی زبان سے فائدہ اٹھایا۔

اظہار قابلیت کے لئے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اردو ادب کی ابتدا
شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی جس کو وہ فارسی الفاظ و

محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا جنہوں نے بلاشک اس کے ساتھ بہت کچھ کیا۔
ان کی آغوش تربیت میں رہ کر اردو کا نشو ونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور، صفت و موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سینکڑوں کے فقرے جو حرف ربط "بہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں۔ اردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو دیسی مروجہ قواعد صرف و نحو کے بالکل خلاف تھا آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں یہ ضرور ہوا کہ فارسی کے اثر سے اردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اردو زبان کی ابتدا ہوئی تھی بہت کچھ فنا ہو گئیں۔

یورپی زبانوں کا اردو پر اثر فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبان ڈچ اور فرنچ کے چھوڑے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اس قدر دھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔ پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اردو لغات میں معتدبہ اضافہ کیا۔ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالک مشرق میں گویا تجارت انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں، ان کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے۔ انہوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ان کی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہو گئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے یہ سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس کو بہت ایسے مواقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی۔ سب سے زیادہ اثر بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح دراوڑی زبانیں مثلاً مرہٹی، اسامی اور اڑیا بھی اس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اردو بھی اس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اس وقت پڑ رہا تھا جب دکھنی زبان جو پرتگالی اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح دوسری زبانیں اردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں۔ پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں ان کو قبول کر سکتی تھیں۔ اسی ہیئت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں

داخل نہیں کئے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیئے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے مسخ ہو کر داخل ہوئے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں ان ممالک میں رائج ہو گئے تھے۔ پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً؟ از قسم میوہ جات و اشیائے طعام، اچار، اناس، انوس، (قسم انب) بسکٹ، کاجو، پمپیڑے، (قسم مچھلی) پپیتا، تمباکو، ترنج، چاء، ساگو، گوبھی وغیرہ۔

از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ، الپین، الماری، ارغنون، بجرا، بالٹی، بوتل، پیپا، پستول، پریگ، چابی، صابون، کمپچ، کپتان، کارہین، کارتوس، میز تولیہ، گاز وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری۔ گرجا۔ کرسس وغیرہ

لباس میں۔ سایہ۔ قمیص۔ کاج، اسپیٹ وغیرہ

متفرق الفاظ۔ مثلاً انگریز، آیا۔ ببا، پاگر (تنخواہ)، پاؤروٹی، چھاپہ، نیلام، مستری، کمرہ روپیہ وغیرہ۔

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان میں کی لہٰذا ان کے نام بھی اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب "شراب پرتگالی کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے۔ اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہے گی انگریزی علم ادب نے اُردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا لیکن اتنا اس موقع پر ضرور بتا دینا چاہئے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اردو میں داخل کئے جن کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہو گئے تھے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اس کی بدولت اردو میں شامل ہو گئے۔ اردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اُردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اردو کو مالدار ہونا چاہئے خواہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اس کی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے اور نیز اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو۔ نظم کی عبارت بہ نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فارسی محاورات اردو نظم میں بکثرت شامل کر دیئے گئے اگر اردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ شروع میں مقفیٰ عبارت

بہت پسند کی جاتی تھی جس میں بے حد تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جس میں ظہوری اور بیدل کی مرصع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی کے بعینہٖ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سر سید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا جبکہ مغربی تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفی عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دَورِ جدید میں نثر نگاری کی وہ شان بھی باقی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ عملی دنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے۔ اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات عربی کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستانِ نظم کی آب پاشی اب بھی چشمۂ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انہیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نثر کی طرح نظم میں کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پرانی لفاظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہلِ ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر ان کی کثرت اور جا و بیجا استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشا پردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے رہتے ہیں۔ تحریر میں آتے وقت فارسی زبان سے بدل جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی جدت عظمت اور شانداری ہے۔ ابتدا میں بے شک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اس وقت تک اس میں بھونڈاپن تھا۔ نہ اس پر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت ہی تھی کہ اس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہو سکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جا سکے اس میں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کو جذب کرنے کا مادہ ضرور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جو الفاظ اور بندشیں اس کو ملتی گئیں وہ سب اس میں شامل ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں پختگی اور صفائی آتی گئی۔ دَورِ اول کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اردو کا عنصر غالب ہو گیا اور غالب نے مغلوب کو جذب کر لیا۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اردو میں مل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے۔ بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ

اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش ہے کیونکہ یہی کثرتِ الفاظ جو اُردو کا مایہ ناز ہیں اس کو اتنا لوچ دار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام | قدیم انگریز مورخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں۔ اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کرتے تھے۔ شروع اٹھارہویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اس کو "لنگوا اندوستانی" کا لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورخین اس کو "موزر" کہتے تھے۔ جان گلگرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے لفظ "ہندوستانی" زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروج ہو گیا گو کہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے جبکہ مسٹر پول نے سب سے پہلے اس کو استعمال کیا تھا۔ "اُردوے معلّٰی" کا معزز خطاب شاہجہاں نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہو گئی تھی۔

لفظ "ریختہ" (یعنی وہ زبان جس میں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان (ریختہ) اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بازاریں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی، فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ ابتدا میں نظم کے واسطے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اس زمانے میں بہت کم تھا۔ میر اور مصحفی تک کے زمانے میں اردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا رسم الخط | اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں۔ البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیئے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د ر۔ پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

نظم اُردو | نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے۔ لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسنٹ" کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروفِ علت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں اور اس کو "اشباع" کہتے ہیں نظم اردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے۔ مروجہ بحریں انیس ہیں جن میں سے بعض عربی کیلئے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے اور ان کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لئے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیئے تھے ان کی تکرار یا تغیر و تبدل سے مختلف بحریں قائم ہو گئی ہیں یہ الفاظ عموماً عربی الفاظ کے مادے برتے ہیں اور انہیں سے اشعار کی

تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحریں انہیں سے قائم ہیں۔ تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن ۴ بار یا رکنوں میں رد و بدل ہوتا ہے۔ جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہیں۔ بحر یر شدہ حروف کے ساتھ ان حرفوں کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں، تقطیع میں شمار نہیں کئے جاتے۔ الف ممدودہ شروع لفظ میں جب آتا ہے دو حرف کے برابر اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے ان الفاظ کو جن سے تقطیع کی جاتی ہے "رکن" کہتے ہیں جس کے معنی ستون کے ہیں جس پر عمارت یا خیمہ ہوتا ہے۔ پورے شعر "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں۔ مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ یہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً دس سے ۱۷ تک گو کہ اس کی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔ قصیدہ میں عموماً کسی کی مدح یا ہجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵۔ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰ تک مگر اس کی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہئے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لئے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی ہونا لازمی ہے۔ قطعات میں اکثر پند و نصائح کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

رباعی۔ اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو دوبیتی بھی کہتے ہیں۔ پہلا دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ رباعی کے لئے خاص مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرع کو عموماً موثر معنی خیز اور زوردار ہونا چاہئے۔

مثنوی۔ یہ صنف رزم و بزم، حسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہئے۔ ردیف ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں۔ مثنوی کے لئے عموماً پانچ بحریں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک سات ہیں۔ مستزاد اس کو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھائے جائیں اور یہ زائد لفظ اسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے مگر ان کا قافیہ کہیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ترجیع بند اور ترکیب بند یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جدا کرتا ہے

اور قافیہ میں بھی ان سے علیحدہ ہوتا ہے اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو اس کو ترجیع بند کہتے ہیں، ورنہ اگر بیت بدلتا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مربع چو مصرعی نظم کو کہتے ہیں جس میں سب مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ مخمس میں بجائے چار کے پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔ پانچویں مصرعے کا قافیہ بدلا ہوتا ہے اور باقی صورت مربع کی سی ہے مسدس کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے فرق اتنا ہے کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن مسبع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ محبت اور جدائی کی تکلیف و مصیبت کی شکایتیں کرتا ہے گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اس طرح باقی رہیں تو پھر اس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تاریخ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکالے جاتے ہیں

فرد۔ کسی تمام یا نا تمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔
قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔ نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف اس کے بعد سبب تالیف اور کچھ فخریہ اشعار آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے۔ مجموعہ نظم کو کلیات کہتے ہیں جس کی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔ قصائد۔ غزلیات۔ قطعات۔ رباعیات، مثنویات وغیرہ۔

نثر کی تین قسمیں ہیں (۱) عاری جو بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ (۲) مرجز جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا (۳) مسجع جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن۔ نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں۔ مطرف میں آخری الفاظ کے ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ متوازن میں ہم وزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ "تذکرہ" میں شعرا کے سوانح و حالات مختصراً بیان کئے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعۂ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

اُدب اُردُو کی ترقی کے ابتدائی دَور

نظم کا تقدم نثر پر۔ اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادب اردو کے ساتھ

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے قافیہ پیمائی اور تُک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقائے تہذیب انسانی میں جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو محکر دماغی کا نتیجہ ہے سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے گو کہ ظاہراً نثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کے واسطے موزوں ہے۔

زبان اردو کی دیوی اپنے ساز طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ ادب اردو جو دراصل فارسی کا متبع اور ناقل ہے اس کو اپنے پیشرو کی تقلید بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے، اور چونکہ اُردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جب کہ اس کا ادب ہنوز عالم طفلی میں تھا۔ قوت تخئیل اور اظہار جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہذا جب اس کی پیدائش کا وقت آیا تو اپنے استادوں کے دماغوں سے منروا[1] کی طرح دفعۃً نکل آئی اور اظہار خیالات و جذبات کے لئے چونکہ نثر عام طور پر پسند نہیں کی جاتی ہے لہذا متقدمین اُردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے۔

سب سے پہلا اُردو شاعر امیر خسرو دہلوی،

زبان اردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے

---

[1] یہ یونانی دیومالا کی طرف اشارہ ہے جس میں مرقوم ہے کہ منروا جو یونانیوں میں عقل اور علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی۔ جیوپیٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعتاً پیدا ہوئی تھی۔

پہلا شاعرِ زبان اُردو کا اس دُھندلکے میں جو صاف طور پہ نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جن کی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطیِ ہند" ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کئے اور سب سے پہلے اُردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلی غزل اردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اس کی ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور ایک اردو سے[1] اور بحر فارسی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکرنیاں، انملیاں، دو سخنے، دوہرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جن میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بشکل اُردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو تیرھویں صدی عیسوی میں ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ اودھ) میں پیدا ہوئے[2] اور متعدد شاہان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید و محبوب خاص تھے جن سے ان کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۱۳۲۵ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن ان کی بڑی قدر دانی کرتا تھا اور ان کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں اور ان کی کتاب "خالق باری[3]" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ ہی دو لفظ "خالق" اور "باری" اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اس کے موجد و مخترع کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے زمانے میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر پختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ ان کا دور ابتدائی دور ہے اور گو اس وقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آئندہ ترقیوں کی داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی۔

اردو کی پختگی کا زمانہ امیر خسرو کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعرائے اُردو کے عہد تک بڑا فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اس کے حقیقی نشو و نما اور مضبوطی کی کہی جا سکتی ہے۔ زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت الوسع

---

[1] فارسی زبان میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جس کا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ اردو میں کر دیا ہے مثلاً "سودائے رخ تو کشت ما را" کشت کے معنی اردو میں مارا کے ہیں۔

[2] مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت ۶۵۱ھ ہے۔

[3] خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں اس کا مصنف ضیاء الدین خسرو ہے اور کتاب کا سال تصنیف ۱۰۳۱ھ/۲۲-۱۶۲۱ء ہے۔ (دیکھئے مقدمہ خالق باری از پروفیسر محمود شیرانی انجمن ترقی اردو دلی ۱۹۴۴ء) [مرتب]

اور وسعت کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندا نشاپردازی کی اغراض کے لئے اس کے لغات میں معتد بہ اضافہ ہونا چاہئے تھا۔ اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اس نے اپنے آغوش محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی۔ چنانچہ ملک جائسی (سنہ ۱۵۴۰ء) کی پدماوت جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (سنہ ۱۴۴۰ء لغایت ۱۵۱۸ء) کے بھجن اور بابا تلسی داس (سنہ ۱۵۵۰ء لغایت ۱۶۲۳ء) کی تصانیف میں ایسے الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

زبان عہد اکبری | زبان اردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انہیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہونچانے اور اس کو پھیلانے کے لئے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی اس کوشش کی رفتار عہد اکبری میں بڑی تیز تھی۔ شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہوجائیں چنانچہ وہ خود بھی کبھی کبھی دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اس کے اہل دربار بھی اس کی تتبع میں ہندی میں کہتے تھے اور اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کے درباری شاعر سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے اور عبدالرحیم خانخاناں دربار اکبری کا رکن اعظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصا شاعر تھا چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی یکجہتی اور اتحاد تھا۔ اس وجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اسی زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اردو کی اشاعت کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صیغۂ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پڑتال میں ان کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حساب نویسوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بعد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اس کا حکم دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے واسطے بہت ضروری قرار پاگئی۔ کسی قسم کی ترقی اور دربار رسی بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دے دیا کہ صیغۂ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں ان کے لئے فارسی زبان کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں ہوئی تھی وہ شاہجہاں کے دور میں درجۂ تکمیل کو پہنچی اور اب زبان اس قابل ہوگئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے۔ ترقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گولکنڈہ و بیجاپور | امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اردو کی نمو کے واسطے صبح کاذب کہنا بجا ہے جس کی صبح صادق ہمارے نزدیک ملک دکن کے مطلع پر طلوع ہوئی... مسلمان

شاہان بیجاپور گولکنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود صاحبان علم و فضل اور اہل علم کے بڑے قدر دان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱ - ۱۶۱۱ء) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ - ۱۶۲۵ء) عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ - ۱۶۷۲ء) ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲ - ۱۶۸۲ء) جو ۱۷۰۴ء میں قید میں مرا) یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مربی اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکھنی میں شعر کہتے تھے جو اردو ہی کی ایک شاخ ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں اس طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ - ۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸ - ۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ بزبان فارسی اس کے دربار کے مشہور شاعر و نثار ملا ظہوری ترشیزی متوفی ۱۶۱۶ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اردو نثاروں نے اس کی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جس کے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکھنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا ان کتابوں کی وقعت اس قدر ضرور ہے کہ وہ زبان و ادب اردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں

ولی دکھنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء

جب ولی کا نیر اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افق شاعری پر اس وقت ضیا فگن تھے سب ماند پڑ گئے۔ ولی کو ریختہ کا موجد۔ گویا اردو کا چاسر[1] خیال کرنا چاہیئے اسی زمانہ میں اردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔ ولی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اسی کو دیکھ کر اور اپنے سامنے رکھ کر اس وقت کے تمام شعرائے دہلی نے ترقی کرنا شروع کی۔ ولی کا کلام نہایت صاف، سادہ، فصیح اور پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہوں سے پاک ہے۔ تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے

قدیم شعرائے دہلی حاتم، آبرو، آرزو

دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے منتقل ہو کر دہلی میں آ گیا۔ اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی شعر و

---

[1] چاسر زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر ۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء اس کی مشہور تصنیف کنٹربری ٹیلس (کنٹربری کے قصے) زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں متبع ولی کے پیدا ہو گئے جو ان کے کلام بڑی قدر کرتے تھے اور اسی طرز پہ کہتے تھے۔ اب اردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اس کی مدمقابل اور حریف بن گئی گو ابھی تک اس میں وہ کنگی اور پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اس کی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اس سے دل بہلاتے تھے۔ سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اس میں جان باقی تھی اور درباری زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اُردو کے کمزور اور نوخیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہزور پختہ کار پہلوان سے مقابلہ کر سکے اس لئے اسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ قدیم شعرائے اُردو سب سے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

ولی کے متبع ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء)، خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء)، ناجی، مضمون، آبرو اور بہت سے شعراء پیدا ہوئے جن کو اردو شاعری کے آباد سمجھنا چاہئے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف و سادہ اور تصنع و تکلف سے بہت کچھ پاک و صاف ہے۔ نشست الفاظ میں بہت زور طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں ولی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں۔ ان کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحریں اُردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ ان کے زور طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں ان کی مشاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے۔ مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ بہت کم ہو جاتا ہے ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

میر سودا کا زمانہ۔ اس زمانہ کی ترقیاں زبان اور شاعری میں اصلاحیں

یہ زمانہ اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینت الفاظ اور جدتِ خیال سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ یہ میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ ہے جو اردو شاعری کے رکن رکین اور استاد اعظم مانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اپنے حسنِ ادا، حلاوت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہمعصر اور نیز ماسبق حریفوں پر گوئے سبقت لے گئے۔ ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہنچ گئے۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سودا، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت اور ضیا ان کے ہمعصر ہیں جو سب علاوہ اردو کے نظم فارسی کے بھی استاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہٰذا وہ قدرتاً ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی ان کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہو گئی جو ولی اور ان کے ہمعصر شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنسہٖ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر لیے۔ ان کا کلام اردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور موثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انھوں نے کھنگال ڈالا جس میں سے صدہا جواہر ریزے منتخب کر کے زبان میں داخل کیے گئے۔ گل و بلبل اور قمری و شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اردو میں بھی داخل ہوئے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے۔ فن شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی۔ نقائص اور معائب سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بحروں میں کہی جانے لگیں جو اس سے پیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہ ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اسی حد تک کہ ان سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا وہ کلام میں گھل مل جاتے تھے اور بدنما نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اس عہد میں رائج ہوئے۔ مثلاً واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مثلث، مربع، اور مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لیے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن پیشتر سے مروج تھے ان میں بھی ترقی ہوئی۔ صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہو گئی گو بعد کو پھر رائج ہو گئی۔ میر کو یہ صنعت کم پسند تھی لیکن اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ مظہر اور ان کے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اس میں بڑی ترقیاں کیں اور آیندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور انہیں پر مبنی تھیں۔ اس عہد میں زبان اردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اس میں قوت وسعت اور لوچ باحسن وجوہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آیندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا۔

انشا اور مصحفی دور؛ ان کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور بعد کے شعرائے دہلی سے شروع ہوا۔ جس میں اثر، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، ناسخ، بقا، حسرت، رنگین

اور فراق مشہور زمانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کئے گئے بد نما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک ان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر اُن کے یک قلم نکال دیئے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اُردو کے قبضے میں ایک عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے۔ فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے۔ قدیم اردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اس لئے انھوں نے ہندی کی کوئی قدر نہیں کی۔ ان کو زبان سے خارج کر دیا اور ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیئے۔ اس کارروائی کو وہ لوگ اور نیز اس زمانے کے مسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے "زبان کی اصلاح اور پختگی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پرانے متروکات جو میر و سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے نکال دیئے گئے اور ان کی جگہ جدید لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملا دی گئیں۔ طرز عبارت میں کچھ فرق نہ ہوا مضامین میں بھی کوئی خاص جدت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس دور کی شاعری اس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حسن ظاہری کی تو عام طور پہ تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعراء نے کھلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں "معاملات" یا "معاملہ بندی" کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور رنگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی | یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اس کا مؤنث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں، مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفا کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کو پڑھانے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذب اور فحش ہوتی ہیں عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پرانے شعراء کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادری ہمعصر ولی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہو گیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست انشا نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں۔ انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب

نے اس کو فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنعت شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے اور اب تقریباً متروک ہے۔

اس دور کے شاعر غزل کے استاد تھے اور مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے۔ لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اسی عہد کے اکثر شاعر اپنا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر ادھر ادھر نکل گئے۔ اکثر لکھنؤ پہونچے جہاں دربار شاہی میں شعراء کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسنؔ اور خواجہ میر دردؔ کے بھائی میر اثرؔ کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسنؔ کی مشہور آفاق مثنوی "سحر البیان" جس کی روانی، سادگی، شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اس کی خصوصیات

اس دور کی ابتدا شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور ظفرؔ سے ہوتی ہے اس میں وہ رہے سہے ہندی الفاظ بھی جو قدما سے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومنؔ فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی اکثر تصانیف اس زبان میں موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ شاہ نصیرؔ کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اردو میں ایک نہایت نمایاں خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو استادوں کے قلم سے تو برے معلوم نہیں ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی۔ ورنہ پھر اردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اس فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوقؔ گو بلحاظ شاعری غالب سے ذہانت و طباعی میں کم ہیں مگر زبان پر ان کی قدرت مسلم ہے اور محاورات و امثال میں تو ضرب المثل ہیں ان کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے ظفرؔ کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں وہ غالب و ذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ ان سے اصلاح لیتے تھے ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ ان کے استاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحریں جو اب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں۔ شعرا اپنا کمال فن دکھانے کے لئے مشکل قافیے اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحریں

اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت و معنویت سے خالی ہوتا تھا۔ الغرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے۔ فارسی ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں، خیالات میں جدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جس کا بہترین نمونہ غالبؔ کے کلام کو سمجھنا چاہئے۔

شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کے خصوصیات ناسخؔ اور آتشؔ کا زمانہ ان کی خدمت زبان کے ساتھ

ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور یہاں آکر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا۔ وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدردانوں کی تعریفیں دل بڑھاتیں اور نئی امنگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرہ ہوتے تھے اسی کثرت اور مشاقی نے شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا اور اس میں طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کیں مختلف اصناف سخن پر قدرت حاصل ہوگئی۔ شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور ان کی جگہ فارسی و عربی الفاظ نے لے لی۔ اس طرح پرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ترک کی گئیں۔

ناسخ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج انہی کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے۔ واقعی ان کو متروکات کا "ناسخ" کہنا بالکل بجا ہے۔ ان کے زمانہ سے ایک نیا رنگ شاعری شروع ہوا جس کی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شاندار، عبارت میں تعقید و تکلف، صنائع بدائع اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت، فضول مبالغے، فرسودہ تشبیہیں، جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اس کے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے بحرؔ، وزیرؔ، صباؔ، سحرؔ، رشکؔ وغیرہ اپنے زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے۔ قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر پر رہا یہاں تک کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی۔ سادگی۔ نیچرل جھلک۔ سوز و گداز اور اثر پسند کئے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے ہمعصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا وہ غزل کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ ہر چند ان کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہے مگر ان کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور موثر ہے وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی

الفاظ، چستی بندش، بلندی مضامین، میں قدما کے متبع کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں۔ بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے۔ صفائی زبان پہ ان کا بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیئے ان دونوں پہلوانان سخن کے شاگردوں اور پیروؤں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور ان کا تعلق زبان کے ساتھ

مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے۔ اردو مرثیہ گوئی کو قدما نے نظر استحسان سے نہیں دیکھا۔ اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور ان کے لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سر نو زندہ ہوئی اور ان کے بعد سے تو مرثیہ گو بکثرت پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پرانی چیز ہے عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے اردو میں اس نے رواج پایا۔ قدیم شعرائے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر ان کی زبان بھی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی اصلی ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر امرا و رؤسا شیعہ مذہب رکھتے تھے جو اعتقاداً شہدائے کربلا کے مصائب پہ گریہ و بکا اور اظہار غم و الم کرنا اپنی فرض سمجھتے تھے۔ زمانہ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اس غم و الم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پر زور اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیہ کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پر اثر اور رقت خیز کلام سناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں ستارے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت موثر اور قدرتی شاعری کا پرتو ہے۔ ان دونوں بزرگواروں کا کلام اردو شاعری کا سرتاج ہے اس کی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور ان کے زمانہ کی بد اخلاقیوں سے بالکل پاک ہے قصائد کی سی بیکار لفاظی اور دور از کار مبالغے اس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت دجس کو سماں باندھنا کہتے ہیں) اور جذبات قلبی کے سچے خد و خال موثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیئے۔

مابعد کے شعرا امیر و داغ کا زمانہ

معزولی سلطان عالم واجد علی شاہ اور زمانہ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثل امیر، داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلامی

ریاستوں میں چلے گئے بعض نے رامپور اور حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدما کے متبع تھے۔ درباروں اور رؤسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ غزلیں، رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے امیر مینائی اپنے پیش روؤں کے مقلد تھے۔ ان کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی، بے ساختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندی مضامین کم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے استاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔ اس دور میں اردو شاعری نے بحیثیت شاعری نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ
آزاد اور حالی کا زمانہ۔ ان کی خدمات زبان کے ساتھ

زمانۂ حال میں نظم اردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے رکن رکین آزاد، سرور اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا۔ میدان شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی، بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو انہوں نے شروع کیا اور انہی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نیچرل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانہ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آئندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیئے۔

نثر اردو
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اردو کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے قیام سے پیشتر بھی نثر اردو کی بعض کتابیں موجود تھیں۔ مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصہ کہانیاں تھیں اور کچی اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں عبارت کی درستی اور قواعد صرف نحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا "دہ مجلس" اور "نو طرز مرصع" اس عہد کی یادگار ہیں۔ خاص خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کئے گئے تھے۔ سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امن

حفیظ الدین احمد، مظہر علی ولا، اکرام علی اور مرزا علی لطف وغیرہ ہیں جن کی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی اور سنسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی نثر اردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانۂ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں۔ ان کا بھی زیادہ تر دارو مدار انہیں پر ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اردو) سرکاری زبان ہو گئی اور یہ استعداد اس کو حاصل ہو گئی کہ بجائے مروجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی ان کے زمانہ میں تیار ہوئیں۔

نثرِ مقفّیٰ — رجب علی بیگ سرور

سادہ نثر کے مقابلہ میں، جس کی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہوئی تھی وہ نثرِ مقفّیٰ ہے جو ظہوری اور بیدلؔ کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اس کی عبارت مقفّیٰ اور جملے نپے تلے ہوتے تھے۔ صنائع بدائع استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی، پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دقت واقع ہوتی تھی۔ اس وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفّیٰ عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبولِ عام رہی۔ خطوط تک اسی قسم کے مرصّع اور باتکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے، تمہیدیں، تقریظیں خواہ بزبان فارسی یا اردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب" جس طرح اپنی انشا پردازی میں مشہور رہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی اس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو بہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت

انشاؔ اور قتیلؔ "دریائے لطافت"، کو گویا فارسی اور اردو کا مجموعہ کہنا چاہیے وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اردو کی پہلی کتاب ہے، جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبان اردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مروّج تھیں اور سب کے نمونے بھی ان میں بکثرت موجود ہیں۔

اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی

ایک بہت بڑی شخصیت نثر اردو کی تاریخ میں مرزا غالبؔ کی ہے ان کی مشہور تصانیف "اردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" ایک دلچسپ مجموعہ اردو خطوط کا ہیں جس کی عبارت نہایت سلیس، بے تکلف اور نہایت دلآویز ہے ان میں ایک خاص قسم کی پُرلطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے۔ دونوں کتابیں نثر اردو کی سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں مصنف کے ذاتی حالات کی طرف جا بجا اشارے ہیں ان کو پڑھ کر دل بہت محظوظ ہوتا ہے۔

غالب کے طرز نے اُردو کی نثر نگاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح پھونکی جس کا اثر زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں پر بھی بہت کچھ پڑا۔ غالب بھی اپنے زمانہ کے مروجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ ان کی اکثر تحریروں میں وہی پرانے رنگ کی مقفّٰی اور مسجع عبارت پائی جاتی ہے جو ان کے زمانہ میں عام تھی۔

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر۔

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی نثر اُردو پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر ان پادریوں نے جو سیرام پور واقع بنگال میں قیام گزیں تھے۔ بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں کر کے اس کی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اردو میں شائع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۴ء تک شائع ہوئے وہ زیادہ تر اُردو ہی میں تھے

سرسید اور ان کے رفقائے کار کا زریں عہد

نثر اردو کی ترقی کا زریں عہد انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیے جس میں سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس زمانے میں جس قدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوتے تھے ان سے بھی اردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی جگہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پر زور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گو کہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی، اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو نثر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہو گئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اصلاحیں ۱۸۲۰ء لغایت ۱۸۳۱ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا چاہتے تھے ان کے اوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے ترجمہ زبان اُردو میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا جو اصلاحیں کہ سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں ان کی ترقی نمایاں طور پر سرسید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جن کی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی جریدہ نگاری غرضکہ ہر صنعت و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں۔ زبان اردو کو اتنا فائدہ پہنچا اور وہ اس قدر مالا مال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سرسید مرحوم ایک ایسے طرز تحریر کے موجد ہوئے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورہ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ ان کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں۔ ہزار ہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سرسید مرحوم کے رفقائے کار نے، جن کو زبان اردو کا نورتن سمجھنا چاہیے۔ زبان اور ادب

اردو کے ساتھ احسان عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلیؔ اور مولوی ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین و لیکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جن میں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے۔ ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہنچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزادؔ کی جادو نگاری (جن کا ان سب سے جدا اور خاص رنگ ہے) درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دلآویز ہے ان کی تصانیف کو خزانۂ اردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہئے۔

تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی

انیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات بڑھ گئی اور مختلف اصناف سخن اس میں داخل ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی۔ قدیم و جدید ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور ان کی نشر و اشاعت آسان ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی و دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ناول نویسی کی ابتدا

افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہئے یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کی گئی ہے۔ زمانہ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بین مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے نیز یہ کہ اردو کو ہندوستان ادبی زبان بننے کا فخر باحسن وجوہ حاصل ہو گیا۔

اُردو ڈراما

یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں بھی ابھی پختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کیریکٹر نامکمل ان کے پلاٹ اور ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں صرف لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں۔ شیکسپیئر اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہو گئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال ان میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو گیا ہے اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے۔

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے

اُردو شاعری دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اُس کے پیشِ نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودا جڑ پکڑ گیا اور اس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی کی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کئے اور یہ سب چیزیں بلا لحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہو گئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایۂ بساط بن گئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جن کی رفتار تو ضرور سست تھی مگر ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ ازبس ضروری تھے۔ مثال کے لئے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی۔ اُردو میں اس کمی کی وجہ سے وہی پرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں بکثرت پائے جاتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا۔ دفعتاً سنگ بنیاد بن گئے۔ شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صائبؔ، حافظؔ، نظیریؔ اور بیدلؔ وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج

اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اُردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمین ہندوستان ان مضامین سے ناآشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم و اسفندیار کی بہادری، مانی اور بہزاد کی نقاشی، جیحون و سیحون کی طغیانی، بیستون اور الوند کی بلندی وغیرہ وغیرہ یا جانوروں میں بلبل، درختوں میں سنبل وغیرہ یہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جن کو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع

اُردو شاعری محض نقالی ہے

کی وجہ سے شاعری واقعیت سے ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی ہندوستانی بادشاہوں کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اُن کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے۔ سخاوت میں وہ حاتم بتائے جاتے ہیں۔ حرماں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور ان کی معشوقہ

ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے ۔ ایک حسین کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہکن خطاب پاتا ہے ۔ قد کی تشبیہہ کے لئے سرو و شمشاد ، آنکھوں کے واسطے نرگس ، زلف کے لئے سُنبل ، بے رحمی اور سفاکی کے لئے ترک ، گل کی عاشق بلبل ، سرو کی دلدادہ فاختہ ، بادِ صبا کی اٹکھیلیاں ، چاند کو دیکھ کر کتاں کا پارہ پارہ ہونا یہ سب فارسی سرمایہ اُردو کے واسطے مخصوص بلکہ اس کی مِلک ہو گیا اور ان کی مدھ بھرمار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی ۔ اس کو اپنے ملک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی قدر کرنے کا احساس تک اس سے فنا ہو گیا مثلاً ہندوستان کی بہار اس کا موسم برسات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتہ نہیں ۔ ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرما موسم بہار ، ہمالیہ کی سر بفلک برف زار چوٹیاں ، گنگا اور جمنا کے خوبصورت گھاٹ ، ان کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا ۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا ۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی ۔ سرچارلس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں ۔ اُردو شاعری فارسی شاعری کا مکمل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دہراتی ہے جن کو خود اساتذۂ فارس نے پامال کیا ہے ۔ مضامین اور الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں ۔ ان میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں پائی جاتی اور اسی کمی کی وجہ سے ان کو ایک نہایت مہتم بالشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی جب کہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اس کو اس سے پیشتر سینکڑوں نہیں ہزاروں کہہ گئے ہوں تو ظاہر ہے اس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے ۔ پس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعر اُردو شاعری کا مایۂ ناز ہو گئے ۔ اسی وجہ سے نہایت دل چسپ دل جسپ مبالغے نئی نئی تبدیلیں اور ترکیبیں صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں ۔

اردو شاعری صرف رسمی رہ گئی اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری کی کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے ۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں جو بار ہا لکھی جا چکی ہیں پھر دہرائی جاتی ہیں ۔ آئینہ فطرت کے مشاہدہ کا اس میں کہیں پتہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیغام ہوتا ہے ۔ پرانے شعرا کی کشکول میں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈی جاتی ہیں ۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انہیں باتوں کا اعادہ کرایا جاتا ہے ۔ شاعری محض نپی تلی چیز ہو گئی نہ کبھی کم ہوتی نہ کبھی زیادہ ۔ ہر شاعر اپنے کلام میں اسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنعات اور بے مزگی سے بھرا ہوا ہے ۔

قافیہ پیمائی | فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی ایک قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے - اسی وجہ سے مدت ہوئی کہ یورپ کی شاعری اس بارگراں سے سبکدوشی حاصل کرکے آزاد ہوگئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی رہبری کرتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے غرضکہ انہیں قیود سے اُردو شعراء کے تمام دواوین بھرے پڑے ہیں - اب اس بدمزگی کا احساس خود ہمارے شعراء کو ہو چلا ہے -

خلاف نیچر مضامین | علاوہ نقائص مذکورۂ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لئے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کرکے اس کے گھنگر والے بال - اس کی زلفیں، اس کا سبزۂ خط اس کی بھیگی مسیں - اس کے خدوخال اس لطف سے بیان کئے جاتے ہیں کہ جس کی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہوسکتی - اس رنگ کو ہمارے قدیم شعرائے اُردو نے شروع کیا جس کا تتبع آج تک کیا جاتا ہے - ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اس کا خیالی معشوق اس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمارے اردو شعراء بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہمجنس کے لئے کرتے ہیں، اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں رفعت اور بلندی پیدا کرتی ہے - بخلاف اس کے اردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنان بازاری کے حسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہوجاتا ہے - اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ اردو شاعری فارسی شاعری کی سراسر پیرو رہی ہے - یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری اور زبان کو پھیلنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا - یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے اُردو شاعری کو محض تفنن طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعر گوئی سے ان کو فرصت ملی تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لئے اس میں بھی صرف کردیا۔ نئی قباحت یہ ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں زبانوں کی برکتوں سے منتفع نہ ہوسکے - فارسی چونکہ سرکاری اور درباری زبان تھی اور اس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی - لہٰذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ اس کے مقابلہ میں ان کو بھدّے اور اجنبی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کردیئے گئے - ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہوسکتی ہیں - ایک

یہ کہ زبان فارسی کا بازار اس وقت گرم تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انہیں وجوہ سے زمانہ قدیم میں اُردو کی بے قدری تھی۔ چنانچہ متقدمین اساتذہ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے۔ یہاں تک کہ مرزا غالب بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو ہیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ		بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اس کی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت و خون تک نوبت پہنچی لہٰذا اس خرابی کے دور کرنے کے لئے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کئے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کو کھُلم کھُلا نام لینے کو ممنوع قرار دیا جس کی وجہ سے یا تو ان کے واسطے کسی مشہور معشوقہ کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغۂ تذکیر و تانیث میں فرق نہ تھا۔ اسی وجہ سے شاید یہ صورت ابتری ظاہر ہوئی۔ یہ عذر بارد فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ مقبول ہو سکتا ہے مگر اُردو جس میں کہ افعال و اسما سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرقہ اناث ہوتا ہے جس میں حقیقی معشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھئے تو تہذیبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ شریف عورتیں پردہ کی وجہ سے سامنے نہیں آ سکتیں پس لامحالہ جس حسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا

اصنافِ سخن | اُردو شاعری میں اصناف ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔

غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ۔

غزل اور اس کا رنگ | ان میں سب سے مشہور صنف شاعری غزل ہے جس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرون وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی۔ بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے روایات جنہوں نے ادب ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اس مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

تصوف | تمام قدیم شعرائے اُردو صوفی تھے اور ان بزرگوں کی اولاد میں تھے جو مجاہدین اسلام کی فوجوں کے ہمراہ آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاق تصوف ان کے اسلاف سے وراثتاً چلا آتا تھا اور لوگ ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دہلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعداللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمون گو ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں۔ خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد تھے۔ علاوہ شاعری کے دولت فقر سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن میر۔ سودا اور اسی طرح ان کے ہمعصروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے مملو تھی لہٰذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اُردو نے منجملہ اور چیزوں کے اس میں بھی اس کی پیروی کی۔
تقدس، ریاضت نفس، ترک ماسوی اللہ، دنیاوی نمائش اور ریاکاری سے اجتناب، تعیش اور حصول دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لئے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزلت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کر دینا ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہئے شعرائے صوفیہ حسن مجازی کی تعریف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس کو حسن حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انہیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است		کہ آن بہر حقیقت کارسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انہیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ | غزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی عیش پرستی اور فارسی شاعری کے تتبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے۔ انگریزی میں اگر اس کے مقابل میں کوئی چیز ہے تو سانٹ ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ غزل میں چند اشعار رہتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے۔ یہی چیز غزل اور سانٹ میں مابہ امتیاز ہے۔ یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے اور سانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں۔ اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور

اسی وجہ سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوت صرف کرکے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اور اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے جن مضامین میں غزلیں عام طور پر لکھی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔
عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے راز و نیاز، وحشت و جنوں، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے، عاشقانہ شاعری دنیا کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے کیونکہ عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان سے ہوتا ہے۔ تصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطر میں پیشتر بیان کیا گیا ہے۔

اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر

اُردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرعوب اور ہر دلعزیز رہی اور امراء اور رؤسا کے درباریوں میں اس کی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلی، حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعراء کو ان کی جان کاہی کے صلہ میں انعام و اکرام خوب دیا گیا اور ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعراء کو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔ دلی اور لکھنؤ کی سلطنت کا مٹ جانا اُردو شاعری کے زوال یا کم از کم اُس کے ضعف کا خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا اس وجہ سے کہ ان لوگوں کے دلوں میں خود تعیش کے جذبات موجود تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت لکھے جاتے تھے۔ ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کو خوش کرکے شعراء کو اپنی کاربرآری کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ ان دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ[۱] کے یہ دونوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں ؎

اپنے رنگِ عیش و عشرت کے لئے سب بادشاہ
تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں یہ کرتے ہیں مدح
شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام
لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابندِ دام

اس درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ بڑا نتیجہ ہوا کہ ہماری اُردو شاعری سے وہ تنوع پرکاری، وسعت اور جدت مفقود ہو گئی جو دنیائے شاعری کی جان ہے۔

---

[۱] سر والٹر سکاٹ گذشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناولسٹ گزرا ہے۔ اس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور ان کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اس کی نیچرل بیانیہ شاعری زبان

بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ

دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی،

اردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب امنگیں پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے اردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اُردو میں برائنٹ، ہوٹیر اور طامسن کی طرح کے شعرا کا پتہ نہیں اور نہ ورڈسورتھ کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اُردو شاعری میں اصلی قدرتی مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا، لہلہاتے کھیت، گاتی ہوئی چڑیاں۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گو کہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں، بنبل و گل، قمری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعرائے اُردو کے سر دو میں صرف ایک ہی

انگریزی کا یہ بہت پسند کی جاتی ہے۔ اس کے وطن اصلی یعنی سکاٹ لینڈ میں اس کی اس قدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے کسی ناول یا کیریکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے

برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا۔ ہومر کی الیڈ اور اوڈیسی کا منظوم ترجمہ اس نے کیا ہے۔ ہوٹیر یہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی پر زور نظموں کے ذریعے انسداد غلامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اس کو وہاں انسداد غلامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں ٹامس (سنہ لغایت سنہ) انگلستان کا خوشگو نیچرل شاعر ہے۔ اس کا مجموعہ نظم موسوم بہ سیزنس (موسم) مشہور ہے۔ جس میں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ چند ڈرامے بھی لکھے ہیں مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اس کی دیگر تصانیف میں رول بریطانیہ اور کیسل آف انڈولینس بہت مشہور ہیں۔ ولیم ورڈسورتھ (سنہ لغایت سنہ) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا ان لوگوں میں شمار ہے جن کو زبان انگریزی میں "لیک پوئٹ، یعنی جھیل کے شعرا کہتے ہیں اس وجہ سے کہ ورڈسورتھ اور اس کی بہن ڈارو تھی اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گراسمیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے۔ ورڈسورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جائرانڈسٹ" کہلاتے تھے بہت ہمدردی تھی مگر جب نپولین نے اصلی جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اس کی ہمدردی اس جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی۔ ورڈسورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ منجملہ جن کے اس کی فلسفیانہ نظم رکلوس (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے۔ اس کے علاوہ ایکسکرشن (گلگشت)، اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل برفرائض انسانی)، وڈ انٹی میشنس آف امارٹیلٹی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، کولرج کا قول ہے کہ ورڈسورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور ان میں وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتی۔ دوسری بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور ان کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ ورڈسورتھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی استاد تھا سودے کے بعد خطاب ملک الشعرا اسی کو ملا تھا۔

مارہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہاں تک کہ بے سُرا ہو جاتا ہے۔ اسمندل کی نظمیں، آزادی کے لاگ، حسن کی صحیح تصویریں اُردو شاعری میں نہیں ہیں۔ وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اُور اہل دربار پسند کرتے تھے مثلاً شراب وکباب رقیبوں کے شکوہ وشکایات، عاشقوں کی حرماں نصیبی فلک کے جور وستم، تقدیر کی گردشیں بکثرت ہیں۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب وتعلیم کا چرچا پھیلا۔ نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور ان کی مقبولیت سے امید ہے کہ اس صنفِ جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی

اُردو شاعری حزن ویاس کی شاعری ہے،

کل مشرقی شاعری جس میں اُردو کی شاعری بھی داخل ہے۔ حزن ویاس کے مضامین سے مملو ہے۔ ایک یورپین نقاد کی رائے ہے کہ اہل مشرق اپنی طبیعت کی افتاد سے افسردہ خاطر، پُر اسرار سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوئے ہیں۔ دنیائے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں زیادہ تر حزن ویاس، درماندگی وبیچارگی زندگی سے تنفر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے۔ اس دنیا کی بیزاری کی وجہ ہے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دعائیں مانگنا۔ تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوت ارادی کو بالکل معطل وبیکار سمجھنا، زمانہ اور آسمان کی شکوہ وشکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو ان کے فطری حزن ویاس کے رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اخترِ سعادت واقبال غروب ہو گیا۔ اور ان کی گزشتہ عظمت وجبروت کے واقعات خواب وخیال ہو گئے۔ اُردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براؤننگ[1] بہت کم ہیں مگر کہا جا سکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعراء کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد واثر پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام مقبول خاص وعام ہے۔

---

[1] رابرٹ براؤننگ (۱۸۱۲ء لغایت ۱۸۸۹ء) میں دور وکٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ انیسویں صدی یعنی کوئن وکٹوریہ کے عہد میں جس کو انگریزی شاعری کا دور متاخرین بلکہ آخری دَور کہنا چاہیئے۔ تین نامور شاعر گزرے ہیں، ورڈسورتھ، ٹینیسن اور براؤننگ اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے۔ براؤننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے، مضامین نہایت بلند خیالات، نہایت پاکیزہ گو، عبارت میں کسی قدر پیچیدگی ہوتی ہے، جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات اسمیں یہ بھی کہ اس کی بیوی بھی نہایت مشہور اور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہمعصر شعرا ایک

(بقیہ بصفحۂ آئندہ)

قصائد | قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذۂ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا، ذوق اور امیر وغیرہ ہیں۔ قصیدہ کے انداز میں فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اس میں شکوہ الفاظ اور علو مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں مبالغے وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا ممدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مشکل بحریں، سخت قوافی، قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں۔ اکثر قصائد صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں۔

مثنوی | شعرائے اُردو میں یہ صنف بڑی مقبول رہی ہے۔ اس میں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف ہیں یعنی ایپک اور ڈراما ہیں اُردو میں صنف مثنوی ان کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں مثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے۔ اُردو کے مشہور مثنوی نویس میرؔ، میر حسنؔ، مومن خاں، نسیمؔ، تلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یورپین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے۔ "مثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اس کے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے۔ جدت صرف وہی ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشائے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ بدمزگی کے ساتھ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے مثنوی میں نہ تو کیریکٹر نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے۔ عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں ان کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دل چسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے اور مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہ نامہ فردوسی اور سکندر نامۂ

دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ براوننگ کی مشہور کتاب سارڈلو جب نکلی تو اس کے دوست ٹینیسن نے دیکھ کر کہا کہ میں اسکے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارڈلو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

نظامی کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست پختگی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

مراثی مراثی ادب اُردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب دکھائے جاتے ہیں ہر چند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کی جاتی پھر بھی معرکۂ کارزار مبارزین کی جانبازی، صبح اور شام کا سماں، جنگلوں اور میدانوں کے منظر دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے، الفاظ میں بہترین طریقہ سے کھینچ دیئے گئے ہیں۔ پُر زور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے۔ اس کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعہ اور رباعی ان اصناف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے۔ ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں جن میں انیس اور دبیر اور حالی کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

استاد اور شاگرد کا تعلق استاد اور شاگرد کا تعلق ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام استاد کو دکھایا جاتا ہے اور شعرا دسے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعد لی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرائے اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں۔ شاگرد عموماً اپنے استاد کا تتبع کرتے ہیں۔ استاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری رہی رسمی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی دائرہ اتباع سے علیحدہ ہو کر شہرت حاصل کر لیتا ہے۔

مشاعرے مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کر لیتا ہے جس کو تخلص کہتے ہیں۔ بعض اوقات استاد اپنے شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات باوجود اُن نقائص کے جو اوپر بیان ہوئے۔ اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے۔ اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اس کے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے۔ وہ عشق میں سرشار رہے۔ نغمہائے غم، عشق کی ناکامیاں، حسرت و ارمان ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں۔ ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب

سے انگریزی کیا بلکہ دنیا کے علم وادب سے علوِ خیال نزاکتِ الفاظ، موسیقیت، حسنِ تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بیہزہ ہے مگر یہی حال دنیا بھر کی شاعری کا ہے۔ اُردو کی نظم ونثر وجود میں آنے ہوئے بہت عرصہ نہیں گزرا، مگر زمانۂ حال کی تہذیب وتعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا ہے۔ اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بکثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع پرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہرحال اُردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق ومغرب دونوں کے قابل اور با اثر لوگ اس کی فلاح وترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

باب ۴

قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے دربار میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مراد ہے اور اس میں اور زبان اُردو میں کیا فرق ہے۔

دکھنی کیا چیز ہے۔ زبان دکھنی ہندوستان کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانانِ دکن بولتے ہیں۔ اُردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اس میں بعض خصوصیتیں ہیں جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اس وقت اس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہو گئے جو اب اُردو سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل اطراف وجوانب کی زبانوں میں یعنی مرہٹی اور تلنگی سے ہوا تو اس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آگیا۔ مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی کے قبل حرف "نے" استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے "مجھ کو" کے "میرے کو" بولتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں پہنچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں ان میں سے اکثر متروک ہو گئیں۔ نظر بریں دکھنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اُردو خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے

جس نے بیجاپور اور گول کنڈہ کے درباروں میں نشو و نما پائی اور ولی اور اُس زمانہ کے مشہور شعرا کی کوشش سے اس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی

زبان دکھنی کی ابتدا

ملک دکن کی فتح خلجیوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاؤ الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دو مرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلہ آمد و رفت جاری رہا مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہو گئی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے "چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند، پادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بر تعمیر دولت آباد نگماشت و مادر خود مخدومۂ جہاں را با سائر حرم ہائے امراء و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید، و احدے از مردم دہلی را کہ بہ آب و ہوائے آنجا خو گرفتہ بودند۔ بحال خود نگذاشتہ طوعاً بدولت آباد فرستاد و دہلی بنوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال و روباہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید" مختصراً یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے ہو گئے۔ اور دلی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث آب و ہوا کے اثرات، زبانوں کے اختلاط، اور مقامی باشندوں کے ساتھ ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دلی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس میں نمایاں تغیر ہو گیا اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتدبہ فرق معلوم ہونے لگا۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب

اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا کے کیا اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے۔ قرین قیاس یہ تھا کہ اُس کی نشو و نما دلی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا مگر بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم شعر اُردو کا گہوارہ دلی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ اس کے صحیح جواب کے لئے ایک اہم واقعۂ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلا تھا جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت نشین ہوا تو اس نے نہ صرف شگون نیک کے واسطے اپنے گرو کا نام تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کر لیا بلکہ اس کو وزیر مال بھی مقرر کیا۔ تاریخ فرشتہ[1] میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ اس سے قبل

---

[1] دیکھو تاریخ فرشتہ ترجمہ مسٹر برگ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲

برہمن لوگ معاملات ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی زندگی امور مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے صیغہ مال میں تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیز ان دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا ابراہیم عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا شروع کیا اور اس کے حکم سے ملکی حسابات جو اب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے[1]۔ اس سے دیسی زبان کو بڑی تقویت پہنچی کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہوگئی اور اس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی۔ یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور برسر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی۔ کبھی ایک مسلمان حاکم ان سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اس کا حریف۔ بعض اوقات چند مسلمان حکمران کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی۔ یہاں تک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اس کا خاتمہ کر دیا[2]۔ "باہمی ارتباط اور محبت و یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور امراء ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظام ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا دخیل ہونا رواداری کی پالیسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور بہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی بہ نسبت زیادہ مواقع حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح و بہبود مفقود تھی۔ پس مختصراً ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط، مسلمان فرمانروایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کیا جانا۔ یہ سب اسباب مل کر اس کا باعث ہوئے کہ زبان دیسی جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کر کے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ اس کے علاوہ

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۸۰

[2] دیکھو تاریخ دکن مصنفہ مسٹر گریبل جلد ا صفحہ ۲۹۳

ملک دکن میں اکثر بزرگان اور اولیا اللہ ایسے بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے چنانچہ اکثر قدمائے اُردو صوفی منش اشخاص تھے اور ان سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشوو نما کا کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اس زمانے کے شعراء کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے۔ تذکروں میں صرف عام شاعروں کے نام ملتے ہیں اور ان کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہان بہمنی کا زمانہ
۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم وادب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں اور ان کے مؤلف اس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے۔ جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ گنج الاسلام، شیخ عین الدین (متوفی ۷۹۵ھ) خواجہ سید گیسو دراز[۱]۔ شاہ میراں جی، مولانا وجہی۔ اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصۂ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد
۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ

سلطنت بہمنی کے زوال بعد بیجاپور گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس زمانہ میں دکھنی زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ ہندو رانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں دیسی زبان کو اور بھی تقویت پہونچی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبوجی کے نام سے مشہور تھیں۔ مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں۔ احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

---

[۱] خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا نام سید محمد حسینی ہے۔ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔ ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ کے عہد میں گلبرگہ آئے۔ تبلیغ دین میں مصروف رہے۔ ۸۲۵ھ میں انتقال کیا۔ (مرتب)

شاہ میراں جی شمس العشاق م ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء (مرتب)

وجہی قطب شاہی دور کا شاعر ہے۔ اس دور کے دیگر شعراء یہ ہیں۔ سید محمد اکبر حسینی وفات ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء نظامی، سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ - ۸۶۷ھ) کے عہد میں موجود تھا۔ اس کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اُردو کی اولین عشقیہ مثنوی ہے۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں ایک نسخہ ہے۔ (مرتب)

صدر الدین وفات ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء عبد اللہ الحسینی۔ احمد شاہ ثانی بہمنی کے زمانہ میں موجود تھا (زمانہ ۸۳۸ھ تا ۸۶۲ھ) لطفی اور مشتاق۔ سلطان محمد شاہ الشرقی ۹۱۶ھ کے دور میں موجود تھے۔ (مرتب)

شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدردان فن مہذب اور قابل بادشاہ تھے۔ شعراء کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کو دکن میں دکھنی کہتے ہیں۔ ان کے دربار میں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف وجوانب میں تلنگی، مرہٹی اور کنٹری زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے ان سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکھنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی۔ دربار گولکنڈہ اس وقت کے شعراء اور ادباء کا مجمع تھا جن میں مندرجہ ذیل شعرا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شعورا، بیچارہ، طالب، مومن[1]

سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہنچ گئی۔ سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر جو ۱۵۸۰ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۱۵۸۷ء میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے ساتھ صلح کی اور اپنی بہن کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا وہ شہنشاہ اکبر اور عباس شاہ صفوی کا ہمعصر تھا۔ گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر آباد کیا مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا جو موجودہ فرمانروائے دکن کا مشہور دارالسلطنت ہے۔ قطب شاہ کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ فن تعمیر سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ دو مشہور عمارتیں مشہور بہ خداداد محل اور خسروی تعمیر کروائیں۔ ان کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال اور استادان فن عرب و ایران سے ان کی داد و دہش اور قدردانی کا حال سن کر آتے تھے اور ان کی فیاضی سے مستفید ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا جبکہ علما و شعرا میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوش نویسی کا بھی ان کو بہت ذوق تھا چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے ان کے دربار میں جمع ہو گئے۔ علاوہ دیگر باکمالوں کے دو مشہور عالم ان کے دربار میں میر محمد مومن استرآبادی اور میر جملہ تھے۔ قطب شاہ کا مذہب شیعہ تھا اور اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت میں اہل دربار میں منعقد کراتے تھے اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے اس عہد میں لکھے گئے۔ علاوہ قدردان فن ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر چنانچہ انکا کلام بزبان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک ضخیم کلیات کی صورت میں جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے۔

---

[1] ان شعراء کے حالات کے لئے دیکھئے "دکن میں اُردو" از نصیر الدین ہاشمی۔ (مرتب)

ان کی کلیات میں حسب ذیل اصناف سخن موجود ہیں۔ مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مراثی بزبان فارسی و دکھنی اور رباعیات، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ سادگی اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انہیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبرآبادی کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔ اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت کے رسم و رواج ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی، دوالی عید بقرعید بسنت وغیرہ۔ بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دل چسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دل چسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور منقبت میں ہیں۔ معرکۂ کربلا کے موثر مراثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اُردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ اُن کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر ان کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہ ملا۔ کچھ مذہبی مثنویاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جاسکتیں۔ قطب شاہ کا ہی کلام اب تک ایسا کلام کہا جا سکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ انھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تتبع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے وَلی کے سر تھا علاوہ متعارف مضامین کے ان کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی انھوں نے قلم بند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے متبع نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی استعارے اور تشبیہیں، ہند فارسی الفاظ خدا کی تعریف ٹھیٹ بھاشا میں ہندو سورماؤں اور بہادروں اور ہندوستان کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے، جو ہندی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ معشوق سے طریقۂ خطاب جو بعد میں اُلٹ گیا ان کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین تشبیہات اکثر ان کے کلام میں موجود ہیں وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور رہیں، عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہوگئی ہے اور لوگوں کو اس میں کوئی لطف نہیں آتا۔ اس لئے ان کا کلام دل چسپی سے نہیں پڑھا جاتا

مگر جب نظر تحقیق وسیع ہوگی تو ان کے کلام کی قدر کی جائے گی۔ مختصراً یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اُردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ انھوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے ہیرو اور مختتم میر وسودا انیس و دبیر ذوق و غالب وغیرہ ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دل نانگ خدا کن کرے خدا کام دوے گا	تُمن کی مراد ان کے بھرے جام دوے گا
کرتے ہیں دعوئے شعر کا سب اپنی طبع سوں	بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ سنہ ۱۶۱۱ء لغایت سنہ ۱۶۲۵ء سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے۔ ان کی ولادت گول کنڈہ میں سنہ ۱۵۹۱ء میں ہوئی اور ان کی شادی اپنی چچازاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت متشرع اور پابند مذہب سخی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ منجملہ دیگر تعمیرات کے الٰہی محل۔ جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد۔ محمدی محل، دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نثر فارسی اور اُردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ ان کے دو دیوان ہیں۔ ایک فارسی اور ایک دکنی جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے ہیں۔ اسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہوگیا ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا تخلص اُردو کلام کے واسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ ان کے دونوں دیوان حیدرآباد میں نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شیرینی۔ صفائی۔ لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ	محبت پر نظر رکھ بسر غیظ،

دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دیے رنگ

لے جھبک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے یمن میں

سلطان عبد اللہ قطب شاہ سنہ ۱۶۲۵ء لغایت سنہ ۱۶۷۴ء عبد اللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے۔ سنہ ۱۶۱۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد سنہ ۱۶۲۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ سنہ ۱۶۳۵ء میں جب شاہجہان ان سے ناراض ہوئے تو شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اس وقت ممالک محروسہ دکن کے صوبہ دار تھے حیدرآباد پر چڑھائی کرکے اس شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ عبد اللہ نے اپنی شکست قبول کرکے تمام شرائط صلح منظور کر لئے اور اس وقت سے یہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور انہیں کی طرح ان کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا

ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ سب ان کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں ان کے نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ فارسی اور دکھنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اُردو دونوں میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے ہیں آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کے اکثر اُردو اشعار نمونہ پیش کئے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تری پیشانی پہ ٹیکا جھمکتا
تماشا ہے اجالے میں اُجالا

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا
کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے
سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکارا

ابن نشاطی اس زمانہ کے شعرائے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ گولکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ ان کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں بجز اس کے کہ وہ ایک مثنوی موسوم بہ "پھول بن"[۱] کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے۔ اس کا نام اس کی ہیروئن کے نام پہ رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بساتین کا ترجمہ ہے اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کنچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" غواصی نے بزبان دکھنی ایک مثنوی لکھی ہے۔ جس میں سیف الملوک شاہزادۂ مصر اور بدیع الجمال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف سنہ ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی کا مذہب شیعہ تھا اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف جس کا ذکر کتاب کے اٹھارھویں شعر میں ہے۔ انہوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ سنہ ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سر چارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل یہ قصہ ضیاء بخشی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ترجمہ

[۱] یہ مثنوی انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

[۲] دکن میں اُردو" ۱۲

ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے اس کا ماخذ اصل سنسکرت کی کتاب "سوک سپتتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو فورٹ ولیم کالج کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ سنہ ۱۸۰۱ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے اور سن تصنیف دیباچہ سے ۱۶۳۹ء (مطابق یکم رجب ۱۰۴۹ھ) پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گولکنڈہ کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

	کیا تازہ باغ مبیع الجمال		پڑی کچھ غواصی تنی کر خیال	

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "غواصی تخلص در وقت جہانگیر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ بود۔ طوطی نامہ بخشی را نظم نمودہ است، بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر آں نظم یاد نیست"۔

سب رس مصنفہ مولانا وجہی | ایک ضروری کتاب موسوم بہ سب رس کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا وجہی نے تصنیف کیا تھا۔ مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۰۴۵ھ یا ۱۰۴۶ھ میں تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سب رس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے بتلایا ہے کہ جن کی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی ہے یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اس کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفٰی ہے جیسا کہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ نفس قصہ مختصر ہے جس میں جا بجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اس کی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی ہے۔

تحسین الدین | ممکن ہے یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرضکہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام "کامروپ کلا" ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوق کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا رہا۔ جہاں اس کو عجیب عجیب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اس کی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اس مثنوی کو گارسن ڈتاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصۂ کامروپ کے نام سے شائع کیا تھا یہ بات بھی دلچسپی سے خالی

نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے اس نظم کو ترجمہ کرا کے سُنا اور اس سے بہت محظوظ ہوا

ملا قطبی | انہوں نے ۱۰۳۶ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکھنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۷۹۵ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ ۷۸۶ بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملا قطبی نے اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی | اس کی نسبت اور کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مثنوی ماہ پیکر کے مولف ہیں جس کا سن تصنیف ۱۰۶۴ھ ہے۔

طبعی | گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے جو گول کنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیاءاللہ سے تھے اور خاتمہ پہ ابوالحسن تانا شاہ کی تعریف ہے یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی مثنوی ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء لغایت ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۷ء متوفی ۱۱۱۱ھ ۱۷۰۰ء | ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ گول کنڈہ کا سب سے آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا۔ یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدردان تھا۔ ایک شعر تذکرۂ گلشن ہند میں اس کی طرف منسوب ہے یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اس کی وفات پر تخت نشین ہوا جب گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۶۸۷ء میں فتح ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اس کی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اس کو حقہ کا بہت شوق تھا چنانچہ اس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی۔ شعرائے ذیل ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں یا ان کے دربار کے شاعر تھے۔

نوری | سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کو ان ملا نوری سے نہ ملانا چاہئے جو فیضی کے دوست تھے اور جن کا ایک شعر قائمؔ نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیٹاسی اور سر چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکھا کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائز | یہ گول کنڈہ کے رہنے والے تانا شاہ کے عہد کے شاعر تھے۔ ۱۰۹۴ھ میں انہوں نے قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے دکنی نظم میں کیا۔ یہ مثنوی قصۂ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانۂ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام سے ہے۔

شاہی | شاہ قلی خان نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ شاہی

ملازمت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ تاناشاہ کے ندیم خاص ہو گئے۔ شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

مرزا ابوالقاسم تخلص مرزا حیدرآباد کے رہنے والے تاناشاہ کے مصاحب تھے۔ تاناشاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہو گئے اور حیدرآباد میں بقیہ عمر بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

عادل شاہیوں کا زمانہ
۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ

سلطنت عادل شاہ کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پیشتر بیجاپور میں اردو زبان عام ہو گئی تھی۔ امیر غریب ادنی اعلیٰ سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا لیکن یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی۔ ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تاج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اُردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خافی خان نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانہ میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اُردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی
۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء

مثل بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین بیجاپور بھی نہایت تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اس کی تین مشہور فارسی نثریں جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں "ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ میر سنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویئے اس کو جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اس نے علم موسیقی میں (دھر پد) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلمبند کئے تھے اس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ ملا ظہوری نے اس دیباچہ پر لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور کئے

مصنف گل رعنا رقمطراز ہے "کہ موسیقی کا شوق ایسا تھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار گویئے بیجا پور میں جمع کیئے اور ۱۰۰۸ھ میں بیجا پور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور چیلوں کے لئے بڑی بڑی عالی سرائیں بن کر تیار ہو گئیں۔ شاہی علم کا نام نورس محل، شاہی مہر پہ نورسی سکہ پر نورس۔ علم و نشان کے نام نورسی۔ بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کو نورسی قرار دیا۔"

علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء لغایت ۱۶۷۲ء | اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ ملک کا امن اور سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر کے حملوں سے درہم برہم ہو گیا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کرلئے اور افضل خاں کو جو بیجا پور کا سردار تھا قتل کر دیا۔ اسی علی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرمانروائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجا پور آیا۔ جہاں علی عادل نے اس کو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ کو دکھنی سے نہایت دل چسپی تھی اور دکھنی شعرا کی نہایت قدر کرتا تھا۔ بقول خافی خاں "بادشاہے بود با ہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور۔ در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود۔ در عہدِ او ترجمۂ یوسف زلیخا تالیف ملا جامی و ترجمۂ روضۃ الشہدا و قصۂ منوہر و مدمالت کہ عاقل خاں خوافی بنظم در آوردہ ملا نصرتی و دیگر شاعران بیجا پور بزبان دکنی تالیف نمودہ از نقد و جنس صلہ وافر در خور سلاطین یافتند"[1] اس کے عہد کے مشہور شعرا یہ ہیں۔ رستمی، نصرتی، شاہ ملک، امین، ابلیوا مومن، ہاشم، مرزا۔

رستمی | رستمی کا نام کمال خاں ولد اسمٰعیل خاں۔ دربار بیجا پور سے اس کا تعلق تھا۔ رستمی نے خدیجہ سلطانہ شہر بانو بیگم کی فرمائش سے ۱۰۵۹ھ میں خاور نامہ کا فارسی نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السلام کے محاورات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے شہر بانو کا عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا

نصرتی | اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں۔ بقول سید شمس اللہ قادری "نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجا پور ہے۔ ان کے آباد اجداد بیجا پور میں فوجی ملازم اور والد رکاب شاہی کے سلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا ذکر ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ بیجا پور کے مشاہیر فقرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ گلشن عشق کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا" عبد الجبار خاں ملکاپوری نے اپنے تذکرہ

---

[1] ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲

شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے "نصرتی تخلص، محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گزر اوقات توکل و قناعت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا۔ ۱۰۷۶ھ عیسوی میں دکنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوا۔ نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے"۔ یہ معلوم نہیں کہ مولف تذکرۂ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

مثنویاں

(۱) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانح و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔ ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد مدحیہ بھی درج ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔ ۲۔ گلشن عشق۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۱۰۶۸ ہجری مطابق ۱۶۵۶ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمیٰ بہ کنور پسر سورج بھان اور مدھ مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اس قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور شمع و پروانہ اس کا نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے"۔ گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بہتات ہے اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل کی تعریف کی ہے۔

۳۔ گلدستۂ عشق مصنفہ ۱۶۵۰ء لغایت ۱۶۷۰ء بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری مثنوی ہے مگر بقول ڈپٹی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نصرتی کا ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے۔ یہ بزمانۂ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا۔ ایک سو اکتیس شعر اس میں ہیں۔ بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے۔ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخئیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ سر چارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہمن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ہاشمی سید میران نام اور بیجاپور ان کا وطن تھا ہاشمی تخلص تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے

اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادرزاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام کی ایک مثنوی دکنی میں لکھی اور ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوئی۔ اس میں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ "ہاشمی نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جس قدر غزلیات ہیں ان کا بیشتر حصہ ریختہ کے بجائے ریختی میں ہے۔" قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں بہت ہے اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ۱۱۰۹ھ میں انتقال کیا۔

دولت | یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انھوں نے ۱۶۴۳ء میں ایک قصہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانوئے حسن تصنیف کیا جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانوئے حسن کے عشق کا ذکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب واقعات پیش آئے تھے ان کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک | ان کا ذکر اُردوئے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے انھوں نے ایک رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کئے ہیں۔ یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۰۸۰ھ میں تمام ہوا۔

شاہ امین | شیخ امین الدین اعلیٰ کا تخلص ہے۔ آپ بیجاپور کے اولیائے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ۱۰۸۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اسی حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقائق کو جمع کیا اور اس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دو رسالے ان سے اور یادگار ہیں۔ رسالۂ قربیہ۔ رسالۂ وجودیہ۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا | مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری بیجاپوری تھے یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ آگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابوالفضل و فیضی کا ساتھ رہا۔ ان کے بعد اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں ہوگا۔ یہاں پر صرف ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری۔ قطب شاہی دور کے کاظم علی رام راو و سیوا۔ سیوا نے روضۃ الشہدا اور قانون اسلام لکھیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں | بیجاپور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن شعرائے اُردو کی قدر و مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا زبان اُردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اُردو شعر و شاعری پھیل گئی اس زمانہ کے مشہور اُردو ذیل میں

درج ہیں

عاجز | محمد علی تخلص عاجز ۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں تھے ۔ ان کی تصنیفات سے قصۂ فیروز شاہ ہے جو اُردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے ۔ دوسری تصنیف قصہ لال و گوہر ہے ۔ اس میں لال ، زمرد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر ، جواہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے ۔ قصہ ملکہ بھی عاجز نے فارسی سے دکنی میں نظم کیا ۔ عاجز کا ذکر مشرح طور پہ اُردوئے قدیم و تاریخ شعرائے دکن میں درج ہے ۔

بحری | قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحرالدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے ۔ سنہ ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب سنہ ۱۰۹۷ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو حیدر آباد چلے گئے ۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات غزلیات ، رباعیات ، اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہوگیا ۔ آپ کی تصنیف "من لگن" تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ بزبان دکنی سنہ ۱۱۱۲ھ ہجری میں تمام ہوئی ۔ زبان اُس کی مشکل اور الفاظ سخت ہیں ۔

امین | شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گزرے ۔ انھوں نے یوسف زلیخا کے فسانہ کو دکنی میں سنہ ۱۱۰۹ھ میں منظوم کیا ۔

ولی دکھنی | سید محمد فیاض نام ۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مرآۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلور ان کا وطن تھا ۔ عالمگیر کے زمانہ میں گزرے ہیں ۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے ۔ وہاں حراست خاں ایک امیر رہتا تھا ۔ ولی ایک عرصہ تک اس کی رفاقت میں رہے ۔ پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے یہ واقعات ولی نے "رتن پدم" کے دیباچے میں بیان کئے ہیں ۔ اس کو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا یہ مثنوی ضخیم ہے ۔ دوسری تصنیف "روضۃ الشہدا" ہے اس میں کربلا کے واقعات منظوم کئے ہیں اور یہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی تھی ۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی ہے ۔

وجدی | بقول نصیر الدین ہاشمی مؤلف اُردوئے دکن "اس تخلص کے دو شاعر ہوئے ہیں ۔ ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا ۔ جنہوں نے تحفۂ عاشقاں سنہ ۱۰۱۵ھ میں لکھی اور دوسرے جنہوں نے بارھویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں ان میں ایک پنچھی نامہ ہے جو شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو وجدی نے سنہ ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا ۔" بقول مؤلف اُردوئے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی گل و ہرمز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو گل کہلاتی ہے یہ مثنوی سنہ ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوگئی اور خاتمہ میں اس کی تعریف اس طرح مذکور ہے ۔

دسے اس کی تاریخ مجھکوں عیاں	بچھانوا سے تحفۂ عاشقاں

ل ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲ ۔

غالباً مؤلف اُردوئے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے۔ ۱۱۲۵ھ میں تصنیف ہوئی اور "باغ جانفزا" سے اس کی تاریخ نکالی ہے[۱]

آزاد | فقیر اللہ متخلص بہ آزاد۔ حیدرآباد کے باشندے اور ولی اور رنگ آبادی کے معاصر تھے۔ ان کا ذکر تذکرۂ شعرائے میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے۔

شعرائے اورنگ آباد | اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے کھرکی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امرا و علما و مشائخین جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد چلے آئے۔ حیدرآباد اور بیجاپور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گذرے جن کے حالات سید عبدالولی عزلت کی بیاض۔ لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا۔ میر بہاء الدین عروج کے بہار و خزاں۔ اور محمد افضل کے تحفۃ الشعرا و تذکرۂ موسوی خاں میں تحریر ہیں۔ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ولی ۱۶۶۸ء عیسوی لغایت ۱۷۴۴ء | ولی کو اُردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اُردو کی شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اُردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہوگئے اس وقت سے اس خیال کی تردید ہوگئی مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اُردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہنچی وہ کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ ان کو ان کے معاصرین اور مابعد کے قریب العہد شعرا مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے استاد مانا ہے۔ اور ان کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلافات | ولی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک ان کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام۔ شمس الدین لقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں۔ میر حسن دہلوی۔ مرزا علی لطف و تساخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے۔ جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ غلط ملط واقع ہوگیا[۲]

---

[۱] ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲۔

[۲] ولی کا نام۔ شمس ولی اللہ درست نہیں ہے۔ ان کا صحیح نام محمد ولی اللہ ہے جس کی تصدیق پروفیسر نجیب اشرف

(باقی بصفحہ آئندہ)

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلافات

گارسن ڈیتاسی - بوم ہارٹ - اور میر حسن کا خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے ان کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی جس کی تصدیق میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعراء سے بھی ہوتی ہے۔ ولی کا تعلق خاندان شاہ وجیہہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا[1] بلکہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے البتہ وہ شاہ وجیہہ الدین کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ انھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں۔ ان سے ان کے حسنِ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرۂ اولاد شاہ وجیہہ الدین علوی میں ان کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کئے ہیں جو لوگ ان کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں ان کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا[2] کہ گجرات ان کا مولد و مسکن تھا۔ اسی طرح اس مثنوی سے بھی جو شہر سورت کی[3] ربیت میں لکھی ہے۔ ان کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا

حالات زندگی

اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم کرتے رہے۔ بعد ازاں احمد آباد گئے جو اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا اور شاہ وجیہہ الدین علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور دراز سے تحصیل علوم کے لئے آتے تھے، داخل ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مرید ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آ کر شعر و شاعری شروع کی اور اس میں انہیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریباً سب اصناف سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد آ گئے۔ جہاں انھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سنایا اور انھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔

ندوی کی ملک ایک تمسک نامہ محررہ ۱۱۰۷ھ سے بطور گواہ ہوتی ہے۔ اس میں گواہ ولی اور اس کے دربھٹیوں کے دستخط ہیں، اس میں ولی کا نام محمد ولی اللہ لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

[1] ولی کا تعلق خاندان وجیہہ الدین علوی سے ثابت ہو چکا ہے۔ ولی شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد سے تھے۔ سید ظہیر الدین مدنی نے ولی گجراتی میں ان کا نسب نامہ دیا ہے۔ یہ نسب نامہ حسین پیر صاحب کی ملکیت ہے۔ اس میں ولی کا نام شاہ ولی اللہ لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ خاندان وجیہہ الدین کے ناموں کے آگے عموماً شاہ لکھا جاتا تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔

شاہ ولی اللہ بن محمد شریف (متوفی ۱۱۰۷ھ) بن سید عبدالرحمٰن بن سید احمد (متوفی ۱۰۰۸ھ) بن سید بہاء الدین بن حضرت شاہ نصر اللہ حسینی برادر حقیقی حضرت شاہ قطب العارفین علامہ شاہ وجیہہ الدین رحمۃ اللہ علیہ (مرتب)

ولی کے دو سفر تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سنہ ۱۷۰۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی[1] جنہوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہو نے تھے۔ البتہ ان سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انہیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابوالمعالی کے ساتھ سفر کیا جس میں دلی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابوالمعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو درجہ عشق کو پہنچ گئی تھی، ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں سنہ ۱۱۳۴ھ مطابق سنہ ۱۷۲۲ء میں ہوا۔ اس سفر میں ولی اپنے ساتھ اپنا دیوان ریختہ لائے تھے جس کی نہایت قدر دانی کی گئی[2] اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اس کی شہرت ہوئی کہ امرا کی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں اس کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے ان کے اشعار کو سن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

دہ مجلس[3] سنہ ۱۱۴۱ھ میں دلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہدائے کربلا کی شان میں ایک مثنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جس کے ان دو آخری شعروں سے اس کا سنہ تصنیف اور اس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

ہوا ہے ختم جب یہ درد کا حال		تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال	
کہا ہاتف نے یہ تاریخ معقول		ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول!	

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ ولی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے۔ مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے دیوان دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے وہ ناپید ہو گیا ہے[4]

وفات ولی کو گجرات سے ایسی دل چسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرہ شعرائے دکن سنہ ۱۱۵۵ھ مطابق سنہ ۱۷۴۴ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے[5]

ولی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا۔ مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال۔ گوہر لال۔ اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر ان کے اشعار میں موجود ہے وہ گو کہ حنفی المذہب تھے۔ جیسا کہ صحابۂ کرام کی تعریف سے ظاہر ہے جو ان کے اشعار میں

---

[1] ولی پر کام کرنے والے حضرات کا خیال ہے کہ یہ ملاقات دلی میں نہیں ہوئی۔ قاضی احمد میاں اختر اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اس خیال کے حامی ہیں۔ محمد اکرام چغتائی نے اپنے مقالہ ولی اور سعد اللہ گلشن (اردو نامہ کراچی شمارہ نمبر ۲۳) میں بتایا ہے کہ یہ ملاقات سنہ ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۱۰ھ کے درمیان گجرات میں ہوئی ہوگی (مرتب)

[2] اس میں ولی کا دلی آنا محض قیاس ہے، وہ اس سے بہت پہلے سنہ ۱۱۱۹ھ میں انتقال کر چکے تھے (مرتب)

[3] یہ ولی کی تصنیف نہیں ہے۔ (مرتب) [4] شائع شدہ بمبئی سنہ ۱۹۵۰ء [5] ولی نے ۱۱۱۹ھ ۔۔۔ میں انتقال کیا (مرتب)

یں موجود ہے مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے ان کو کوئی تعصب نہ تھا کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے انھوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دور دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں ان کا جانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا مگر گارسن ڈیٹاسی ان کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے۔ البتہ ستارا۔ دلی اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف ان کے اشعار میں موجود ہے۔ مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں۔

عجب شہروں میں ہے پُر از اک شہر	بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
کہ ہے مشہور اُس کا نام سورت	کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت	ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

دلی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے تتبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جا بجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پر رائے ان کی تصانیف باعتبار قدامت اور نیز باعتبار زبان بہت دل چسپ ہیں۔ عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور انہیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی۔ سلاست اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی، بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
دشمن دیں کا دیں دشمن ہے	راہزن کا چراغ راہزن ہے
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو	کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے	سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اس پریشاں کو	جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں
خوب رو خوب کام کرتے ہیں!	اک نگہ میں غلام کرتے ہیں!
دل ہوا ہے مرا خراب سخن	دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے	جس کو ہے نشۂ شراب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں	تا قیامت کھلا ہے باب سخن
گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے	جس نے دیکھا ہے آب و تاب سخن
ہے سخن جگ منے عدیم المثل	جز سخن نہیں دوجا جواب سخن
شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی!	دل ہوا ہے مرا کباب سخن
عرفی و انوری و خاقانی!	مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

اے ولی درد سر کبھو نہ رہے
جب ملے صندل و گلاب سخن

داؤد مرزا داؤد نام داؤد تخلص اورنگ آباد ولی کے معاصر تھے اور سنہ ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے یادگار ہے۔

سراج سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ غالباً آپ سنہ ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنا حال منتخب دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے[1]۔ اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" سنہ ۱۱۶۹ھ ہجری ہے۔ سراج نے اس میں متقدمین و معاصرین شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مجموعہ ضخیم ہے اور اسمیں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دواوین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقاد سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا اکثر اوقات عالم بیخودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے مگر تحریر کے دائرہ میں نہیں آئے اور اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہو جاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی المتوفی سنہ ۱۱۶۱ھ کی خدمت میں پہنچا حسن ارادت سے مرید ہوا۔ ان دنوں میں بپاسی خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے۔ خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے۔ حروف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی"۔ سراج ایک درویش منش اور پاک باز بزرگ تھے۔ مسافر دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و پاکیزہ دل۔ ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے اس میں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے۔ قوال و گویے آپ کی غزلیں سناتے تھے مجلس میں آپ کا وہ رعب و داب تھے کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے اس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار دولت آبادی۔ ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی۔ محمد فقیہ دردمند۔ مرزا محمد باقر شہید۔ وجان مرزا رسا۔ موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی وعبدالقادر ساحی اور عارف الدین خاں عاجز۔ موسوی خاں فطرت۔ خافی خاں۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعرا و علما و مشائخ تھے۔ خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔

میر نے نکات الشعرا میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲۔

حاصل تھا۔ مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی نہیں تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ[1] کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے منتخب دیوان ہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں ایک ہزار سات ابیات ہیں اور گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و ذو معانی الفاظ سے پاک و صاف ہے۔ سیدھا سادہ بیان ہے۔ تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے کرشمے بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ مضامین میں شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے تمام مقام تھے۔ دکن میں استادی کے رتبہ کو پہونچے۔ ولی نے اس زمین میں جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے ان کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا آپ نے چوتھی شوال یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بےخبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زبان سیں بیان کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی!

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

---

[1] سراج کا دیوان ریختہ شائع ہو چکا ہے

دیگر شعرا اس دور کے

اس دور میں بہت سے شاعر گزرے ہیں جن کا ذکر بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے نام و حالات تذکرۂ لچھمی نرائن و تذکرہ موسوی خاں و نکات الشعرا میر۔ تذکرہ شعرائے اُردو میر حسنؔ۔ تذکرہ شعرائے دکن مؤلفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ "دکن میں اُردو" مولفہ نصیر الدین ہاشمی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں۔ عارف الدین عاجزؔ۔ سید عبدالولی عزلتؔ۔ بارؔ۔ محرمؔ۔ ایماؔ۔ داغؔ۔ زنگینؔ۔ جهندیؔ۔ عزیزؔ۔ حازمؔ۔ مہرؔ۔ پناہؔ۔ عراقیؔ جنابؔ۔ شرافتؔ۔ شہیدؔ۔ ضیاؔ۔ کاظمؔ۔ مبتلاؔ۔ نجمؔ۔ ہمدمؔ۔ دردؔ۔ حشمتؔ۔ حاجیؔ۔ قادرؔ۔ فخرؔ۔ فتوتؔ قدرؔ ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نام آور ہیں اور جو حالات کہ مصنف گل رعنا نے ان شعرا کے درج کئے ہیں وہ زیادہ تر تذکرۂ شعرائے دکن سے ماخوذ ہیں۔

احاطۂ مدراس و آرکٹ کے شعرا

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ ویلور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو زبان میں سیر۔ عقائد۔ فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں۔ ۱۱۸۰ھ سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ سنہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان سلف وطناً بیجاپوری تھے۔ مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ "در خیابان کرناٹک ہیچو او نہالے سر بالا نکردہ و از گل زمین مدراس مثل او گل خوش نہ دمیدہ" اُردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ہشت بہشت، تحفۃ النسا، تحفۃ الاحباب، فرائد در عقائد، ریاض الجنان، محبوب القلوب۔ روضۃ السلام، گلزار عشق، قصہ رضوان شاہ۔ روح افزا، خمسہ متحیرہ، مثنوی روپ سنگار۔ ارکاٹ کے دربار کے مدار المہام شرف الملک مولانا محمد غوث اور ان کے خلف مولانا قاضی بدر الدولہ نے بھی کئی کتابیں اُردو میں لکھیں اس وقت کے شعرا کے نام ذیل میں رقم ہیں۔ محمودؔ۔ صباحیؔ۔ احمدؔ۔ اعظمؔ[1]

---

[1] ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲۔

باب ۳

اساتذۂ دہلی

حصّہ اوّل ۔ طبقہ متقدمین

حاتم و آبروؔ کا زمانہ

دِلّی میں اُردو زبان کی ابتدا اور ترقی

اُردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حاصل کر چکی تھی اور اس میں اس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ برخلاف اس کے جہاں تک معلوم ہوا ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی مولانا جمالی جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور سنہ ۹۴۲ھ ہجری میں فوت ہوئے ۔ ملا نوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے ملا فیضی سے بہنایت اتحاد رکھتے تھے ان کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اُردو ہیں لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر۔ اکبر و جہانگیر شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور ان کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔ اس کے نمونے اُردوئے قدیم اور تذکرہ گل رعنا میں موجود ہیں۔ شاہجہاں کا اردو میں شستہ لکھنا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اُردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہو گئی تھی۔ بازار سے شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بولتے اور سمجھتے تھے[1]

عالمگیر کے زمانہ سے دِلّی میں اُردو شعر گوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب نے پہلے فارسی شعراء نے توجہ کی۔ موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدل۔ مرزا عبدالغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے۔

---

[1] اُردوئے قدیم ۱۲۔

لیکن تفریح خاطر کے لئے اُردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دہلی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے۔ محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں وداد۔ علی قلی خاں ندیم۔ شیخ سعد اللہ گلشن۔ مرتضیٰ قلی خاں فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی میں جمع تھے۔ سید شمس ولی اللہ دکن سے آ گئے۔ فراقی۔ فخری۔ آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے۔ ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدر دانی کی گئی جو شعرا صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے ان کو اُردو میں بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ امید۔ بیدل۔ فراق۔ آرزو نے اُردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان ولی سے اُردوئے معلّٰی کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔[1]

اُردو لغات کی ترتیب قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اُردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبد الواسع ہانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور گلستان بوستان کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اُردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا۔ اس کا نام "غرائب اللغات" رکھا اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کی نظر ثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کئے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے "نوادر الالفاظ" کے نام سے موسوم کیا۔[2]

دلّی کے پرانے شاعر جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی، اس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں تو جو ولی کے ہمعصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے۔ ریختہ کا آبائے قدیم سمجھنا چاہئے یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی۔ شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز اب تک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدّے دکنی لفظ و محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان

زبان کے ساتھ ان کی خدمات میں داخل ہو گئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات تصفیہ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ انہوں نے یہ مشکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔ اسی لئے ان کی قابلیت اور خوش مذاق کی داد دینا چاہئے یہ سچ ہے کہ بجا شا الفاظ کی خوبصورتی ان کی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے

---

[1] گل رعنا ۱۲۔ [2] اردوئے قدیم ۱۲

بدلے غیر ملکی الفاظ کم لئے جاتے مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کانٹ چھانٹ اور متروکات
کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور دقتِ نظر سے کام لیا اور بھدّے ناتراشیدہ محاورات اور تراکیب
کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اسی کے وہ مشتاق
تھے۔ زبان میں چونکہ لوچ اور قوتِ جذب پہلے ہی سے موجود تھی اس لئے یہ سب جدید تصرفات اس
نے آسانی سے قبول کر لئے۔

صنعت ایہام | ولی کے معاصرین صنعتِ ایہام کے بہت شائق تھے جس کا ذکر پیشتر کیا گیا۔ یہ
صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہروں کی جان ہے۔ قدما کے کلام میں ایسے
ذو معنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں۔ یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ شاہ مبارک آبرو۔ یک رنگ
شاکر ناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا اور اس کو اپنا مستقل فن بنا لیا تھا مگر شاہ حاتم
کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر، سودا، میر، قائم نے اس کا رواج بہت کم کر دیا۔
اور میر درد، فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا۔ میر فرماتے ہیں ؎

کیا جانئے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے	کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں
سودا فرماتے ہیں ؎	
یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی	منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں
قائم چاندپوری ؎	
ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بتِ چیں	یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرِ شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ	تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

تصوف | ایک دوسری خصوصیت اس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا
یہ رنگ اس زمانے میں عالم گیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعراء اکثر صوفی مشرب ہوتے یا کم از کم آخر عمر میں
ہو جایا کرتے تھے۔ پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی
ہوئی تھی اور اردو شاعری اس کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف
شاعری کا جزوِ اعظم تھا۔ انہیں اسباب سے اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصا چڑھ گیا

سپاہی پیشہ شعرا | اس زمانہ کے شعرا اکثر سپاہی پیشہ ہوتے۔ اس وجہ سے کہ زمانہ بہت پُر آشوب
تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بدامنی۔ سلطنت کی کمزوری ان سب وجوہ سے کسی جان و مال
محفوظ نہ تھا اور پھر سپہ گری کا پیشہ نہایت عزت اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یکرنگی کی کمی اور سبک و مبتذل الفاظ | ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعراء کا کلام یکرنگ نہیں مثلاً
کسی غزل کو لیجئے تو اس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے مگر بعض شعر

نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے، اُس زمانہ میں معمولی اور سوقیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اس وقت تک تفننِ طبع اور تبدیلِ ذائقہ کے طور پہ لکھی جاتی تھی نہ کہ اس میں مزاولت اور عشق مدِ نظر تھی اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو، حاتم۔ ناجی۔ مظہر۔ کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جو ذوقِ صحیح اور طبعِ سلیم پہ ناگوار ہیں میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو اب کسی مہذب صحبت میں شائد ہی استعمال کئے جائیں۔

اس عہد کے شعرا کا طرزِ بیان اور ان کے کلام کی خامیاں،

نظم ابھی پختگی اور کمال کے درجہ پہ نہیں پہونچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آج کل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا وقدیم دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت و بھاشا وقدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جس کی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کر دیئے گئے مگر اس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیئے گئے۔ عربی و فارسی کے مترادف قبول کئے گئے اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا۔ قدیم محاورات و الفاظ جو ولی کے زمانے میں مستعمل تھے ان میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ شعرائے اُردو میں درج ہے کہ "گو استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پرواہ کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے نہ صرف اسی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ ان کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے"۔

شاہ مبارک آبرو[۱] متوفی سنہ ۱۱۶۵ھ،

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے گوالیار میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے صاحب دیوان ہیں مگر افسوس کہ دیوان زمانۂ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے[۱]۔ ایک مثنوی موسوم "آرائش معشوق" بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔

---

[۱] دیوان آبرو کے قلمی نسخے مندرجہ ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں

(باقی بصفحۂ آئندہ)

ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو پیر عمن خلعت شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر ان کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن، مصحفی، فتح علی۔ اور لطف وغیرہ ان کے مداح ہیں اور ان کے کلام کی تعریفوں سے ان کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرا میں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی کلام رکیک اور مبتذل ہو جاتا ہے گو وسعت معلومات محدود ہے مگر درسیاست سے فارغ معلوم ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔[1]

خان آرزو ۱۶۸۹ء[2] تا ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خاں متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعرا، اور ناقدان فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زبان نہ تھا۔" میر حسن ان کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی مدح سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی، ان کو نام کی مناسبت سے "چراغ محفل فصاحت" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کو زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور زمانہ کے شعرا کا جگت استاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے استاد تھے گو اُردو کم کہتے تھے مگر ان کے استاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ میر، سودا، مظہر، درد ایسے قادر الکلام ان کو استاد مانتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے۔ شعر کہنا ابتدائے عمر میں اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کاملہ حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر

دیوان آبرو کے نسخے مندرجہ ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

سینٹرل لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، لائبریری ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، لائبریری کنگز کالج کیمبرج۔ ایک نسخہ پٹیالہ میں ہے۔ جس کا متن مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔

مثنوی آرائش معشوق، فرحت اللہ بیگ نے جنوری ۱۹۳۰ء کے رسالہ اردو میں شائع کرائی تھی۔ (مرتب)

1. سال وفات ۱۱۶۱ھ — ۱۷۵۰ء درست نہیں۔ سفینۂ خوشگو کے مطابق آبرو ۱۱۴۶ھ/۳۴-۱۷۳۳ء میں فوت ہوئے، تذکرۂ ہندی صفحہ ۲ کے مطابق آبرو پچاس برس کی عمر میں گھوڑے کی لات لگنے سے مرے اس طرح ان کا سال پیدائش ۱۱۹۳ھ/ ۱۸۱۱ — ۱۷۸۰ء قرار پاتا ہے۔ (مرتب)

2. صحیح تاریخ پیدائش ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ — ۱۶۸۷ء۔

فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۳۰ھ میں دہلی واپس آئے۔ ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندوستان آئے جہاں انکے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی۔ ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا مگر آرزو کو کمال فن اور استغنا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر ان دونوں باکمالوں کا سامنا ہوگیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں ان کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے اور ان کو ایک رسالہ مسمّٰی بہ تنبیہ الغافلین[1] کی صورت میں شائع کیا۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی اور تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پیوند زمین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ ان کی قابلیت طباعی۔ ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلم ہے۔ تصانیف بکثرت ہیں منجملہ ان کے کتب ذیل موجود ہیں۔ ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار اشعار کا۔ شرح سکندر نامہ و قصائد عرفی۔ و گلستان سعدی لغت فارسی موسوم بہ سراج اللغات "لغت اُردو موسوم بہ "غرائب اللغات" جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مسمّٰی بہ نوادرالالفاظ کی شرح ہے[2]۔

رسائل "موہبت عظمیٰ" اور "عطیۂ کبریٰ" فن بلاغت و معانی و بیان میں۔ تذکرہ "مجمع النفائس" جس کو تذکرۂ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں ان ہندوستانی اور دکنی شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے بزبان فارسی شعر لکھے ہیں۔ اس میں سے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعرا" میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریباً پندرہ تصانیف خان آرزو کی کہی جاتی ہیں۔ مشہور استاد تھے اور بعض شاگرد اپنے سے بھی نامور چھوڑ گئے۔ زبان اُردو ایسے محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء عیسوی

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہئے۔ ریختہ بہ طرز ولی و مضمون و ناجی وغیرہ لکھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۱۱۱۱ھ لفظ ظہور سے نکلتی ہے۔ جو ۱۷۰۰ء-۱۶۹۹ء کے مطابق ہے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبۂ الہ آباد کی رفاقت میں رہے۔ ۱۷۲۲ء میں جب دیوان ولی دہلی میں آیا اور اس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہونچ گئے۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے استاد

---

[1] اسی نام کا ایک رسالہ سودا کا بھی ہے جس میں فاخر مکین کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔

[2] یہ بات درست نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ غرائب اللغات عبدالواسع ہانسوی کی لغت ہے اور خان آرزو کی نوادرالالفاظ اس کی شرح ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

مانے گئے ہیں۔ دو دیوان ان کی طرف منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ[1] جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں پہلے رمزؔ تخلص کرتے تھے[2] عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات کے نام سے منتخب کر کے مرتب کیا۔ اس کا نام دیوان زادہ رکھا[3]۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و ناجی کے طرز میں لکھا تھا۔ تذکرۂ قدرت میں لکھا ہے کہ "فاما زعم شاعری بسیار دارد، دیوان قدیم او از نظر ایں مؤلف گذشتہ بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم"۔ محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے۔ اپنے دیوان کے دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیئے ہیں جس میں سب سے پہلے مرزا رفیع سودا کا نام نامی ہے یہ ایسے شاگرد تھے جن پر استاد کو بھی فخر تھا اور مشہور شاگردوں میں، رنگین۔ نثار۔ تاباں۔ فارغ بھی ہیں۔ شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی۔ تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیئے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش و ناسخ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اس کی داغ بیل شاہ حاتم شاہ نے ڈال دی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے معاصرین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہو جاتی۔ شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں "خوشہ چین خرمن سخنوران عالم۔ بصورت محتاج و بمعنی خاتم کہ از سنہ ۱۱۲۹ھ تا سنہ ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را استاد می داند۔ اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو۔ و شرف الدین مضمون و مرزا جان و جاناں مظہر و شیخ احسن اللہ احسنؔ و مرزا شاکر ناجی۔ و غلام مصطفےٰ ایک رنگ است۔ و لفظ در و بر و از و الفاظا زو الفاظ و افضال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ آرند منظور دارد زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمودہ .. .. .. مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود۔ ان کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صرف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۱۹۷ھ یا سنہ ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا[4]۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۰ برس

---

[1] شاہ حاتم نے سنہ ۱۱۴۳ھ کے لگ بھگ اپنا دیوان قدیم مرتب کیا۔ (شاہ حاتم اور ان کا کلام ص۱۲)، [2] مصحفی نے لکھا ہے کہ حاتم پہلے رمزی تخلص کرتے تھے (عقد ثریا ص۲۳)، [3] دیوان زادہ کا سال ترتیب سنہ ۱۱۶۹ھ ہے (شاہ حاتم اور ان کا کلام ص۲۲)
[4] مصنف خمخانۂ جاوید کی تحقیق کے مطابق ۹۶ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۰۷ہجری میں انتقال کیا ۱۲ (مرتب)

کی عمر میں سنہ ١١٩٦ھ میں فوت ہوئے[1]۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرہ میں "مرد جاہل و متمکن" ان کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن ان کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی غزلوں کو نغمہ سرایان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اردو میں منفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے استاد تھے اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں انھوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

میاں مضمون متوفی ١٧٣٥ء شیخ شرف الدین تخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

جاجمؤ صوبۂ اکبر آباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا۔ بچپن میں دلی گئے اور زینت المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف با مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ میر ان کو "ہنگامہ گرم کن محفلہا" لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے استاد فن اور اسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے ایک دیوان دو سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات و ایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے مملو ہے گو کہ سن میں آرزو سے بڑے تھے مگر شعر میں ان سے مشورہ کر لیتے تھے۔ میر ان کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشتاق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی ان کے بہت معترف ہیں خان آرزو ان کو شاعر "بیدا نہ" کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت ان کے گر گئے تھے۔ ١١٤٥ھ مطابق ١٧٣٢ء میں انتقال کیا[2]۔

مرزا مظہر جان جاناں ١٦٩٩ء تا ١٧٨١ء شمس الدین نام جان جاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنیفہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی شاہی دربار میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھی۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ صوفی باصفا اور شاعر بلند تھے کلام میں جس قدر متانت اور تاثیر ہے اسی قدر توحید اور معرفت بھی جلوہ گر ہے۔ مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن ڈیٹاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ سنہ ١١١١ھ مطابق

---

[1] حاتم کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ محمد حسین آزاد، کریم الدین، لالہ سری رام اور ڈاکٹر زور سنہ ١٢٠٧ھ لکھتے ہیں۔ مصحفی معاصر شہادت کی بنا پر سنہ ١١٩٧ھ / سنہ ١٧٨٢-٨٣ء لکھتے ہیں۔ عرشی اسی سنہ کو درست سمجھتے ہیں دستور الفصاحت حاشیہ صفحہ ۔ ڈاکٹر غلام حسین "شاہ حاتم اور ان کا کلام" میں اسی سنہ کو درست قرار دیتے ہیں ان کا استدلال دیکھئے۔ صفحہ ٣٣ تا ٣٨ (مرتب)

[2] مضمون کا صحیح سال وفات دیوان تاباں کے قطعہ تاریخ کے حوالے سے سنہ ١١٤٧ھ / سنہ ١٧٣٤-٣٥ء ہے۔ (مرتب)

۱۶۹۹ء میں[1] مگر مولانا آزاد کی تحقیق کے بموجب ۱۱۱۲ھ میں بمقام کالا باغ صوبۂ مالوہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور نسباً علوی تھے اور خاندان شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے شوق تھا۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تین برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحب دل تھے۔ سینکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "عزیزیست۔ مقدس۔ مطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال۔ شہرہ عالم۔ بےنظیر۔ معزز۔ مکرم اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند۔ خوش تقریر بمنزلہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد" حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحئی تاباں سے جو اس زمانہ کے شہرۂ آفاق حسین و خوبرو شاعر تھے بہت محبت اور اختلاط تھا۔ عالم متبحر۔ فقیہ کامل حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع ضرب المثل تھی۔ استغنا اور بےتعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں۔ محمد شاہ نے ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصہ چاہئے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیش کش کئے قبول نہ ہوئے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا منظور نہ ہوا۔ استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپ کا اخلاق شگفتہ روئی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی۔ حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالےٰ نے بدرجۂ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کئے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا۔ زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا

---

[1] مرزا مظہر کے سال ولادت میں اختلاف خود ان کے اپنے متضاد بیانات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مولانا غلام علی آزاد کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ "در عشرۂ اولیٰ مائۂ ثانیہ بعد الف ولادت فقیر اتفاق افتاد" اس طرح ولادت ۱۱۱۰ھ/۹۹-۱۶۹۸ء سے قبل ہے۔ ایک اور خط میں اس سے مختلف بیان ملتا ہے "دو ہزار و صد و سیزدہ ولادت فقیر و در عمر شانزدہ سالگی گرد یتیمی بر رو نشست" والد کے انتقال کا سال لکھتے ہیں "در سال ہزار و صد و سی ہجری انتقال ازیں عالم نمود" اس بیان سے مرزا مظہر کی پیدائش ۱۱۱۳ھ متعین ہے۔ دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "امروز کہ ہزار و صد و ہفتاد ہجری است و عمر بشصت رسیدہ از بیست سال بکنج عشرت آرمیدہ است" اس حساب سے پیدائش ۱۱۱۰-۱۱ھ/۱۷۰۰ء/۱۶۹۹-۹۹-۱۶۹۸ء متعین ہے۔ مرزا مظہر کے ان متضاد داخلی بیانات کی وجہ سے پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

اعتراف کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں[1]۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ تصوف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من و عن اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی ایک ہزار ابیات کا جو سنہ ۱۱۷۰ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے جس میں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اردو اور ایک بیاض "خریطۂ جواہر" فارسی شعراء کے منتخب کلام کی آپ کی تصانیف سے یادگار ہیں۔ وفات نہایت افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرۂ محرم تھا۔ تعزیے نکل رہے تھے۔ مرزا صاحب اپنے جھروکے پر بیٹھے ان کی سیر کر رہے تھے۔ مشہور ہے کہ ان کی زبان سے نکلا۔ کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور و غل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے ڈھانچوں کا اس قدر ادب و احترام کرنا خلاف عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیہ لے جانیوالوں نے سن لیا اور برسر پرخاش ہوگئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر وارد ہوئے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہ ہوا باہر نکل آئے۔ ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری۔ مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۴ھ مطابق سنہ ۱۷۸۰ء کا ہے[2]۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیان۔ مصطفٰے خاں یکرنگ۔ بساون لال بیدار اور محمد فقیہ دردمند مشہور شاعر صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

سال ولادت ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۱۳ھ/۹۸-۱۶۹۷ اور ۰۲-۱۷۰۱ء کے درمیان قرار دیا ہے (دیکھئے اورینٹل کالج میگزین نومبر سنہ ۱۹۴۱ء ص ۳۸) (مرتب)

[1] مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دور دور ایہام گویاں بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہوری دہد فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزاست بعدہ تتبعش بدیگراں رسیدہ" ۱۲ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں "میگویند اول کسیکہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ و ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہ جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خاص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بمظہر مرویست فرشتہ صفت" ۱۲ انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "ازبسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیض مآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوشزد راقم خود میداشت دل بادیدہ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں حضرت ہست باز میداری" ۱۲ میر صاحب لکھتے ہیں "دیوان مختصر شعر فارسی از نظر فقیر آمدہ است از تسلیم و کلیم پائے کم ندارد" ۱۲ میر حسن لکھتے ہیں "از فصحائے زماں و بلغائے دوراں"۔

[2] یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۴ھ میں نہیں، بلکہ بقول مصحفی محرم سنہ ۱۱۹۵ھ / جنوری سنہ ۱۷۸۱ء کو پیش آیا۔ محرم کو (باقی بصفحہ آئندہ)

ناجی | سید محمد شاکر نام ناجیؔ تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے نعمت خانہ کے داروغہ شاہ آبرو حاتم اور ولی کے معاصر عہد محمد شاہی کے شعرا میں ہیں۔ جب نادر شاہ نے دلّی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی۔ جس کے پُردرد حالات ایک مخمس میں بیان کئے ہیں۔ بعنفوان شباب میں انتقال کیا[۱] آرزو ان کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز شوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ "مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود مُنھ بنائے رہتے"۔

ان کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہے۔ بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اس زمانہ کا رنگ ہے

تاباں[۲] | میر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوش رو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زبان زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے ان کے حسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اسی حسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے ان کے حسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کے روئے صبیح کی زیارت کے لئے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر ایک شخص جس کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کو ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ ان کے حال میں لکھا گیا ہے اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مے نوشی کثرت سے کرتے تھے جس کی وجہ سے استسقا ہو گیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ انہوں نے ان کو ۱۲۰۱ھ میں دیکھا تھا اور جب وہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ۱۷۹۶ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک ۱۷۹۶ء زندہ تھے[۳] میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "نوجوان بامزہ بود۔ سید

مرزا مظہر زخمی ہوئے اور عاشورہ کے روز انتقال کیا۔ مصحفی نے ان کی تاریخ بھی کہی ہے (عقد ثریا صفحہ ۵۶-۵۵) (مرتب)

[۱] سال وفات قیاساً ۱۱۵۲ھ/۴۰-۱۷۳۹ء ہے (مخزن نکات ضمیمہ صفحہ ۲۲۶) (مرتب)

[۲] سال پیدائش نامعلوم ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے سال پیدائش ۱۱۲۰ھ یا اس سے پہلے بتایا ہے۔ تخمینہ کی بنیاد ناجی کی زمین میں شاہ حاتم کی غزل ہے جس کا مصرع ہے ؎

طفل مکتب تھا سر عالم زیبِ تاباں ہو گیا

ڈاکٹر صاحب نے اس غزل کو ۱۱۳۵ھ کی مانتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس وقت تاباں کی عمر ۱۵ برس سے کم ہو گی لہٰذا سن پیدائش ۱۱۲۰ھ سے پہلے ہو گا لیکن مندرجہ بالا جس غزل کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے دیا ہے وہ رضا لائبریری رام پور اور پنجاب یونیورسٹی کے دیوان حاتم (قلمی) کے مستند نسخوں میں ۱۱۵۵ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس طرح یہ تخمینہ درست نہیں رہتا۔ مجب علی خاں فائق نے ان حقائق کے پیش نظر سال پیدائش کا اندازہ ۱۱۳۶ھ کے لگ بھگ بتایا ہے۔ (مرتب)

[۳] سکسینہ نے مؤلف گلشن ہند کا بیان سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مؤلف نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے ۱۲۰۱ھ میں تاباں کو لکھنؤ

بجیب الطرفین مولد و شاہجہاں آباد است۔ بسیار خوش فکر و خوب صورت خوش خلق و پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج۔ تاحال در فرقۂ شعرا، بچوں او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" تذکرے ان کی مے نوشی کے متعلق لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ او می رفتند او را مست طافح می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے بھی مجبور ہو کر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔[1] ان کا کلام عاشقانہ شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس شاگردی میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ حاتم[2] اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو ان کا استاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

یکرنگ | مصطفےٰ خاں یکرنگ خاں جہاں لودی کے اعتقاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنوران دہلی میں شمار کئے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور میاں مضمون کے طرز کا ہے بعض لوگ ان کو شاہ آبرو کا اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیا دار عشق مجازی کا مگر عرفا ان کو عشق حقیقی کا پرتو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔[3] ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں

فغاں متوفی ۱۱۷۲ھ | اشرف علی خاں متخلص بہ فغاں خلف مرزا علی خاں نکتہ۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے اس وجہ سے ظریف الملک کوکہ خاں بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی۔ پھبتی کہنے کے

میں دیکھا تھا بلکہ اس نے یہ لکھا ہے کہ تاباں کے محبوب سلیمان کو لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ (گلشن ہند صفحہ ۵۹) (مرتب)

[1] وفات ۱۱۶۳ھ اور ۱۱۶۴ھ کے درمیان تھی ۱۱۶۳ھ تفصیل کے لئے دیکھئے اورینٹل کالج میگزین ۱۹۵۶ء اگست ۱۹۵۶ء

[2] حاتم نے اپنے ایک شعر میں تاباں کی شاگردی کا خود اعتراف کیا ہے ۱۱۵۶ھ کی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت | پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

تاباں نے خود حاتم کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے ؎

جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف | اوہی رتبہ ہوا ہے تب سے ایسے شعر کا (مرتب)

[3] ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء سے قبل انتقال کیا (ضمیمہ مخزن نکات صفحہ ۲۲۵) (مرتب)

○ فغاں کو کوکہ خاں کا خطاب احمد شاہ نے دیا تھا

مشاق تھے[۱] جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغاں مرشد آباد چلے گئے جہاں ان کے چچا ایرج خاں برسر اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے[۲] اور نواب نے ان کی بڑی خاطر و مدارات کی چونکہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی) نواب نے جوش اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا جہاں مہاراج شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہوں گے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونوں با کمال ان کے معترف ہیں۔ سودا نے ان کے بعض اشعار کی توضیح بھی کی ہے۔ میر صاحب ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں[۳] فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ مبتذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے۔ قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب ان کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا" کہتے ہیں دیوان میں غزلیات، قصائد، قطعات، رباعیاں، مخمس سبھی کچھ ہیں۔

باقی اور شعرا: اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور ان کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیئے ہوئے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں ان سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں میر محمد حسین کلیم جو دلی کے رہنے والے تھے وہ قابلِ ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا انہوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا۔ میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

سرور نے ان کا خطاب کلتاش لکھا ہے۔ (عمدۂ منتخبہ ص ۴۷۰)
ظریف الملک کا خطاب الگ ہے جو انہیں راجہ شتاب رائے نے عظیم آباد میں دیا تھا۔ (گلشن سخن ص ۱۷۹) (مرتب)
فغاں پٹنہ ۱۱۷۰ھ میں پہنچے (گلشن سخن ص ۱۷۱) (مرتب)

[۱] میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر نا گرمل کو "گھی کی منڈی کا سانڈ" اور ایک شخص مسمی بہ حکیم معصوم کو "گاؤ گجراتی" کہا کرتے تھے۔"

[۲] صحیح واقعات اس طرح ہیں کہ فغاں حملہ ابدالی سے قبل ۶۷-۱۱۶۶ھ کے قریب دلی سے نکل کر اودھ پہنچے اور یہاں سے ۱۱۷۰ھ کے شروع میں عظیم آباد گئے ممکن ہے ۷۰-۱۱۶۷ھ کے درمیان وہ مرشد آباد بھی گئے ہوں (اورینٹل میگزین) اگست ۱۹۵۷ء، ص ۵۸۔ ہماری زبان ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء (مرتب)

[۳] فغاں نے اپنے اشعار میں خود ندیم کو استاد تسلیم کیا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۷۰)

باب ۶

اساتذۂ دہلی

حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اُردو شاعری کا زریں عہد یہ دَور اُردو شاعری کی ترقی کا سب سے بڑا دَور ہے۔ اسی میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسنؔ، دردؔ، سوداؔ اور میرؔ ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں بلکہ جب تک زبان اُردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام اصناف اس عہد میں انتہائے کمال پر پہنچے مثنوی میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان ° ندہ میں سودا کے قصائد غزل میں میرؔ اور دردؔ کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل استاد اپنے اپنے فن میں بے نظیر و بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرورِ ایام سے کم نہیں ہو سکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوقؔ۔ غالبؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ۔ سب ان کا لوہا مانتے تھے اور ان کی استادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے ؎

نہ ہوا پہ نہ ہوا میر کا انداز نصیب	ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں
ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

ہر چند اب ندیم کا ستاگر دہے فغاں — دو دن کے بعد دیکھو استاد ہو گیا
دشت جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا — اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

میر صاحب نے لکھا ہے کہ فغاں فارسی کلام پر قزلباش خاں امید سے اصلاح لیتے تھے (نکات الشعرا)

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں نا سخ ہم اس مغفور کا

زبان میں فارسیت کا غلبہ اس عہد میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔ میر سودا اور دیگر استادانِ فن اپنے پیش رؤں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و میر جاناں مظہر نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ نکال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوۂ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جس کو شعر الہند میں نقل کیا ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اُردو شاعری بالکل فارسی شاعری کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا۔ چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے حافظ و سعدی سے استفادہ کیا اور ان کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی۔ جلال۔ اسیر۔ کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش مذاق شعرائے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعرا کے کلام کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے متاخرین شعرائے فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے۔ چنانچہ سودا و میر درد وغیرہ نے اس دور کے متقدم شعرائے فارسی مثل صائب۔ بیدل۔ نظیری۔ عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کے ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے" سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اسی کے ہو گئے میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

الفاظ میں تذکیر و تانیث الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مونث اور مذکر لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں۔ اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اس زمانہ میں داخل ہوئے۔ مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث مربع کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتدا، فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور ہجو کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اسی وقت درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ مشکل مشکل بحریں اور قافیے۔ اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

شعراء دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں

افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔ چنانچہ میر۔ سودا۔ میر حسن، سوز وغیرہ اس پر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے[1] جو اس وقت شعراء و کملا کا ملجا و ماوا تھا اور ہر فن کے استاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ صرف میر درد ہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنھوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔

کلام کی خصوصیات

اس عہد کے شعراء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیالات اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار اور فصیح الفاظ ملے جلے ہیں۔ غزلوں میں نشتر گر بگی و ناہمواری۔ میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ ان کے معمولی نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں یہی حالت ورڈسورتھ شاعر کی ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا کلام موقع۔ بموقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پرگو کون ہوگا پس ان کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے۔ جب طبیعت ملہم ہوتی تھی اسی وجہ سے ان کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے

متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا کیونکہ اس سے زمانہ کے حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور میر حسن کا تذکرہ "شعرائے اُردو" اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان میں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعرا اردو کے مورخ کے لئے بہت مفید چیز ہے اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ھ ہجری

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الصدق تھے ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم دیوان "نالہ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلہ نسب خواجہ بہاءالدین نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے نانا میر سید حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جن کی تعریف میں سودا نے قصیدہ[2] لکھا ہے اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر ان کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر حبیب

---

[1] یہ شعراء مندرجہ ذیل سنین میں لکھنؤ پہنچے۔

میر ۱۱۹۶ھ/۸۲-۱۷۸۱ء سودا ۱۱۸۸ھ/۷۵-۱۷۷۴ء میر حسن ۱۱۷۸ھ/۶۵-۱۷۶۴ء سوز ۱۱۹۰ھ کے قریب

[2] دیکھو نوٹ صفحہ ۴۵ (مرتب)

جوان ہوئے تو شاہی منصب دار مقرر ہوئے مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کرکے گوشہ نشین
اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں
داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات
نہایت پر اثر طریقہ سے بیان کئے ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے۔ انہوں نے اپنے والد
ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ
رکھتے تھے جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ بعض اپنے
تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سپاہی پیشہ تھے مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اٹھائیس برس کی عمر میں
دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے اور جب باپ نے سفر آخرت اختیار کیا تو انتالیس برس کے سن میں ان کے
سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے۔ خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد جہانگیری سے ان
کا انتساب اور سلسلۂ نقشبندیہ میں ان کا شیخ وقت ہونا، یہ سب باتیں ان کو مرجع خاص و عام بنائے ہوئے
تھیں پھر ان کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان و تصوف سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ ان کے
دل سے گرویدہ ہو گئے۔ غریب سے لے کر امیر اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک ان کی بے انتہا عظمت کرتے
اور ان کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے۔ معاصر تذکرہ نویس ان کے اس خاص امتیاز اور ان کی بزرگی اور
خدا ترسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ مجسم تہذیب و متانت اور پیکر
آداب و اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے۔ قناعت و توکل اور رضا و تسلیم ان میں کوٹ کوٹ
کر بھرے ہوئے تھے جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور اس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع
ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی
سے نکل کر لکھنؤ پہونچے مگر اس مرد راہ خدا کو جنبش نہ ہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کئے اپنے بزرگوں کے سجادہ پہ
بیٹھا رہا اور اس کی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ طبیعت میں آزادی، خودداری
اور استغنا اس درجہ تھا کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خوددار طبیعت بھلا
خوشامد اور چاپلوسی کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ دنیاداروں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا ان کو بیحد شاق
تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کی بزم سماع
میں چلے آئے جس کی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے۔ اتفاق سے پاؤں پھیلا دیئے خواجہ صاحب کو نہایت
ناگوار گزرا۔ بادشاہ ان کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے فوراً عرض کیا، مجبور ہوں۔ پاؤں میں درد ہے حضرت
نے فرمایا تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی۔ حضرت کو موسیقی سے بڑا ذوق تھا خود اس فن میں صاحب کمال
تھے بڑے بڑے کلاونت اور گویے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ
کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے اور

اپنا کمال دکھلاتے۔ میاں فیروز جو اس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے
حضرت کو محظوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے
اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے دولت کدہ پر اکثر منعقد ہوتے جن کی شرکت کو بڑے
بڑے رئیس و امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف | خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں ان
کی تصنیفات سے ہیں۔

(۱) رسالہ اسرار الصلوٰۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔ (۲) واردات
درد انتیس برس کی عمر میں لکھی اور اس کی شرح ہیں۔ (۳) علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جس
میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ (۴) نالۂ درد۔ (۵) آہ سرد (۶) درد دل۔
(۷) شمع محفل (۸) واقعات درد وغیرہ۔ (۹) حرمت غنا۔ (۱۰) دیوان فارسی
(۱۱) دیوان اردو۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ اسم با مسمّیٰ ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا بیان ہے۔ رسالۂ
واردات انتیس برس کی عمر میں سنہ ۱۱۷۲ھ میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مسائل تصوف نظم و نثر بیان کئے گئے
ہیں۔ علم الکتاب اسی رسالۂ واردات کی شرح ہے جس کو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثر کی فرمائش سے
تصنیف کیا۔ اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی، احادیث نبوی اور اقوال
سلف سے ثابت کیا ہے۔ اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا اس میں بیان ہے۔ نالۂ درد سنہ ۱۱۹۰ھ میں اور
آہ سرد سنہ ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئیں۔ یہ رسالے بھی روحانیت اور مسائل تصوف پر ہیں۔ شمع محفل اور
صحیفۂ واردات یہ دونوں کبر سنی کی تصنیفات ہیں جب کہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی۔ حرمت غنا اور واقعات
درد میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے۔ اول الذکر میں غنا کی حلت و حرمت سے بحث کی ہے۔ دیوان
فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں۔
آخری چیز دیوان اردو ہے جس کو اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیے۔ دیوان اردو
کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورہ بالا فارسی میں ہیں۔ دیوان کا ایک نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے
چھاپا ہے۔ جس پر محترم نواب حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا
ہے خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے۔ عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ
میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا
عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کئے کہ دل وجد کرتا ہے
غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزہ دیتی ہیں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے

کے اعتبار سے ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بقول مصنف "آب حیات" تلواروں کی آب داری نشتروں میں بھری ہے یا بقول امیر مینائی مرحوم کی پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا کہیں کہیں پرانے پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر اس خوبصورتی سے کہ ان سے شعری خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو بوالہوسی سے تعبیر کرتے تھے ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ مثل خواجہ حافظ اور سلف کے ان کا معشوق بھی بازاری یا ہرجائی نہیں بلکہ اس سے مراد معشوق یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے وہ لوگ کسب مال و جاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ بقول مصنف "آب حیات" چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں باقی رکن۔ میر۔ سودا۔ اور مظہر ہیں۔ حقیقت میں انہیں عناصر اربعہ کی ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہو گئی اور منجھی اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہنچ گئی۔ خواجہ صاحب کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اس میں چار چاند لگا دیئے خواجہ صاحب کا یہ اثر ان کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پہ بہت تھا ان کے معاصر شعرا ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوشخوان چمن این فن زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شاہد مدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوشنما . . . . . خلیق۔ متواضع آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید اما بیشتر ریاعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست غرض از آشنائی مطلب اوست۔ متوطن شاہجہاں آباد بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرۂ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص است اگرچہ حسن سلوک عام سر حسن سلوکہ پائے خود گرفتہ۔ اعتراز را از گوشہ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتدائے عالم است۔ ایامی کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبان مبارکش میفرمود کہ میر تقی میر مجلس خواہی شد۔ . . . . مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است۔ مد اللہ بذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں مجلس بخانہ اش مقرر بود از گردش روزگار بیمدار بہم خورد از بسکہ باین احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ این مجمع را شما اگر بخانہ خود معین بکنید بہتر ست۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد۔ خدایش ابدالاباد سلامت دارد" میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے کہ ان کے شاگرد تھے۔ چنانچہ فرہنگ

مستشرق اور زبان اُردو کے دلدادہ گارسن ڈتیاسی کو بھی یہی دھوکا ہوا کہ وہ میر کو، درد کا شاگرد بتاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب ان کے تقدس اور کمال عرفان اور نیز ان کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا بھی ہے۔ وہ بھی ان کی بزرگی کے قائل اور ان کے کلام کے معترف اور دلدادہ تھے۔ کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے" ہماری رائے میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میر حسن خواجہ صاحب کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق۔ اور اثر مشہور ہیں۔ علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ ولادت اور عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۲ھ اور مصحفی ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو ۹۴-۱۷۹۳ء کے مطابق ہے یہی وہ سن ہے جس میں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن دتیاسی اور لائل صاحب مصحفی کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھیاسٹھ ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب۔ جس سے سن وفات ۱۱۹۹ھ اور عمر اسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف کے طور پر مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عمر چھیاسٹھ برس کی ہوگی۔ سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھیاسٹھ سال اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔

درد کی شخصیت اُردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین پر اور نیز بعد کی نسلوں پر ان کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا۔ تصوف کے رنگ میں وہ بے نظیر اور بے مثال ہیں۔

میر سوز
۱۱۳۳ھ تا ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے۔ آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے مگر خود میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق۔ شہزور اور ورزش کے بڑے شائق تھے۔ فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ۔ نستعلیق۔ شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع اور عاشق مزاج تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پہ تباہی آئی اور لوگ بے حال تھے تو یہ دولت فقر سے مالا مال صوفی باکمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہوکر نکل کھڑے ہوئے[1] پہلے فرخ آباد گئے۔ جہاں نواب مہربان خاں رند دیوان نواب احمد خاں غالب

---

[1] سوز عہد شاہ عالم ثانی میں نہیں بلکہ اس سے قبل دلی سے نکلے۔ انداز اً ۱۱۶۷ھ/ ۵۳-۱۷۵۲ء کے بعد دلی سے نکل کر فرخ آباد پہنچے۔ سوز بقول سکسینہ "یہاں چند" رہے۔ یہ غلط ہے جوہ کئی برس مقیم رہے ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء
(باقی بصفحہ آئندہ)

جنگ کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے مگر ان کا جی نہ لگا چند دن ٹھہر کر مرشدآباد کا رُخ کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ کا دور دورہ تھا۔ وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخر کار اسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ انکے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد استاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۲ھ میں بعمر ۸۰ سال رحلت کی مگر لطف سنہ وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں اور مصحفی بوقت وفات ستر برس کا سن لکھتے ہیں نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسّی سال اور مقام وفات لکھنؤ بتاتے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۱۳ھ وفات اور عمر ۸۰ سال لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زبان خلیق۔ ملنسار اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرزِ کلام کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی، رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ و بے تکلف ہے۔ زبان میٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان، صفائی محاورہ اور بے ساختہ پن میں ان کا کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ تکلف و آورد فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبیعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ ان کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے ان کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں۔ سیدھے سادے ہندی لفظ بے ساختگی سے باندھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔ شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت ان سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرز ریختی کے نام سے بعد کو سعادت یار خاں رنگین نے ایجاد کیا۔ اس کی ابتدا سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا سب سے علیحدہ تھا۔ ترنم اور خاص درد اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہار مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے۔ آبحیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے		سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو !		ارے رے رے رے اے رے رے رے

دھلی سے آگئے ہیں ان کے مربی کو نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۱۸۹ سے قبل مجبوراً سوز فیض آباد منتقل ہو چکے تھے۔ آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو مرکز بنایا تو یہاں آ گئے ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۹ء (باقی صفحہ آئندہ)

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در عہد خود از جملہ او ادار ان ممتاز طرز ادائیہ ملک اوست و خواندن اشعارش از زبان او بیکو از خواندش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے [۱]

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو!

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے ان سے کچھ ناراض ہیں فرماتے ہیں۔ "ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خورش است۔"

سوز کا مرتبہ شاعری میں

سوز کا مرتبہ اردو شاعری میں اُردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جا سکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے استاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے۔ کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہے۔

سودا
۱۱۲۵ھ تا ۱۱۹۵ھ
۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اُردو کے خاقانی و انوری سپہر شاعری کے درخشندہ تارے بلکہ آفتاب اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن میر کے ریختہ گویوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔ مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سر آمد شعرائے ہندوستان مرزا رفیع سودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد تذکرہ آبحیات میں تاریخ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں [۲] مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے کہ نہ تو

میں مرشد آباد کا رخ کیا۔ حالات ناموافق پاکر اسی برس واپس لوٹے۔ ۱۲۱۳ھ/۹۸-۱۷۹۷ء کو انتقال کیا۔ (مرتب)

[۱] سوز نے میر تخلص ۱۱۶۰ھ کے قریب ترک کیا جیسا کہ قائم نے مخزن نکات میں لکھا ہے (مرتب)

"درمبادی حال میر تخلص می نمود چوں اورا با میر تقی، معارضہ افتاد از آں باز سوز تخلص کرد" (مخزن نکات ص ۳۱)

[۲] سودا کے سال پیدائش میں اختلاف ہے۔ اُردو کے محققین مندرجہ ذیل سنین بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی ۱۱۱۸ھ یا ۱۱۲۳ھ (اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۲ء ص ۴۵)

قاضی عبد الودود ۱۱۱۹ھ کے قریب۔ ڈاکٹر وحید قریشی ۱۱۱۹ھ کی تائید کرتے ہیں۔ کلب علی خاں فائق ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۲۰ھ کے مابین لکھتے ہیں۔ شیخ چاند ۱۱۱۰ھ سے قبل اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (باقی بصفحہ آئندہ)

معاصرین نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے۔ تخلص کے انتخاب کی وجہ سے بھی آبحیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا اس واسطے رکھا رکھا گیا ہے سودا یا جنون تقاضائے عشق ہے جس پہ پریشانی شاعری کا دارومدار ہے اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا کہ اس کے جزو اول میں لفظ سودا داخل ہے" اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھلتے ہیں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد[1] کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اس سے مرزا کی استادی پر فخر و مباہات ثابت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں

مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرف تلمذ نہ تھا مگر ان کی صحبت سے بہت فیض یاب ہوئے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ انہیں کی ہدایت کے موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا مگر فارسی کا شوق ان میں اس قدر سرایت کئے ہوئے تھا کہ اس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے چنانچہ ان کا مکمل دیوان، فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچہ و بازار تک میں پھیل۔ مرزا کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا اور وہ مسلم الثبوت شاعر اسی وقت مانے جاتے تھے ان کی استادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی ان کی شاگردی کرنے کا شوق ہوا وہ اُردو اور فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو ان سے کسی خاص بات پر رنجش ہو گئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا[2] مگر دہلی میں بہت سے ایسے قدردان رئیس و امیر موجود تھے جنہوں نے استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے قدرشناسوں کی دریا دلی اور قدردانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر

سنہ ۱۱۱۰ھ سے قبل بتاتے ہیں۔ ہماری رائے میں ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء درست ہے۔ (مرتب)

(ان سنین پر بحث کے لئے دیکھئے میر حسن اور ان کا زمانہ ص ۱۴۳)

[1] وداد، فارسی شاعر تھے۔ مظہر علی خاں ولا کے والد تھے۔ ولا نے جہانگیر شاہی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وداد جنگ باشی کے عہدے پر فائز تھے۔ (مرتب)

[2] یہ غلط روایت آزاد کی پھیلائی ہوئی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سودا اور شاہ عالم ثانی کی ملاقات کا امکان ۱۱۷۰ تا ۱۱۹۵ھ وفات سودا تک نظر ہی نہیں آتا۔ سودا سنہ ۱۱۷۰ھ میں نواب عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد گئے۔ یہاں نواب بنگش کی سرکار سے ۱۱۸۳ تک وابستہ رہے پھر فیض آباد آ گئے۔ ۱۱۸۸ھ میں آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۱۹۵ھ تک یہیں رہے۔ شاہ عالم ثانی سنہ ۱۱۷۳ھ میں دلی سے نکلے۔ ۱۱۷۳ھ میں بہار میں تخت نشین ہوئے، ۱۱۸۵ھ تک دلی سے باہر رہتے ہیں اس

(باقی بصفحہ آئندہ)

دیا تھا کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سن کر ان کو نہایت شفقت و محبت سے بلانے کا خط لکھا اور زادِ راہ بھی بھیجا تو مرزا نے ٹال دیا اور کمال استغنا سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک	آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے	بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا۔ دلّی کی حالت بدل۔ وہ پرانا وقت نہ رہا۔ پرانے قدر دان یکے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پرانے شرفا کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشان ہو گئے اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرہ میں تھی اور وہ قدر دان اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اسی وجہ سے شعرائے باکمال نے دِلّی کو خیرباد کہا۔ مرزا بھی اسی نازک میں اس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی فرخ آباد پہنچے نواب احمد خاں غالب جنگ بر سرِ حکومت تھے۔ مہربان خاں رِندؔ ان کے دیوان تھے جو اہل علم و کمال کے قدر دان اور خود بھی شاعر تھے اور بقول میر حسن میر سوز و میرزا سودا سے تلمذ تھا۔ چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ انھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۱۱۸۵ھ[1] میں نواب احمد خاں مر گئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے[2] اور نواب شجاع الدولہ کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ[3] کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے ایک فارسی شاعر فاخر مکیں سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اس کا تصفیہ نواب سعادت علی خاں نے جو اس وقت ولی عہد سلطنت تھے۔ نواب کے روبرو مرزا کی موافقت میں کرا دیا۔ سابق کی تنخواہ بحال رہی بخطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور آثار انبساط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پُرلطف صحبت اور ان کی بذلہ سنجیوں کو جملہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ مصحفی۔ منت۔ ناسخ۔ نساخ کی تاریخیں مشہور[4] ہیں۔

سلہ۔ میرؔ دلی آئے تو سودا فیض آباد میں تھے لہٰذا ان کی ملاقات کا تاریخی طور پر کوئی ثبوت نہیں۔ (مرتب)

[1] م ۱۱۸۶ھ

[2] ایک تاریخ یہ ہے ؎

تصانیف | مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جس میں ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے ، رباعیات، قطعے، تاریخیں، مخمس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد، تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس مثنویاںلہ یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں ان کی دلچسپ اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین برکلام میر۔ اور دُو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثر میں (ان کے کلیات میں نہیں ہیں)

(۶) قصائد امرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

(۸) قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔

(۹) ایک رسالہ نثر میں موسوم بعبرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکین اعتراضوں کا جواب ہے جو انھوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کئے تھے۔

(۱۰) میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کا ترجمہ نثر میں (ان کے کلیات میں نہیں ہے)۔

(۱۱) ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا۔ جواب نہیں ملتا۔

سودا کا مرتبہ شاعری میں | سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے استاد مانے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اُردو کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل سمجھے اور ان کے بعد ان کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ ان کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں ان کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے

ان کی خدمات زبان کے ساتھ | مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دُور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

لہ سودا کے کلیات میں جو یہ چوبیس مثنویاں ڈالی گئی ہیں ان میں سے صرف ۲۰ مثنویاں ان کی ہیں۔ تین قائم اور ایک فتح علی شیدا کی ہے۔ قائم کی تین مثنویاں یہ ہیں۔

۱۔ مثنوی در شدت سرما ۔ ۲۔ ہجو طفل پتنگ باز ۔ ۳۔ مرد درویش ۔

۴۔ فتح علی شیدا ۔ بوم و بقال ۔

(سودا از شیخ چاند اور مقدمہ کلیات قائم از اقتدا حسن) (مرتب)

لکے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی بسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر		سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے
	ولہ	
سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال		پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے یہ سنگ ریزہ بھی ہے دُرِ عدن مجھ سے

شاعری کی صناعیوں سے اس میں طرح طرح کے لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرز تخیل اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کئے کہ اس کے جزو ہوگئے اور اس کی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہوگئی کہ ہر ادبی کام اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کئے جن میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ان خدایانِ سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ کے بجائے اجنبی الفاظ کے کثرت سے داخل ہوئے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں ان پر طغرائے قبول نور ثبت ہوگیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابل داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے۔ مثلاً الفاظ بھجبل۔ پربت۔ رائی۔ وغیرہ اور ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری۔ کنھیا کا عشق وغیرہ جو ان کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں[1] یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم اس زمانہ میں مادر وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعرائے اردو کے دل میں بہت کچھ تھا جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو۔ مرزا کو اکثر ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے اور اس کوشش میں ان کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اٹھانا پڑیں۔ مرزا کے عہد میں ایہام گوئی اور دو ہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہوگیا تھا۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں ؎

یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

[1] محبت کے کرموں بھجبل کی میں تعریف کیا یارو / نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اسکو نہ دیکھا ہو / ترکش البند سینۂ عالم کا چھان مارا

ستم پربت ہو تو اس کو اٹھا لیتا ہے جوں رائی / کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہرجائی / مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

اوران کے ہمعصر میر کہتے ہیں :-

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں،

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی وقت رفع نہیں ہوئی تھی - اور آخری منازل ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے - مرزا کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے جانچنا بہت ضروری بات ہے جو خدمات زبان کے ساتھ انہوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر انہیں حاصل تھی اس کا اعتراف ان کے معاصرین مثلاً میر، و میر حسن، مصحفی وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت و؟ ال کی دل سے داد دی ہے۔

ان کی خدمات شاعری کے ساتھ | جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں، انہیں پر سودا نے اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجد بھی تھے یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور نامکمل حالت میں موجود تھیں مگر انہوں نے یہ کمال کیا کہ ان کو اُردو میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور ایسا کر دیا کہ ان کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لئے محال ہو گیا۔ ہر چند کہ اکثر شعرا نے ان کی پیروی کی اور ان کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں منفرد ہی رہے۔

قصیدہ و مرثیہ | ان کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکۃ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکت خیال اور طرفگیٔ مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ یہی حالت ان کے مراثی کی بھی سمجھنی چاہیئے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اردو میں بہت گزرے ہیں مگر ان کے کلام میں سوا نے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدت اسلوب، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانہ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھلی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد ہیں جنھوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کیا بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

ہجو | مرزا صاحب نے ہجووں کے دفتر کے دفتر لکھ کر رکھ دیئے ہیں۔ ان لوگوں پر تو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آرے چلے ہوں گے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابد الآباد تک سرسبز و شاداب رہے گا۔ ان کے اہاجی میں وہ گرمیٔ کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس صنف سے ان کو خلقی مناسبت بلکہ فطرتی خصوصیت تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

کی ہجو ہر ایک شخص کی ہر چند کہ اُس نے	پر اس سے طرف اس کے نہ عائد ہوئی تقصیر

ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مغل تھا | اور جتنے بزرگ اس کے تھے مغلوب تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی ان کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں اکھاتی تھی اس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف ان کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا جہاں کسی سے اَن بَن ہوئی فوراً ان کا غلام "غنچہ"، قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لئے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ گل بوٹے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سن کر اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے اس متبذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ "جس طرح روم الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جوونیال ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہئے کہ سودا کی اُن پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں انہوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعۂ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پر آشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان نہایت پُر زور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے یا مثلاً وہ وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بد امنی اور کوتوال شہر کی کم زوری کس پُر مذاق اور موثر طریقہ سے بیان کی ہے" یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجویں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے یہاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بن گئی۔ میر حسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین بقا، اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آ گئے اور ان بیچاروں نے حرکت مذبوحی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر ان کا کہا کسی نے نہ سنا۔ مرزا کا کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کثرت اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اس میں ان کو بڑا مزہ آتا تھا۔ ان کی ہجویں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے ان کی قوت بیان، قدرت زبان اور معاملات دنیاوی میں ان کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اس چیز کی جزئیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درد و اثر اور تمسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں اور سننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے جس چیز کا خاکہ اڑاتے ہیں اس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور پھڑکا دینے والے ہوتے۔ مرزا میں جوونیال[۱]

[۱] "جیولیس جوونیالس" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا۔ سنہ پیدائش تقریباً ، عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشا میں کمال رکھتا تھا۔ اس کی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں (باقی بصفحہ آئندہ)

والٹیر[1] اور سویفٹ[2] تینوں کا مزا ہے۔ ایڈیسن[3] کی متانت ان میں مطلق نہیں۔ ان میں ہجو میں پھکڑ پن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے ان کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی تہ میں ایسی کاٹ اور برش ہے جو دل کے اندر اتر جاتی ہے آزاد نے سچ کہا ہے کہ "جس کے پیچھے پڑتے تھے اس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا"۔

کلام پر رائے مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکومت حاصل تھی۔ مشکل سے مشکل زمینیں ان کے سامنے پانی اور ادق مضامین ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست، بندش چست، زوائد و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بھول جاؤ تو دوسرا لفظ اس کی جگہ پر نہیں رکھ سکتے اگر لفظ ادھر سے ادھر رکھ دو تو شعر کا لطف اور مزہ جاتا رہیگا

ہجو کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے زمانہ کی سوسائٹی کی بداخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زور دار زبان میں ہیں جس کے بعض ٹکڑے ضرب المثل ہوگئے۔

[1] پورا نام "فرانسوے ماری والیٹر"، فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے۔ ۱۶۹۴ء سن ولادت اور ۱۷۷۸ء سنہ وفات فن شعر اور تنقید میں یکتائے زمانہ تھا۔ مرزا غالب کی طرح اس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کے کلام میں ذہانت وطباعی اور انتہا درجہ کی طعن آمیز شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ مذہب کے ساتھ اس کی بے پروائی، شوخی اور طعن آمیز چٹکلے مشہور ہیں۔ اس کا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

[2] "جاناتھن سویفٹ" "والیٹر کا معاصر ہے۔ مشہور آئرش افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا۔ برخلاف والیٹر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا" بیٹل آف دی بُکس" (کتابوں کی جنگ) اور "گلیور کے سفر" اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ اس کی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئرلینڈ کے قصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "معقول تجویز" رکھا۔ جس میں تجویز تھا کہ آئرلینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر تجویز یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے ان کا گوشت بازار میں بیچا جائے یہ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے۔ عبارت نہایت صاف سادہ بلاکسی تصنع کے لکھتا تھا جس کی وجہ سے اس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں ۱۲

[3] جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مضمون نگار اور نثار گزرا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "سپکٹیٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی اور معاشرتی مضامین کا ہے جن کی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اس سے کسی کا دل نہیں دکھتا اس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سویفٹ کے جس کے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے۔ ۱۲

کلام ٹھوس اور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحریں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہے گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر سے چشمہ بہتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعراء پر مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعراء پر بہت کچھ اثر پڑا ان کے اشعار پڑھ کر بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادہ پیدا ہو گیا ہے اس خاص صفت کے اعتبار سے ان کو اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سپنسر[1] کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے۔ معاصرین سے قطع نظر غالبؔ اور ذوقؔ وغیرہ بھی سب ان کو مانتے تھے اور ان کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔ ناسخ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سوداؔ کا قائل ہے اور استاد ذوقؔ کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ علی الخصوص ان کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اس قدر مقبولیت اور دل چسپی ہے کہ خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اس کو پڑھتا ہے اور اس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعرائے اردو کے کلام میں کمیاب ہیں البتہ انگریزی میں شیلی[2] اور کیٹس[3] کے یہاں بہت کچھ ہیں۔ غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض ایسے زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہنچ جائے۔ سودا کی استادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری ان کے خمیر میں پڑے تھے۔ میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص ان کو پورا شاعر مانتا ہے ان کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر

---

[1] اڈمنڈ سپنسر سولھویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے اس کی کتاب فری کوئن (پری ملکہ) ایک مشہور نظم ہے اس نے قدیم لاطینی اور یونانی بحریں نظم انگریزی میں رواج دے کر انگریزی شاعری کا پایہ بلند کیا ۱۲۔

[2] سو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا۔ نہایت آشفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اس کی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اس کی تصانیف میں کوئین میب و ملکہ میب) (الاسٹر) کنج تنہائی اور ریولٹ آف اسلام مشہور ہیں اس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے۔ ۱۲۔

[3] شیلی کا معاصر تھا اور شیلی اس کے نوجوان مرا۔ اس کی کتاب "انڈائمین" نہایت دلچسپ ہے نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا وہ خود نہایت حسین اور حسن کا عاشق تھا ۱۲۔

دیا ہر ہے کہ ان کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آبداری اور انعکاس اور ان کا دماغ اعلیٰ تخیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو ان کے کلام کو جملہ شعرائے ماضی و حال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت۔ جس سے کلام کا زور، مضمون کی لطافت اور نزاکت سے مل کر عجیب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اس میں تلوار صفاہانی کی سی آب داری پیدا ہو جاتی ہے۔ نشستِ الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ ادھر ادھر ہو جائے تو شعر بے مزہ بلکہ مہمل ہو جائے گا صنعت کی خوبی سے صناع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے ان کا سامان زینتِ شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی جو بات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسر ہوتی تھی وہ ان کو ایک جنبش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز ان میں تصفیہ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیز وسیع کیا۔ ان سب میں مرزا کا نمبر اوّل ہے۔ بقول مصنف آبِ حیات جس طرح کیمیاداں دو مادوں سے تیسرا مادّہ تیار کرتے ہیں۔ انہوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں

اب بے موقع نہ ہوگا کہ مرزا صاحب کے متعلق ان کی اور نیز ان کے بعد کے شعرا اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ ان کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود انھیں کی زبان سے سنیئے "مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے است۔ خوش خلق و خوشخو، گرم جوش یار باش، شگفتہ رو .. .. .. غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو ست۔ ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ ہر مصرعۂ برجستہ اش راسر دآزار و بندہ۔ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدۂ در ہجو اسپ گفتہ موسوم بہ تضحیک روزگار دور از مقدور و رو صنعتہا بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگار ست حق تعالیٰ سلامتش دارد"

اس طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ "سودا کا مرتبہ قصائد میں

ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے ۔ اور کوئی فرق نہیں ہے" اس تنقید پر مصنف آب حیات کی رائے ہے کہ "مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں۔ دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو اور نیز محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔" اسی طرح صاحب طبقات الشعراء مرزا کے قصائد کو عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور ان کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ بذلہ گو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے تھے کہ "مرزا سودا کے مقابلہ میں اب تک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیر ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں۔" حکیم قدرت اللہ خاں بقا[1] اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "مرزا محمد رفیع سر آمد شعرائے فصاحت ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہنچے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے۔" تذکرۂ گلشن بیخار میں ہے کہ فقیر کی دانست میں ان کی غزلیں ان کے قصیدوں سے، اور ان کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد ان سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ ان کے دیوان کو بکھ کر پڑھنے والوں پر اس رائے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی۔" پروفیسر شہباز شمس العلما نواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ اردو کے شیکسپیئر تھے۔ اسی طرح سر الفرڈ لائل سودا کو اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

کلام میں کمی مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) ان کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا ان کے اکثر ہمعصروں میں بہت زور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی حد تک محدود ہے (۲) دوسرے لطف غزل ان میں کم ہے یعنی ان کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور مستی اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن۔ میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے۔ جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس ہوئے جو فلک شاعری پر آفتاب بن کر چمکے۔ ان کے اجداد ہرات کے مشہور خانوادۂ سادات سے تھے۔ جد اعلیٰ میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

---

[1] حکیم قدرت اللہ خاں قاسم

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جیّد فاضل اور مشہور خوشنویس تھے اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے۔ جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پرانی دلّی کے محلہ سید واڑہ میں سنہ ۱۱۴۰ھ میں[۱] ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی انہیں کو دکھایا۔ اس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے[۲]۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصل حال اپنی مثنوی گلزار ارم میں قلمبند کیا ہے[۳]۔

فیض آباد میں پہنچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے۔ جب نواب آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے بیس ماہ محرم سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا[۴]۔ بوقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ سنہ ۱۲۰۱ھ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی میر حسن عربی کم جانتے تھے مگر فارسی میں کمال حاصل تھا اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے چنانچہ ان کا "تذکرہ شعرائے اردو" جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں جوان اہلے است نوکہ بیشتر اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد وضع مرد آدمیانہ می دارد۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند۔ میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں "اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شان از من کما حقہٗ سر انجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودہ ام"، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے اور تینوں اصحاب مذکورہ بالا کی پیروی کرتے تھے اور ممکن ہے مشورہ سخن بھی کرتے ہوں۔

---

[۱] میر حسن کے سال ولادت میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی پیدائش کے سلسلے میں تمام مصادر پر تحقیق کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ میر حسن ۱۱۵۳ھ (میر حسن اور ان کا زمانہ صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۲۰۴) (مرتب)

[۲] میر حسن فیض آباد میں ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین پہنچے (میر حسن اور انکا زمانہ صفحہ ۳۶) (مرتب)

[۳] گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے اس مثنوی کا ایک نہایت اور خوشخط نسخہ کتب خانہ ندوہ میں موجود ہے (تذکرۂ گل رعنا) (مرتب)

[۴] عقب باغ نواب قاسم علی خاں محلہ مفتی گنج (لکھنؤ) میں مدفون ہوئے (تذکرۂ خمخانۂ جاوید جلد ۲)

فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف ان کے خلاف لکھا ہے۔

طرز کلام کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غزل، رباعی مثنوی، مرثیہ، سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوروار نہ تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی "سحر البیان" معروف بہ "مثنوی میر حسن" اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں۔ وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر محسن محسنؔ۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کہتے تھے خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔ حسنؔ کے چوتھے بیٹے احسان حسن مخلوق بھی شاعر تھے۔ (ریاض الفصحا ص۲۰۳ مرتب)

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل جملہ اقسام سخن، ترکیب بند، مخمس، واسوخت، مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے۔

(۲)[1] گیارہ مثنویاں جن میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں۔

(۳) مثنوی سحر البیان یا قصۂ بےنظیر و بدر منیر۔ لاجواب اور بے عدیل و بےنظیر مثنوی ہے ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نامی پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادۂ بےنظیر اور شاہزادی بدر منیر کے عشق کا افسانہ ہے۔ جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس، زیور، شادی بیاہ کے رسوم، برات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں۔ عبارت اس قدر صاف اور بامحاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اس کا ہر مصرع لاجواب اور ہر شعر انتخاب ہے۔ صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون قابل دید ہے۔ سوال جواب کی نوک جھونک پر لطف مذاق کی باتیں۔ ایسی ہیں جن کو پڑھ کے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں "کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو اب ہم تم بول رہے ہیں"

---

[1] مثنویات حسن کا ایک ایڈیشن ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا ہے جو ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں سحر البیان شامل نہیں۔ یہ مثنوی ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں لاہور اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ (مرتب)

قصہ پُرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص مسمّٰی میر بہادر علی نے ۱۲۱۷ھ میں کیا تھا جس کا نام نثر بینظیر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصہ بآسانی سمجھ میں آجائے۔

اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر ایک اولاد کا تھا الم
وزیروں کو اِک روز اس نے بلا — جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال — فقیری کا ہے میرے دل کو خیال
وزیروں نے کی عرض کا ے آفتاب — نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب
یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت — فقیری میں ضائع کرو اس کو مت
اگر ہاں ہو اولاد کا ہے یہ غم : — سو اس کا تردّد بھی کرتے ہیں ہم
بلاتے ہیں ہم اہل تنجیم کو — نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
بُلا کر انہیں شہ کنے لے گئے — جونہی رو برو سب وہ شہ کے گئے
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دَیا — چندرماں سا بالک ترے ہوئے گا
یہ لڑکا تو ہو گا و لے کیا کہیں — خطر ہے اسے بارھویں سال ہیں
نہ آئے یہ خورشید بالائے بام — بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ — رہے برج میں یہ مہ چار دہ
گئے نو مہینے جب اس پر گزر — ہوا گھر میں شہ کے تولّد پسر
ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر — رکھا نام اس کا شہ بے نظیر
پڑی جب گرہ بارھویں سال کی — کھُلی گُتھڑی غم کے جنجال کی
کہا شاہ نے بُلوا نقیبوں کو شام — کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو
نہا دھو کے نکلا وہ گل اسطرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح
غرض ہو کے اس طرح آراستہ — خراماں ہوا سروِ نو خاستہ

گھڑی چار تک خوب سی سیر کر — رعیت کو دکھلا کر اپنا پسر

اسی کثرتِ فوج سے ہو سوار — پھرا شہر کی طرف وہ شہریار

قضارا وہ شب تھی شبِ چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ

پھر آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی — کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا

کہا شہ نے اب تو گئے دن نکل — اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل

قضارا وہ دن تھا اسی سال کا — غلط وہم ماضی میں تھا حال کا

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا

قضارا ہوا اِک پری کا گزر — پڑی شاہزادے پہ اس کی نظر

ہوئی لاکھ جی سے وہ اس پر نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اتار

محبت کی آئی جو دل میں ہوا — وہاں سے اسے لے اُڑی دل ربا

قضارا کھلی آنکھ اس گل کی جو — نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا — تعجب سے اِک اِک کو تکتا رہا

اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں — لگا کہنے یا رب میں آیا کہاں

سرہانے جو دیکھی مہِ چار دہ — کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشکِ مہ

کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر — لے آیا مجھے کون گھر سے اِدھر

پھرا منھ کو لے اور ادھر سے نقاب — دیا اس پری نے یہ ہنس کر جواب

خدا جانے تو کون ہیں ہوں کہاں — مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں

یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں — پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

پھرا کر ترا تجھ سے شہر و دیار — یہ بندی ہی لائی ہے تقصیروار

پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے — یہاں سب یہ قومِ بنی جان ہے

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں — کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو یاں

ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس — رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس

وہ تھی نازنیں بھی بہت عقل مند — نہ کھلنے سے کچھ اس کے ہوتی تھی بند

غرض ماہ رُخ اس پری کا تھا نام — پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام

کہا ایک دن اس نے اے بے نظیر — مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر

تو رُک رُک کے کر اپنے جی کو نہ بند
یہ گھوڑا تو کل دوں گی کل کا تجھے
کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہ گار کا
کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول
یہ گھوڑا جو اس گل کے تھا بخش کا
سرِ شام وہ بے نظیرِ جہاں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ
پہر جبکہ بجتا تو پھرتا شتاب
سفر ایک دن کی یہ تم واردات
ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو
یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے واں
ملی جنس کی اپنے جو اس کو جُز
عجب صورتیں اور خلد فرمحل
تھی اس کے عالم پہ جس دم نگاہ
برس پندرہ ایک کا سن و سال
دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے
خواصیں کھڑی ادھر ادھر تمام

نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے
دیا دل کسی سے لگائے کہیں،
وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول
فلک سیر تھا نام اس رخش کا
اسی رخش پہ ہو کے جلوہ کناں
وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ،
کہ پھر قہر تھا ماہرخ کا عتاب
اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
سہانا سا اک باغ آیا نظر
کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اتر
ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
نظر سے بچائے ہوئے چاندنی وہ
چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سُو
چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل
اور آئی نظر اسمیں اک رشکِ مہ
نہایت حسیں اور صاحب جمال
سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے
ستاروں کا جوں ماہ پہ ازدحام

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے کمال
کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال

درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں
کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں

جو دیکھے تو ہے اک جوانِ حسیں
درختوں کی ہے اوٹ میں مہ جبیں

کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن
کسی نے کہا ہے قیامت کا دن

یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں
اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں

گئے بات پر شاہزادی کے گوش
یہ سنتے ہی جاتا رہا اس کا ہوش

کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اٹھی
گیا سننا جی تو رہ کر اٹھی،

خواصوں کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ
عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ

جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسیں
کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

دلے عشق کی تیغ کھائے ہوئے
کرٹا دل کسی پر لگائے ہوئے

گئی اس جگہ جب کہ بدرِ منیر
اور اس نے جو دیکھا شہِ بے نظیر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل
نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

غرض بے نظیر اور بدرِ منیر
گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر

تھی ہمراہ اک اس کی دختِ وزیر
نہایت حسیں اور قیامت شریر

شتابی سے لا اس نے چھڑکا گلاب
تب آئی تنوں میں ذرا ان کے تاب

وہ اٹھنے تو اٹھی پہ حیران سی
گلِ شبنم آلودہ گریاں سی،

چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر
وہی نیم بیمل اسے چھوڑ کر

غضب منہ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں
میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں
چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دختِ وزیر
لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر

مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے
مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے

ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب
یہ ہے واردات غریب و عجیب

شتابی سے مجلس کو تیار کر
تو اس گل سے گھر رشکِ گلزار کر

بلا لائی جا اس جواں کے تئیں
کیا میزباں میہماں کے تئیں

بلا اک مکاں میں بٹھایا اسے
کھلا بند جس دم درِ گفتگو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے
رہی دل ہی دل میں غرضِ دل کی بات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا
بندھا پھر تو معمول اس کا مدام
پہر رات تک، ہنسنا اور بولنا
کبھی ہجر سے ان کو ہونا ملول
کسی دیو نے دی پری کو خبر
یہ سن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیماںؑ کی
کہا دیو سے تو مجھے دے پتا
کوئی نازنیں سی تھی اک اسکے ساتھ
قضارا اڑا میں جو ہو کر اُدھر
یہ اُڑتی سی سن کر خبر وہ پری
غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو ادھر
بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے پڑی
تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا
یہ کہہ اور بُلا اک پریزاد کو
اسے کھینچتا یاں سے لے جا شتاب
کنواں اس میں جو ہے مصیبت بھرا
اسے جا کے اس چاہ میں بند کر
سرِ شام کھانا کھلانا اُسے
نہ دیجو سوا اس کے گر کچھ کہے

محل کا سماں سب دکھایا اسے
جواں نے حقیقت کہی مو بمو
چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
پر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
کہا اب میں جاتا ہوں بدرِ منیر
تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا
کہ ہر روز آتا ادھر وقت شام
درِ عشق اور حسن کو کھولنا
کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
کہ معشوق عاشق ہوا اور پہ
لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
ہوئی دشمن اب اس کی میں جانکی
کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اسکے ہاتھ
یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
کہا دیکھنے پاؤں اس کو ذری
کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ قمر
کہا سن تو اے موذی و مدعی
کہ اس مال زادی کو جوڑا دیا
جھنکاتی ہوں کیسے کنوئیں رہ پھلا
کہا سننا نہ اس کی فریاد کو
وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب
کئی من کا پتھر ہے واں پہ دھرا
وہی سنگ پھر اس کے منھ پر تو دھر
اور اک جام پانی پلانا اسے
یہی اس کا معمول دائم رہے

کیا بند پھر جا کے اس چاہ میں
کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں

پھنسا اس طرح سے جو وہ بینظیر
پڑی بیقراری میں وہ بدرِ منیر

کئی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ
نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ

لگی کہنے نجم النسا سے بُوا
خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

کہا اس نے بی تم کو سودا ہے کچھ
وہ معشوق ہے اس کو پروا ہے کچھ

خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
مری چڑھ ہے اتنا بھی ہونا خدا

لگی کہنے تب اس کو بدرِ منیر
کہ سنتی ہے اے میری دختِ وزیر

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر
پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر

نہ باندھا ہو اس کو کسی شید میں
کیا ہو نہ اس کے تئیں قید میں

گئی منڈکڑی مار آخر کو لیٹ
چھپر کھٹ کے کونے میں منھ کو لپیٹ

ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں
تو دیکھا بہت اس کو جنجال میں

قضا نے دکھایا عجب اس کو خواب
کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب

جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق
کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق

نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے
فقط ایک کفِ دست میدان ہے

مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں
کہ اٹھتا ہے آہوں کا واں سے دھواں

کنوئیں کا ہے منہ بند اس سے اڑی
کئی لاکھ من کی سِل اس پہ پڑی

صدا واں سے آتی ہے بدرِ منیر
ترے چاہِ غم میں ہوا ہوں اسیر

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں
کروں کیا کہ ہے مجھ کو قیدِ گراں

یکایک گئی آنکھ اتنے میں کھل
پڑے اشک رخسار پہ اس کے ڈھل

سنا جب کہ نجم النسا نے یہ حال
ہوئی بیقراری تب اس کو کمال

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا
ترے واسطے میں نے یہ دکھ سہا

بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں میں
اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں

کہا شاہزادی نے سن اے رفیق
ہوئی میں تو اس چاہِ غم میں غریق

بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو
کہ وہ ہے پری اور انسان تو

کہا اس نے کیا کیجیے اب بھلا
پڑی اب تو ہے اپنے سر پہ بلا

تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں

یہ کہہ اس نے رو رو اتارا سنگار
کیا اپنی پشواز کو تار تار

پھر آئے جو کچھ اس کے ہوش و حواس
چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
جدا ہو کے القصہ روتوں کو چھوڑ
نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
لئے بین پھرتی تھی صحرا نورد
قضارا سہانا سا اک دشت تھا
وہ تھی اتفاقاً شبِ چار دہ
بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین
کدارا بجانے لگی شوق میں
بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں
یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ
کہ تھا اک پریزاد فرخ سیر
ہوا پہ اڑائے ہوئے اپنا تخت
وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیرِ ماہ
بیکایک سنی بین کی جو صدا
جو دیکھے تو جوگن ہے اک رشک حور
نظر کرکے حسن اس کا غش کر گیا
یہ سمجھا بنا دے کا کچھ بھیس ہے
پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ
وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر
کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول پہ
گیا بیٹھ آ سامنے ریت میں
بجاتی رہی بین وہ صبح تک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اسنے بین
پریزاد نے تب پکڑا اس کا ہاتھ
زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں
نہ مانا اور اس نے اٹھایا اسے

سجا تن پہ جوگن کا اس نے لباس
دکھاتی ہوئی چھال ہر ہر کے تئیں
چلی اپنے گھر بار سے منھ کو موڑ
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
رتن چاک چاک اور رخ زرد زرد
کہ اک شب ہوا اسکا واں بسترا
ادا سے وہ بیٹھی تھی وہ رشک مہ
دو زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
لگی دست و پا مارنے ذوق میں
صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
تس اوپر مزا تم سنو اور یہ
جنوں کے وہ تھا بادشاہ کا پسر
کسی طرف جاتا تھا فیروز بخت
اسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
وہاں تخت لا اپنا اس نے رکھا
کہ چشم فلک نے نہ دیکھا یہ نور
تعشق کے عالم میں بس مر گیا
لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے
لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ
کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر
جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
ہوا کھیت یہ تو اسی کھیت میں
یہ رو دیا کیا سامنے بے دھڑک
اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
وہ کتنی کہا کی نہیں رہے نہیں
پرستان میں لا بٹھایا اسے

یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لے — کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے

یہ جوگن جو ہے ایک صاحب کمال — ذرا بین سنیے اور اس کے خیال

بہت آپ اس سے اٹھاویں گے حظ — بہت بین میں اُسکی پاویں گے حظ

کہا اس نے بابا بہت خوب ہے — ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے

کہا آؤ جوگی جی بیٹھو اِدھر — کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر

بہت اس کی تعظیم و تکریم کی — جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

غرض اس طرح اس کا معمول تھا — کہ اس شاہ پریوں کی خدمت میں جا

بجا بین سب کو رجھاتی تھی وہ — پہر کے بجے گھر کو آتی تھی وہ

وَلے کیا کہوں حال فیروز شاہ — کہ تھی دن بدن اس کی حالت تباہ

نہ دنیا کی اس کو نہ دیں کی خبر — اُسی کے تصوّر میں آٹھوں پہر

غرض ایک دن بات یہ جان کر — لگا گھات پر اپنی وہ آن کر

نہ تھا اس گھڑی کوئی ایدھر اودھر — اکیلی پڑی جوگن اس کو نظر

اکیلے اسے دیکھ ہو بے قرار — گرا پاؤں پہ اس کے بے اختیار

گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ — تو کہنے لگی مسکرا اس کو وہ

کہ ہے آج کیا یہ خلافِ قیاس — گرا اتنا کیوں ہوکے تو بے حواس

لگا کہنے رو رو کے فیروز شاہ — کہ بس بس یہی تو کہو گی نہ واہ

تمہاری سمجھ نے تو مارا ہمیں — یہ باتیں نہیں ہیں گوارا ہمیں

کہا اس نے کہہ تو شتاب اپنا حال — کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال

کہا تب پریزاد نے میری جاں — کہاں تک کروں راز اپنا نہاں

بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول — غلامی میں اپنی مجھے کر قبول

لگی کہنے ہنس کے کہ اک طور سے — جو میری کہانی سنے غور سے

مطالب میرے اگر بر لائیے تو — تو شاید مراد اپنی بھی پائیے تو

کہا اس نے پھر جلد فرمائیے — جو کچھ آپ سے ہو بجا لائیے

کہا اس نے یہ ہے مری داستاں — کہ شہر سراندیپ ہے اک مکاں

ملک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ — کہ بیٹی ہے اک اس کی مانندِ ماہ

جہاں میں ہے بدرِ منیر اس کا نام — میں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مدام

بنایا ہے اس نے الگ ایک باغ — کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ

جدا باپ سے تھی وہ اسجا مقیم
میں نجم النساء۔ اس کی دخت وزیر
ہوئی ایک دن یہ عجب واردات
کہاں تک کہوں اس کا قصہ ہے دور
گیا اس پہ اس شاہزادی کا دل
وہ لے اس پہ عاشق ہوئی تھی پری
کہیں اس کے آنے کی سنکر خبر
دیا قید میں اس کو ڈالا کہیں
سو میں کھوج میں اس کے جوگن ہوئی
یہ سن قوم کو اس نے اپنی بلا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرو مت کمی
جو تم میں سے لاوے گا اسکی خبر
ہوا ناگہاں ایک کا واں گزر
وہ روتا جو تھا نالہ و آہ سے
وہ چوکی پہ جو دیو تھے جا بجا
کہا ماہ رخ کا ہے قیدی یہاں
وہ تحقیق کر اور لے اس کا بھید
گیا جا کے فیروز شہ کو سلام
یہ بھیجا پھر اس ماہ رخ کو پیام
بنی آدموں کو تو چوری سے لا
بھلا چاہتی ہے تو اس کو نکال
گیا ماہ رخ کو یہ پیغام جب
کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی
پہ اتنا یہ احسان مجھ پہ کرو
یہ سن کر جواب اس کا فیروز شاہ
الگ یوں لے آیا کنوئیں سے نکال
وہ جیتا تو نکلا و لے اس طرح

سدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم
ہمیشہ سے ہمراز تھی ہمہ مشیر
کہ ایک شخص وارد ہوا ایک رات
نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
لگے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مل
محبت میں تھی اسکے وہ بھی بھری
خدا جانے پھینکا ہے اس کو کدھر
کہ مدت سے اس کی خبر کچھ نہیں
یہاں تک پہنچی یہ دکن ہوئی
تفقد سے سب کو سنا کر کہا
کہ ہے اک پرستان میں آدمی
جواہر کے دوں گا لگا اسکو پر
جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
تو کچھ اس آئی صدا چاہ سے
لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا
کنوئیں میں تڑپتا ہے اک نوجواں
اڑا شہر کو اپنے دیو سفید
سن آیا جو کچھ تھا سنایا تمام
کہ کیوں زیست کرتی اپنی حرام
بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتا
کنوئیں میں جسے تو نے رکھا ہے قُلّ
ہوئی خوف سے وہ پریشان تب
کہو اس کو لے جائے یاں سے کوئی
کہ اس کا پرستاں میں چرچا نہ ہو
چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
کہ فوارہ جیوں آب کو دے اچھال
کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح

یہ دیکھا جو احوال اس کا تباہ
تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ

بٹھا تخت پر اپنے اس کو وہاں
لے آیا وہ بیٹھی تھی جوگن جہاں

رکھا تخت اک جا پہ اس کا چھپا
کہا پھر یہ جا کر کہ نجم النسا

چل اب تو کہ میں اس کو لایا یہاں
یہ سنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں

کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے
ذرا اس کی صورت دکھا تو مجھے

کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو
کہ شادی پڑی ہے کہیں غم نہ ہو

یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اسکا ہاتھ
لے آیا وہ جوگن کو واں ساتھ ساتھ

گیا آپ اس تخت پر بیٹھ اور
دکھایا اسے اور کہا کر تو غور

جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی
کہا ہاں رے ہاں یہ وہی ہے وہی

یہ اس تخت کے گرد پھرنے لگی
بلا اس کی لے لے کے گرنے لگی

وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اٹھا بے نظیر
تو نجم النسا ہے یہ دخت وزیر

کہا تو کہاں اور کسی کا یہ جوگ
کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ

کہا تیرے غم نے دوانا کیا
کہ عالم سے اپنے بیگانہ کیا

کہی سرگزشت اس نے اسدم تلک
کہ اس طرح پہونچے ہو تم ہم تلک

کیا ایک دن تو انہوں نے مقام
چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام

وہ جوگن وہ فیروز شہ اور وہ ماہ
چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ

مربع نشین تھی جو بدر منیر
وہاں اس کو لائی وہ دخت وزیر

بلائیں لگی لینے نجم النسا
لگی گرد پھرنے بہ رنگ صبا

گئی جب کہ خلوت میں بدر منیر
کہا میں لے آئی ترا بے نظیر

کہا کیونکر لائی کہا اس طرح
وہ سب کہہ دیا حال تھا جس طرح

ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں
اور اک اور بندھوا اڑا لائی ہوں

کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا
درختوں میں ان کو رکھا ہے چھپا

سو اب ایک کو جا کے لاتی ہوں میں
ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں

یہ سن شاہزادی ہنسی کھل کھلا
کہا کیوں اڑاتی ہے نجم النسا

چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں
وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں

غرض دیر تک مل کے روتے رہے
جدائی کے داغوں کو دھوتے رہے

کہا شاہزادے نے احوال سب
کنوئیں میں جو گزرا تھا اس پر تعب

اگرچہ ہر اک وصل سے یاد تھا ‏ ولے ہجر کا غم انہیں یاد تھا
یہ ٹھہرا کہ نکلے وہ دو ماہرو ‏ کہ اس بات کو کیجیے ایک سو
وہ نجم النسا اور وہ بدرِ منیر ‏ کچھ اک کر بہانہ وہ دونوں شریر
رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے ‏ کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے
نکل بے نظیر اور وہ فیروز شاہ ‏ کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ
کہ اسباب سب سلطنت کے درست ‏ پھر آئے اسی جا پہ چالاک و چست
وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ ‏ جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ
کیا نامہ میں ایک اس کو رقم ‏ کہ اے شاہ شاہاں و اے فخرِ جم
فریدوں مثال و سکندر نژاد ‏ مرادِ جہان و جہان مراد
میں وارد ہوں یا ایک مہماں غریب ‏ لے آئے مجھ کو مرے یاں نصیب
نوازش سے اپنی کرم کیجیے ‏ غلامی میں اپنی مجھے لیجیے
گیا یہ جو مسعود شہ کو پیغام ‏ سنا اور پڑھا خط کا مضمون تمام
لکھا نامہ اس کے یہ اک در جواب ‏ کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
کہ نامہ تمہارا جو سربستہ تھا ‏ وہ رازِ نہاں اپنے ہاتھوں کھلا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں ‏ تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
ولے ہم کو ہے پاس شرعِ رسولؐ ‏ سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
سنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید ‏ ہوئی شہزادے کو گویا کہ عید
بلا ستنکوں کو بتا سال و سن ‏ مقرر کیا نیک ساعت کا دن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز ‏ چڑھا بیاہنے وہ مہ دل فروز
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان ‏ بلا سب کو شربت دیے خاصدان
اٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح ‏ محل میں بلانے کی ٹھہری صلاح
ہوا لیکن اس وقت دونا مزا ‏ کہ دولہا دلہن جب ہوئے ایک جا
غرض اس طرح جب وہ دلہن کو بیاہ ‏ لے آیا جہاں اس کی تھی عیش گاہ
وہ نجم النسا تھی جو دختِ وزیر ‏ گیا اس کے والد کنے بے نظیر
کہا باپ کو اس کے اے خیر خواہ ‏ مرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اک التجا ‏ کہ تو اس کو فرزندی میں اپنی لا
غرض ہر طرح کر رضا مند اسے ‏ کیا حال پر اپنے پابند اسے

پریزاد تھا وہ جو فیروز شاہ
خوشی سے لیے حسرت و جان و مال
زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ
لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم دھام
ہوا شہر پر فضل پروردگار
مرے اک مشفق ہیں مرزا قتیل
انھوں نے شتابی اٹھا کر قلم
بگو شم ز ہاتف رسید ایں ندا
میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور
کہی اس کی تاریخ یوں بر محل

دیا اس کو نجم النسا سے بیاہ
چلے شہر کو اپنے وہ حال حال
دوبارہ انھوں نے کیا ان کا بیاہ
تو پھر یہ کہانی نہ ہووے تمام
وہی شہزادہ وہی شہریار
کہ ہیں شاہراہ سخن کے دلیل
یہ تاریخ کی فارسی میں رقم
بریں مثنوی باد ہر دل فدا
انھوں نے بھی کی فکر از راہِ غور
یہ بتخانۂ چین ہے بے بدل

(۲) دوسری مثنوی گلزار ارم[1] ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلومہارٹ نے غلطی سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے اور ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں تصنیف ہوئی اس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اس زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں۔ اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں انھوں نے کئی ہجویں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری۔ ہجو قصاب۔ نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجویں نہایت پر لطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔

میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جن میں سے سات قصیدے موجود ہیں، میر صاحب موصوف قصیدہ کے مرد میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں۔

مراثی چند مرثیے اور سلام بھی انھوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ ان کے تذکرے سے پایا جاتا ہے اس صنف کی تکمیل و ترقی ان کے پوتے کے زمانہ میں بخوبی ہوئی۔

---

[1] گلزار ارم تاریخی نام ہے ۱۲ ؎ دیکھئے حاشیہ صفحہ ۹ (مرتب)

تذکرۃ الشعرا[1] یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں۔ ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ سن تھا جب کہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس تھی۔ مصنف نے اس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ان شعرا کا جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے۔ دوسرا ان کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک ہوئے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا۔ بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعرا کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے۔ مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے ان کا کلام نہایت سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور ان کی مثنوی سحر البیان تو ایک معرکۃ الآرا اور بے نظیر تصنیف ہے جس سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ کے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

مثنوی گلزار ارم سے

لکھنؤ کی مذمت

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے ازبس دل پہ گھیرا — لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا
بہت ہی گرچہ اہل اللہ اس جا — ولے جاگہ جو بد ہو تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے بہتر پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پہ گھر ہوا ہے — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

[1] ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے میں میر حسن تذکرہ شعرائے اردو کی تالیف کا کام غالباً ۱۱۸۴ھ کے قریب شروع کیا زیادہ شعراء کے حالات ۱۱۸۸ھ کے آس پاس تحریر کئے۔ پہلا مسودہ ۱۱۸۹ھ میں تکمیل پا گیا۔ پھر خاتمہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا۔ بعد ازاں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات داخل تذکرہ ہوئی۔ اس بات کا قرینہ نہیں کہ اس کے بعد اور اضافے بھی ہوئے ہوں (میر حسن اور ان کا زمانہ ص ۱۳۷) (مرتب)

حبیب الرحمن شروانی کی رائے میں تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا، (مقدمہ شعرائے اردو)

امتیاز علی عرشی کی رائے میں تذکرہ کا کام ۱۱۸۴ھ میں یا اس سے کچھ پیشتر شروع ہوا ۱۱۹۱ھ میں ختم ہوا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۴ھ کو واقع ہوئی تھی (دیباچہ دستور الفصاحت ص ۶۸-۶۹) (مرتب)

نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا
زمانے پر عبث رکھا بہانا

عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی
گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم

ہر اک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بہ مشکل یہاں گزر ہے

فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیتِ شہر
کہ کیجئے سیرِ فیض آباد جب کر

ہرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
چلا میں یاں سے اپنا دل اٹھا کر

جونہی داخل ہوا میں اس نگر میں
کھلا جنت کا دروازہ نظر میں

عجب معمورہ آباد پایا
مثالِ گُل ہر ایک دل شاد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی
قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی

بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا
مجھے جنت سے جوں آدم نکالا

دعا میری یہی ہے اب شب و روز
کہ پھر دیکھوں پھر وہی بیٹھے دل افروز

وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار
وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار

پھروں میں پیچھے کرتا جہاں میں
غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں

رہیں میری غزل خوانی میں شامل
رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل

رباعی کا نمونہ

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے
معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے

دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں
یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

ولہ

کیا وحش و طیور و انس جاں عالم میں
جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اس غم میں

روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں
جلتے ہیں یہ دل حسینؑ کے ماتم میں

ہجو کا زمانہ

اپنے گھر حالت

ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر
دو روپیہ کے تیئں کرائے پر

جان سے ہیں تنگ اس میں لوگ
پہلے اس گھر کی خوبی یہ پائی،
کلہ آماس کر گیا سارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال
صحن اس کا بتاؤں کس مقدار
پانچ بلّی کا کہنہ سا چھپّر
نو کا یا دس کڑی کا ایک دالان
سیڑھی اک بانس کی پرانی سی
نہ تو مطبخ نہ واں مکانِ ضرور
اک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ
تس پہ دو ٹٹیاں برائے اوٹ
ڈیوڑھی کا بند کیجیے جب در
آنے والا جو کوئی آ جائے
یعنی در جو کھلا نہیں پایا
گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی
ٹوٹا پھوٹا جلا بھُنا سارا
چیز آبی و بادی اس میں کم
یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ
خوب یاں کا کھلا جو ہم پر بھید
دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی
گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب
کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار
تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات
تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب

گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
پہلے ہی مجھ پہ گھر نے منھ مارا
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال،
ایک دو تین چار پائی دار
ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
تس پر اک ٹوٹے جھونپڑے کی شان
آنے جانے کے واسطے ہے دھری
دونوں ہاتوں کا واں نہیں دستور
صحن میں ساری جا ضرور کی بیچ
وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
بیٹھے جا ضرور تب جا کر
دیکھ دروازہ بند پا جاوے
کوئی ہے جا ضرور کو آیا
گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی،
دھوپ سے گرم جیسے انگارا
زور خالی و تاری کا پیہم
کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید
رات پلکوں سے قطرہ افشانی
ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب
دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
جوں تیمم کی خاک کے تھیلے،
ہو گئے کل وہ کوہ ریگستان
جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
ریگ ماہی ہوئے تمام قلم
حرف مٹ مٹ کے ہو گئے ہیں خراب

صاف آتا نہ کوئی سانے گا ‏— خوب جب تک نہ خاک چھانے گا
دیکھیں کس طرح سے جیتے ہیں ‏— خاک کھاتے ہیں لہو پیتے ہیں

قصیدہ کا رنگ یہ ہے

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم ‏— جس کی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم
خوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جس کے ‏— نقش پاسے گل نرگس کو کرے دام شمیم
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب ‏— عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کس کے وذیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور ‏— غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
شاہد اس باغ میں ہے آصفِ دوراں کا گذر ‏— کہ ہے وہ ابنِ کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیرِ اعظم ‏— نائبِ ظلِ الٰہ صاحبِ تاج و دیہیم

میر تقی میر[1] میر محمد تقی نام میر تخلص۔ ریختہ گویانِ ہند کے استادِ اعظم شاعرانِ اردو کے رہبر مسلم۔ ادب و زباں دانی کے ماہرِ فن۔ خوش گو۔ خوش بیان۔ شیریں سخن تذکروں میں والد کا نام[2] میر عبداللہ لکھا ہے مگر ذکر میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا البتہ یہ تحریر کیا ہے "کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے علم ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا۔ جوان صالح و عاشق پیشہ تھے۔ اس لئے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے چونکہ ان کا نام تحریر نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے کہ نام میر عبداللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں" میرے بزرگ زمانے کی ناسازگاری سے اپنی قوم اور قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہنچے۔ وہاں سے وہ احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے بعض تو ان میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میر جد کلاں نے اکبرآباد میں توطن اختیار کیا مگر ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھا وہ اکبرآباد کی فوج داری پہ سرفراز ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار چلے گئے اور چند ہی روز کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے ان کے بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔" میر صاحب نے ان کے چند قصے بیان فرمائے ہیں۔ درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر جس نے مکر و فریب کا جال پھیلا رکھا تھا اس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر

---

[1] میر کے سال پیدائش میں اختلاف ہے بکلب علی خان فائق ۱۱۳۶ھ خواجہ احمد فاروقی ۱۱۳۷ھ اور قاضی عبدالودود ۱۱۳۵ھ لکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی ۱۱۳۷ھ کے حق میں ہیں، قرین صحت ۱۱۳۵ھ ہے۔ (مرتب)

[2] جدید تحقیق کے مطابق میر کے والد کا نام میر محمد علی اور خطاب علی متقی تھا۔ (مرتب)

وہ دلّی آئے وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پر ان کی نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ ان کا معتقد ہو گیا۔ وہاں سے آگرہ آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ وہ نوجوان بھی ان کی تلاش میں آگرہ پہنچا اور وہیں رہ پڑا۔ ان کا نام سید امان اللہ تھا اور میر تقی ان کی عزت کرتے تھے۔ میر صاحب کی تربیت میں ان کو بڑا دخل تھا۔ میر صاحب ان کو اپنا چچا کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار کہہ کر یاد کرتے ہیں اور دن رات انہیں کے پاس رہتے اور ان کی تمام تربیت سید صاحب کے زیر نظر ہوئی۔ سید امان اللہ کا انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔ میر صاحب اور ان کے والد کو ان کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا چنانچہ ان کے والد بھی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی بے مروّتی کی اور باپ کے کل ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس صغر سنی میں میر صاحب اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف ہوئے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیر باد کہہ کر شاہجہان آباد دہلی پہنچے۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامرا کے بھتیجے تھے ان کو نواب صاحب کے پاس لے گئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ میر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آ گئے مگر جب گذر اوقات کی کوئی معقول صورت نظر نہ آئی تو پھر دلّی کا رخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں جا کر ٹھہرے اور کچھ دنوں ان کے پاس رہے مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہونچانے کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے بند پڑے رہتے اسی وجہ سے ان کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خاں نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہٗ ایک بزرگ میر جعفر نامی سے کچھ تعلیم حاصل کی اور سید سعادت علی خاں نے ان کو ریختہ میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ ادھر خان آرزو درپے آزار تھے ایک روز مجبوراً میر صاحب ان کے مکان سے نکل گئے مگر خوبیٔ قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامی نے ان کو اپنا مصاحب بنا لیا اور اس طرح تنگ دستی سے گونہ نجات ملی۔ جب احمد شاہ دُرانی کو سرہند میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے اور جو خدمت ان کے لائق تھی اس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب نے قصبۂ سانبھر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔ ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اس نے ان کی دوستی کا حق خوب نبھایا اور محمد رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر کر لیا۔ چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے اور روہیلوں کی جنگ میں اس اطراف کی سیر کی۔ جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد مہاراجہ دیوان

کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے خالو کی ہمسائیگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ ناگر مل سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد ان کے بیٹے نے ان کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی۔ میر صاحب ان کے خانہ باغ میں دو پہر رات تک موجود رہتے۔ بشاہرہ معقول ہونے سے کسی قدر فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دلی کی حالت ابتر ہو رہی تھی اس میں میر صاحب کا مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال و اسباب لٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب معہ لواحقین کے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دنوں برسانہ ضلع متھرا میں قیام کر کے کمہیر پہونچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا اور بہادر سنگھ یہاں ان سے بڑی مدارات سے پیش آئے اور سورج مل کے طویلے میں خانہ خرابان دلی کا مامن بن گیا تھا اعظم خاں سے ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں ان کے ہمراہ تھے۔ راجہ سورج مل کے چھوٹے بیٹے نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کیا اور خود سورج مل نے روزینہ مقرر کر دیا چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر گھروں کو خراب اور شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب اکبر آباد پہونچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ ان کے شعر و سخن کا شہرہ اب عالم گیر ہو چکا تھا چار مہینے وطن میں رہ کر سورج مل کے قلعہ میں آگئے۔ کچھ دنوں بعد پھر اکبر آباد آئے اور پندرہ روز رہ کر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار سے راجہ ناگر مل مع اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی مقام تھا۔ میر صاحب بھی ان کی معیت میں تھے اور بوجہ ملازمت اسی شہر میں چند دن اقامت گزیں ہوئے مگر تھوڑے عرصہ بعد ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ صاحب نے میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے ان کی طرف سے سب عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ناچار میر صاحب بھی ان کے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہونچے۔ اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جدا ہو گئے۔ سرداروں کے اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہہ الدین خاں برادر خورد حسام الدین سے ملے اور اس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب ان دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالم گیر ثانی ان کو اکثر طلب فرماتے مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابو القاسم خاں اور عبد الاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ ان سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگیٔ لکھنؤ | لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں "فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر الملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہو چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں جس طرح ہوسکے آپ یہاں آجایئے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا[1]۔ چونکہ خدا کی مرضی یہی تھی میں بے یار و مددگار بغیر تاخیر اور رہبر کے فرخ آباد کے راستے سے گذرا۔ وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے انہوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہ کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہوکر منزل مقصود پر پہونچ گیا۔ اور سالار جنگ کے یہاں گیا انھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگان عالی کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے تشریف لائے میں بھی حاضر تھا۔ ملازمت حاصل کی محض فراست سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے اپنے شعر مجھے مخاطب کرکے سنائے۔ سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند اشعار عرض کئے۔ رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہوگئے ہیں۔ بندگان عالی مختار ہیں انہیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا میں کچھ مقرر کرکے آپ کو اطلاع دوں گا۔ دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا، سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لئے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہم رکاب تھے اس کی یادگار میں شکار نامہ موزوں کیا۔ دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ انھوں نے دوسرا شکار نامہ کہہ کر حضور میں پیش کیا۔ اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور مخمس تضمین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات

---

[1] میر ۲۳ ربیع الاول ۱۱۹۶ھ سے پہلے اور ۱۶ محرم ۱۱۹۶ھ کے بعد لکھنؤ پہنچے (کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ صفحہ ۶۲) مرتب

ترک کر دی ہے۔ بڑھاپا آ پہنچا اور عمرِ عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھائی ضعفِ بصر کی وجہ سے عینک لگائی دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعفِ قویٰ۔ بے دماغی۔ ناتوانی۔ دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔"[1]

میر صاحب کی عمر میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ ان کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے۔ ناسخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ع "واویلا مُرد شہِ شاعراں" سے سنہ وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرۂ جہاں میں میر صاحب کی عمر ۱۰۰ سال تحریر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۹ھ میں جب کہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسی سے متجاوز ہو چکا تھا[2] مگر یہ قیاس پر زیادہ مبنی ہے۔ کتاب ذکرِ میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۱۹۷ھ ہوتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۱۳۷ھ ہجری ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا تھا اس وقت ان کی عمر صرف ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہو گی اگر پیدائش کا سن ۱۱۳۷ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکرِ میر ۱۱۹۷ھ ہجری میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "جب میں ۱۸۴۸ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری موسوم بہ ذکرِ میر دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۱۵۲ صفحات کی ہے" یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہو گئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا اکثر ظنی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں یا معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کے قلمبند کر دیں اور ان کو بعد کے لوگوں نے مستند تسلیم کر کے اور زیادہ چمکایا۔ افسوس ہے کہ ذکرِ میر کی

---

[1] ملخص از ذکرِ میر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب (رسالہ اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)

[2] مصحفی نے میر کی عمر کا یہ تخمینہ ۱۲۰۹ھ میں نہیں لکھا مصحفی نے یہ "تذکرہ ہندی" میں لکھا ہے اور تذکرہ ہندی کا زمانہ تالیف ۱۲۰۰ھ تا ۱۲۰۹ھ ہے اسی عرصہ تالیف میں میر کی عمر کا یہ تخمینہ لگایا گیا ہوگا۔ (مرتب)

ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعراء میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے کچھ نہیں لکھا "مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد است۔ بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد ست" یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا۔ ذکرِ میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے۔ نادر شاہ کی جنگ سے لے کر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۱۵۱ھ ہجری سے لے کر ۱۱۹۱ھ تک کی تاریخ ہے اور اس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مورخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں، جاٹوں روہیلوں، افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابانِ اودھ کے معرکے۔ انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں اہل ہنود و مسلمانوں کے خوش گوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہٰذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اس زمانے کے لٹریری پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

سیادت میں اختلاف تذکرہ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جب کہ میر صاحب حیات تھے اور دلّی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت سیّد نہ تھے بلکہ میر تخلص کرنے کی وجہ سے سید خیال کئے جانے لگے۔ تذکرہ آبحیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انہوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ بیٹا ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انہوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سودا کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے۔

میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد

بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو ہٹیر

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت میں[1] شبہ نہ کرنا چاہئے اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی	پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

[1] مصنف آبحیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے ان کے سید ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ افسوس ہے انہوں نے ایک غیر معتبر روایت "کہن سال بزرگوں کی زبانی" نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید بن جاؤ گے۔ اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا

(باقی بصفحہ آئندہ)

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس[1] وجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکر میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔ اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی رکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو ان کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اس وقت شعر نہیں کہتے تھے۔ "میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لئے ناگواری کا باعث ہو" آزاد نے اپنی نہایت قابل قدر، مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آب حیات) میں بعض غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کئے ہیں جن سے ان کی بد دماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفر دلّی کا ذکر کیا ہے اور میر قمر الدین منّت، اور سعادت یار خاں کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ ان واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصے اور سنے سنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیئے۔ الحمد للہ کہ نکات الشعراء کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے: نکات الشعراء کے متعلق آب حیات۔

نکات الشعراء | میں ہے "کہ نکات الشعراء شائق شعر کے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے

کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جس کے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اڑایا گیا ہے مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت وغیرہ کا محضر تیار کر کے ادائے شہادت کرتے ہیں کہ ان کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے"۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اس شبہ کی خود ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے ان کو "خلف میر عبداللہ" لکھتے ہیں یعنی ان کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے بیٹے کا نام "میر عسکری عرف میر کلّو" بتلاتے ہیں۔ ۱۲۔

[1] دور جدید کے محققین کے نزدیک میر کی سیادت مشتبہ ہے۔ قاضی عبدالودود نے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر سیادت پر شک کیا ہے۔ میر حسن نے میر کو "میاں محمد تقی" اور ان کے بھتیجے تخلص بہ محسن کو "شیخ محمد حسن" لکھا ہے دیوان قائم (نسخہ لندن) میں ایک رباعی ہے جس کا مصرعہ اول یہ ہے ؎

حلہ "ردی کے لئے کہلائے تم سید جی میر" میر نے ذکر میں جہاں اپنے بزرگوں کا حال رقم کیا ہے یہ

(باقی صفحہ آئندہ)

اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا سان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ نبی شعراء کا آدم ہے۔ اس کے حق میں فرماتے ہیں۔ ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعراء اب شائع ہو گئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر ہے۔ بلکہ فی الحقیقت تقریباً سو شعراء کا حال ہے نہ ان کے کلام کی تنقید میں سختی اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک وصاف ہے۔ تنقید بھی نہایت مختصر اور زوردار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ فقیر کو اس کے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ درست اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم اور صرف اسی صورت میں جب کہ کوئی شخص اس کا مستحق فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا بلکہ برعکس اس کے ان کی نسبت تحریر لکھتے ہیں۔" کہ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آب حیات میں ہے کہ" میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پہ نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پہ بگڑ کر الگ ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بد دماغی کا تذکرہ نکات الشعراء میں کہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ وہ تو ان کو اپنا استاد و پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناروا داری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے ذکر کیا ہے۔ میر صاحب نے اس کے متعلق ذکر میر میں تحریر کیا ہے لیکن ان کے کلام میں کہیں نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بد وضعی کی۔ ذکر میر میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی آ گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے۔ وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیادار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا جب کبھی

نہیں بتایا کہ کس امام پہ ان کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے۔ یہی نہیں میر نے اپنے والد کے سوا اپنے کسی بزرگ کا نام تک نہیں لکھا۔ (عیار ستان صفحہ ۱۲۸) (مرتب)

ملاقات ہوتی تو بلا وجہ بُرا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہونچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے" اس رنج و غم میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ ایک روز خان آرزو نے میر صاحب کو کھانا کھانے کے لئے بلایا اور ناگوار و تلخ باتیں کرنا شروع کیں۔ میر صاحب بغیر کھانا کھائے اٹھ آئے شام کو ان کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد ان کی ہمسائگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بابت لکھتے ہیں کہ میر خالو بادیہ پیمائے طمع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے آرزو میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے انہوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف کیا ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے یہ بھی ایک بے بنیاد دعوٰے ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے اچھے اشعار ان کے ہم تخلص کی طرف منسوب کئے جائیں گے تو انھوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے ان کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب ان لوگوں کا ذکر جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اس وجہ سے کہ میر صاحب نے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے مثلاً میاں شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں "متوطن جاجمؤ کہ قصبہ ایست متصل اکبرآباد حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ"

میر صاحب کا کیریکٹر اس میں کوئی شک نہیں کہ قسام ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ کی تمکنت خودداری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر رؤسا اور امرا کے ارتباط اور میل جول تک کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اس سے ان کی خودداری پہ کوئی حرف آئے وہ بے حد ضابطہ، کم گو اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے افلاس اور کم مائیگی نے ان کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا۔

نازک دماغی میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ راجہ ناگر مل جو ان کا بڑا قدردان تھا۔ اس

کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑدی کہ جو معاہدہ وہ اس کے ایما سے بادشاہی امرا سے کرکے آئے تھے اس پر اس نے عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوانِ بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے زندگی بسر کرتے تھے، میر صاحب کو گھر سے اٹھا لے گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح خواہش کی، میر صاحب نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا اور راجہ ناگرمل سے ملاقات کرادی اور میر صاحب کی انہوں نے بہت قدر کی۔ رعایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک روز انہوں نے میر صاحب سے فرمائش کی کہ گویے کو ریختے کے اپنے دو زمین شعر یاد کرا دیجئے گا تو وہ گانے کے قاعدے سے درست کرکے گلے گا۔ میر صاحب نے عذر کیا خان صاحب نے اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور ان کی ملازمت چھوڑ دی۔ عالم گیر ثانی نے بار بار بلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا اور دوسرے یہ کہ انہیں اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ در پے ہو تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آ ہی جاتی ہے۔ ان کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سریع الغیظ اور جلد برہم ہو جانے والے تھے اور اپنی کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے ؎

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ولہٗ

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہٗ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ولہٗ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ولہٗ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشے میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر اور منکسرانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بنایا ہے مگر یہ سب بھی اسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی اجگر نامہ جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہا قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ ان کے فطری غرور اور بددماغی کی ایک بیّن مثال سمجھی جاسکتی ہے اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ "مردیست جاہل، متمکن و منقطع وضع . . . . در یافتہ نمی شود کہ ایں رنگ کہن بسبب شاعری است یا وضع او ہمین است خوب است ما را با اینہا چہ کار . . . . . بامن ہم آشنائے بیگانہ است" مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہر شخص کو اس ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مرزا رفیع سودا کی نسبت اس طرح رطب اللسان ہیں "غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی او ست بسیار خوش گو ست . . . . . چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید" اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں " اگر یہ غرور و بددماغی فقط امراء کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو سر ہلا نا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔" اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعرا" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ انھوں نے میر صاحب کے غرور اور بدمزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لے لیں

میر کے کلام میں مایوسی و درد

میر ازل ہی سے درد مند دل لے کر آئے تھے اور ان کو دنیا میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں

نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ		قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

پھر والد کی وصیت بنیادِ زندگی اور تلقین کہ " اے پسر عشق بورز ۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است ۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست ۔ بے عشق زندگی وبال است ۔ دل باختہ عشق بودن کمال است .. .. .. بے عشق نباید بود ۔ بے عشق نباید زیست ۔ چنانچہ جابجا میر صاحب فرماتے ہیں

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو ۔۔۔ سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

ــــــ

یا رب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے ۔۔۔ اک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ شاہ کے زیرِ نظر ہوئی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ زمانہ طفولیت ہی سے شانِ درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہو گئی تھی ۔ سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہلِ دل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی سوز و گداز بھری باتیں سننے کا موقع ملا جو ان کے دل میں اتر گئیں اور جن کا اثر ان کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا ۔" میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور ہے ۔ بچپن سے ہی مصیبت کا سامنا تھا ۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا ۔ تلاش معاش کے لیے باہر نکلے ۔ بڑے بھائی نے بیرخی اختیار کی دلی گئے ۔ وہاں بہت تکلیف سے کٹی ۔ خان آرزو بھی درپے آزار ہو گئے ۔ میر صاحب بہت ہی دل شکستہ و دل گرفتہ رہتے تھے ۔ اس پر بے نوائی و بے بسی ۔ اس غم و غصہ میں ایک جنون کی سی حالت ہو گئی اور انہیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے ان کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی اس حالت ذکر میر میں موجود ہے اور ان کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں درج ہیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل ۔۔۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی ۔۔۔ در و بام پر چشم حسرت پڑی
بس از قطع رہ لائے دلی میں بخت ۔۔۔ بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا ۔۔۔ مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام ۔۔۔ لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا ۔۔۔ کبھو سنگ در دست رہنے لگا
نظر آئی اک شکل مہتاب میں ۔۔۔ کمی آئی جس سے خور و خواب میں

دلی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا ۔ آج گھر میں اناج تو کل نانِ شبینہ کے محتاج ۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہنچی ۔ اس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی چنانچہ کلام میں بھی اس حالت کی جھلک موجود ہے ؎

نامرادانہ زیست کرتا تھا		میر کی وضع یاد ہے ہم کو
بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میر	ولہ	بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے
نہ مل میر اب کے امیروں سے تو	ولہ	ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

پھر دلّی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دن کے انقلاب۔ مرہٹوں، جاٹوں، دُرّانیوں کی دستبرد و غارت گری اپنی آنکھوں سے دیکھی اور قلم سے لکھی ؎

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں		تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا
دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا		اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مولوی عبدالسلام ندوی نے بہارِ بے خزاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب تیغِ عشق کے زخم خوردہ تھے اور ان کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر اُن کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور تذکرہ نویسوں کو اس کی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کر دیا ہے۔ چنانچہ بہارِ بے خزاں میں ہے کہ" بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع بمیل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بچار سوئے رسوائی می کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری در آید از ننگ افشائے راز وطن و اقربا با دلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ برانداز بہ جا بشہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بعد حسرت جانگاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جہاں بجہان آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت از کلام عاشقانہ درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک بردہ" میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں		تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا		وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف | میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں چونکہ بہت بڑی عمر پائی تھی۔ لہٰذا تصنیف و تالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے۔
(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)
(۳) متعدد مثنویاں۔

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں ان میں بعض بہت فحش ہیں اس سے اس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعرائے اردو کا موسوم بہ نکات الشعراء، دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں، مستزاد، واسوخت، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مطلع تضمینین، فردیات، غرض کہ جملہ اقسام سخن موجود ہیں۔ دیوانوں کے صدہا صفحے ہیں اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے مگر اول تو ان کی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلہ سودا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی اس وجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور مدح سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ استغراق خودداری اور قدرتی کم سخنی ان کو بے جا لفاظی کی طرف کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔ مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہر آشوب کی صورت میں ہیں جن میں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں۔

غزلوں کے بعد ان کی مثنویوں کا نمبر ہے جن کی تعداد بھی کثرت سے ہے مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں۔ تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اژدر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعراء کی حقارت کا ایک منظر ہے اس میں انھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہا تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں، سانپ بچھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اس زمانہ کے کم مایہ شعراء مراد ہیں۔

(۲) شعلۂ عشق (۳) جوشِ عشق (۴) دریائے عشق

(۵) اعجازِ عشق (۶) خواب و خیال (۷) معاملاتِ عشق

(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فن نظم اور اس کے مرتبہ کا بیان ہے ان کے علاوہ تین مثنویاں شکارنامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت انس تھا مثلاً کتا۔ بلی۔ بکری وغیرہ ایک مثنوی مرغبازاں۔ ایک میں موسم برسات اور ان کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت سے گر گیا تھا اس طرح ایک میں سفر برسات کا ذکر ہے۔ ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے۔ کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔ تاریخ گوئی کا ان کو مطلق شوق نہ تھا ایک ساقی نامہ بھی ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں | میر صاحب اُردو واسوخت[1] کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں اسی طرح اُردو میں مثلث و مربع (یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں بھی انھیں کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کرکے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی مربع مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

بیچارہ زلف تو غلط داشت گمانہا		امروز یقین شد کہ نہ داری سر اہلی

اس پر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کر کس طرح مطلب پورا کیا ہ

امروز یقین شد کہ نہ داری سر اہلی		کل تک تو فریبندہ ملاقات بھی پہلی

بیچارہ زلف تو غلط داشت گمانہا

میر صاحب کی شہرت خاص کر ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ غزلوں میں تو فی الحقیقت ان کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نہیں پہونچتیں پھر بھی ان کی بے ساختگی اور فصیح البیانی و سادگی قابل داد ہے۔ دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف کر دیا تھا

تذکرہ نکات الشعرا | یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ[2] مطابق ۱۷۵۲ء عیسوی میں لکھا گیا۔ حسب دعوے مصنف شعرائے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دل چسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیئے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق اس میں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں جن شعرا کا ذکر ہے ان کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے۔

میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ | میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا ان کے ترجمہ کو اردو میں داخل کرکے اس کو ریختہ بنایا آزاد نے آبحیات میں اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں مثلاً

پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا		ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
ایک عالم کے سر بلا لایا!		دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
بہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائے گا		اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا

ترجمہ کی مثال

فرق نکلا بہت جو باس کیا		گل کو محبوب ہم قیاس کیا

[1] میر کو واسوخت کا موجد نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان سے پہلے محمد شاکر ناجی (م ۱۱۵۰ھ اندازاً) اور شاہ مبارک آبرو (م ۱۱۴۶ھ) واسوخت لکھ چکے ہیں۔ (مرتب)

[2] بقول عرشی میر نے ۱۱۶۱ھ میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ کا کام شروع کیا تھا ۱۱۶۴ھ تک اس کام میں مشغول رہے ۱۱۶۵ھ میں بھی اضافے کئے۔ (دیباچہ دستور الفصاحت ص۴۶) (مرتب)

باس کرنا یا بو کرنا فارسی 'بو کردن' کا ترجمہ ہے یعنی سونگھنا۔

ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھہریں جو رفتہ رفتہ متروک ہوئیں میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعرا کے آخر میں دیئے ہوئے ہیں خود انہی کی زبان سے سننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں۔

بدانکہ ریختہ بر چندین قسم است۔ از انجملہ انچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔ چنانچہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ شدہ[1] دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔ چنانچہ شعر مرزا معز کہ نوشتہ آمد[2]۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند و این قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی مے آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است و این را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آن معیوب ست و دانستن این نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمین است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف درین فن رواج داشت اکنون طبعہا معروف این صنعت کم است مگر بسیار برشستگی بستہ شود۔ معنی ایہام این است کہ لفظے کہ بنائے بیت بر آن بود آن دو معنی داشتہ باشد یکی قریب دیگی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعت ہا است۔ تجنیس ترصیع۔ تشبیہ صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ این ہمہ در ضمن ہمین است و فقیر ہم از ہمین وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را درین حسن طرز خاصی است این معنی را می فہمد با عوام کار ندارم"۔

میر بحیثیت شاعر کے عام طور پر اُردو شاعری اردو تغزل کی مرادف ہے اور میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر صاحب زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ میر صاحب کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں ان کا جواب نہیں اور اس مملکت میں وہ منفرد اور تن تنہا حکمراں ہیں ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر سے مملو ہوتے ہیں۔ ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار جذبات چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جا سکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ میر صاحب کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں مگر سچ پوچھئے تو ان

[1]	زرگر پسرے چو ماہ پارہ نقد دل من گرفت و بشکست	کچھ گھڑئے سنوار دیئے پکارا پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

[2] از زلف سیاہِ تو بدل دوم پڑی ہے ؛ در خانۂ آئینہ .. .. گتا جوم پڑی ہے ۱۲

کے صدہا ایسے شعر نکلیں گے جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔ زبان شُستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ اور دلآویز جیسے باتیں کرتے ہیں وہ اُردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکسیر شاعری ہے علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے۔ وہی ان کی شاعری کی جان ہے یہی ناامیدی اور یاس ان کی غزلوں کو زوردار اور موثر بناتی ہے۔ میر صاحب شاعری اور زبان دانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ ان کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو ان کے بعد پیدا ہوئے ان کی عظمت اور استادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ ان کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی بے حد تعریف کی ہے اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات ان کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ شاعر اور نثار دونوں ان کی تعریف کے معاملہ میں مطابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ اور نیچر دونوں میں ان کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سرآمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے افصح الفصحا اور بے نظیر بے عدیل شاعر تھے۔ اسی طرح مرزا علی لطف تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ "جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بین رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے۔ کہ میر شیریں مقال میں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے۔" صاحب طبقات الشعرا لکھتے ہیں "مجموعۂ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران محاورہ داں رنگین تلاشی مضامین نو و رنگین متجسس الفاظ چرب شیریں درمیدان غزل پردازی گوئے فصاحت از معاصران مے برد ہر چند سادہ گو است۔ امادر سادہ گوئی پرکاری ہا دارد" حقیقت یہ ہے کہ میر و میرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمہ فیض تھے ان کے کلام کی حلاوت و دل آویزی ان کے اشعار کا درد اور رنگینی آج تک مشہور ہیں بلکہ جب تک زبان اُردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر اور سودا کا مقابلہ میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ و ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی برتبۂ میر تقی نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

مرزا ور یا نیست، بیکران و میر نہر یست عظیم الشان ۔ در معلومات قواعد میر ا بر مرزا برتر ایست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری " اسی طرح ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات و عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا " کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے " اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں بزرگواروں کے طرز کلام کا فرق ان کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب قدرتاً حزیں اور غمگین واقع ہوئے تھے ان کی زندگی حزن ویاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ خودداری اور عزت کا ان کو بے حد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ عزلت اور تلخ کامی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر بھر تلخابۂ حیات پیتے رہے۔ بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے، خوشی اور ہشاشی بشاشی کا حصہ قسام ازل نے ان کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اس کے سودا نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے۔ وارستگی اور آزادی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر تھا، خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے ابلے پڑے تھے۔ خوشی کے مجمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے، جہاں ان کی قابلیت خداداد کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت فارغ البالی اور شادکامی سے بسر کرتے تھے۔ نظر بریں ان دونوں کی شاعری ان کے خیالات اور ان کے مزاج اور دنیا کے ساتھ اس کے برتاؤ کا بہترین آئینہ کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ان دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کئے ہوئے الفاظ بھی ان کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ درد و اثر کے لئے نہایت نرم اور سادہ و صاف اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلف ہونی چاہئے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ علی الخصوص چھوٹی چھوٹی بحروں کے لئے جن میں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروج کمال پر دکھائی دیتی ہے برعکس اس کے قصیدہ کے لئے شاندار الفاظ، علو مضامین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کہنا ایک پژمردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک حالات جن بے تکلف اور سیدھے سادے الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ میر درد اثر اور سادگی کے مسلم الثبوت استاد ہیں ان کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انہیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تخیل سے اس میں رنگ آمیزی مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی ایک درد و الم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور ان کے حسب حال

ہیں " حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیئے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں ۔"

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ موثر شعر وہی ہیں جن میں درد و الم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سا درد نہیں ۔ میر کے اشعار غمگین اور چبھیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں ان کا قصہ غم کا قصہ ہے وہ زندگی کا وہ رخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے۔ نہایت آب و تاب اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا اس کا دوسرا رخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے مملو ہے سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لئے سامان طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں ۔ ان کی طبیعت کسی محدود دائرے میں رہنا پسند نہیں کرتی ۔ وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولانگاہ اپنے اظہار خیال کے لئے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور ان کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزا دیتے ہیں جو انواع و اقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے ۔ انھوں نے انقباضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے ۔ میر کی دنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جس میں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی ان کے تمام اشعار ایک مقولہ کے تحت میں ہیں " جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے امید کو پیچھے چھوڑ آئے " میر کی ہنسی اور مذاق بناوٹی اور انکی طعن و تشنیع مصنوعی ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت ان اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہٰذا ناکام رہے ۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت و اقتدار کی بے پروائی کی وجہ سے ان اصناف سخن میں سرسبز نہ ہوتے انھوں نے اجگر نامہ ضرور لکھا مگر وہ سودا کی ہجووں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اسی طرح ان کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں سودا کے قصاید کے سامنے ہیچ ہیں۔

دونوں بزرگوار میر اور سودا حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں دونوں وہ کامل مصور ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوبصورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ ان کے لفظی مرقعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی، یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت دونوں کی ہو سکتی ہے ۔ پس جہاں تک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے ان کے اعلام و اظہار میں میر صاحب منفرد ہیں مگر ان کے سوا ہر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے ۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں ۔ ان کے مالہ اور ماعلیہ کا ان کو بدرجۂ کمال علم ہوتا ہے میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق خودی کی وجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس

وسیع النظری سے نہیں کر سکتے ان کی محدود نظری اسی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے وہ اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو اپنے کام میں اس قدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے خاص کام میں یکتائے زمانہ ہو گئے۔ وہ تنوع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں بخلاف میر صاحب کے جن کی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار جس کے پھول پژمردہ و افسردہ جن کی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی جائے پناہ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالۂ و زاری سے دل کی بھڑاس نکال جائے یا عالم خواب کی سیر کی جائے مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشاں ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا کی دنیا جیتی جاگتی دنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر جس کے باغ سرسبز و شاداب۔ جس میں باد صبا خوبصورت پھولوں اور نازک نازک پتیوں کے ساتھ ہر وقت اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی کی تو روح جان ہیں اگر استادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں سودا وہ استاد ہے جو ان کے صحیح استعمال پر قادر ہے اس کے یہاں دلچسپ تشبیہیں اور نادر استعارے میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں وہ ان مختلف علوم و فنون سے جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میر کے زیادہ واقف ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہوتی ہے۔ اس کی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت اس کو ایسے مضامین اور الفاظ سجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سودا کے اس قسم کے اشعار ان تو اعد کے ضرور خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو ان کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعرائے فارسی کی تتبع میں ہے جن کے قدم بہ قدم اردو شعرا چلنا چاہتے ہیں۔ نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف اور دیگر علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لئے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ اردو شاعری جو فارسی کی تتبع تھی۔ اس انقلاب سے اس نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخر الذکر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دل کے دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جس قدر ان

مضامین کی کثرت ہوتی ہے اتنی ہی درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نوآموز شعراء کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سوداؔ اور میرؔ دونوں موسیقیت الفاظ کے استاد ہیں۔ ان کے شعر سانچے میں ڈھلے ہوئے، بندش نہایت چست اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں۔ نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں استاد دور از کار تلمیحات اور تشبیہات سے بچتے ہیں اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے دونوں استادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کار آمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متعدد اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لئے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی متبذل اور فحش الفاظ استعمال ہوئے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیر و تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں۔ امرد پرستی جو اس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے کسی کا قول ہے اور سچ ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زمرد اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں پیچی کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے" [1]

اس عہد کے دیگر شعراء | اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور ان کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہٰذا یہاں ان کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر ان کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں [2]۔

---

[1] میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لئے دیکھو اگلے باب میں بقا کے اشعار

[2] اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصراً باب کے آخر میں بیان کیا گیا ہے

باب ۷

اساتذۂ دہلی

طبقۂ متاخرین

انشا اور مصحفی کا زمانہ

طبقات کی ترتیب اس دور کی ترقیاں: شعراء کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعراء ایک دور کے ماقبل کے دور کے بعض شعراء کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نوآموز تھے اور اس وقت انھوں نے کوئی شہرت حاصل نہیں کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کہن سال، مشاق اور مشہور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس دور میں بمقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی اس کی ترقی اور توسیع کے لئے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کئے۔ مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔

شاعری دربار سے وابستہ ہو گئی۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دور ماقبل کے شعراء گو اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے اس دور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعراء کی قدر دانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی عزت و آبرو کم ہو گئی شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں۔ شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم و ابرو ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہٰذا اشعار بھی انہیں کے مزاج

اور مذاق کے موافق کیے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہوگئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں پہونچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بدمزگی شعرا میں پیدا ہوگئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بدمزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہوگئی تھی۔ لہٰذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے اور ان کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوچ اور لپاڈگی کے درجہ تک پہنچ جاتے تھے چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی متانت اور پاکیزگی اور علو خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اس کی آئندہ ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہوگئی۔ شعر کی روحانیت اور بلند پروازی مفقود ہوگئی معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی مراد ہوتا تھا اب بجائے اس کے کوئی لونڈیا رنڈی، جن کی ایسے عیش پرست درباروں میں کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہواتی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش اُمرا اور ان کے مصاحبین اس قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں۔ گو کہ وظائف و تنخواہ وہ بھی پاتے تھے متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج اب تک باقی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی۔ شعر گوئی ایک مقدس اور معزز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجاناں، یہ سب اہل دل بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اس کے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہوگئی۔ اب شاعر ولی ہونے کے نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑ کر آئے تھے۔ کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اس زمانہ کے بگڑے ہوئے مذاق نے ان کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی ایک جدید صنف شاعری، یعنی ریختی، جس کو اس انحطاط مذاق کا بہترین نمونہ سمجھنا چاہئے اسی دور میں وجود میں آئی۔ اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کے

مدرسہ تعیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے تمام مدارج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بر تمام کمال طے کیا تھا۔ ان کا کلام عورتوں کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اس میں اور کچھ نہ تھا۔ انشا نے بھی بہت کچھ اس میں حصہ لیا۔

اس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزاولت سے شعرا نے من حیث الفن بڑی ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی شعر میں کم ہو گئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر دو ایک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو ان کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدیم کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا ان میں نام نہیں۔ اس عہد کے شعرا نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آئندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک خاص طرز بن گئی

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرا نے شاعری کو حصول زر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور وہ مباحث اب درباری مشاعروں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیماں شکوہ کے استاد تھے۔ انشا نے ان کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا باعث ہوا جس کا تذکروں میں بالتفصیل ذکر ہے۔ اس کی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ جھگڑا مچا کہ خدا کی پناہ! اُن کے مربی اس تھکا فضیحتی کا دُور سے تماشا دیکھتے تھے اور ان کے مہملیات کی داد دے کر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے۔ بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھ کر لاٹھی پونگے اٹھا لیے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریبان بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزت و آبرو کے درپے ہو گئے سچ پوچھیے تو اس قسم کی لغو اور بیہودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آ گیا اور مصحفی اور انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اس زمانہ کے پرشور مذاق اور جھگڑے کا ایک نمونہ رہ گئی ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اُردو اس موقع پر چند ہزل گویان اُردو کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری ہے حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ تیر اثل نارنولی۔ میر جعفر زٹل۔ زانی۔ چرکین۔ افسق میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زانی۔ یہ شخص بھی فرائن شفیق اور رنگ آبادی کے ہمعصر تھے اور شفیق نے افسق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے۔

انشا متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء عیسوی سید انشاء اللہ خاں تخلص بہ انشا خلف حکیم میر ماشاء اللہ خاں ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر تخلص کرتے تھے۔

زوال سلطنت کے زمانہ میں مرشد آباد گئے جو نوابان بنگالہ کا دارالحکومت تھا اور یہیں سید انشار کی ولادت ہوئی[1] ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کئے۔ شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے۔ انشا مرشد آباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دلی آئے[2] شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ ر۔ے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدرداں تھے انہوں نے انشار کی بڑی قدر کی دربار اس وقت لٹا پٹا تھا مگر پھر بھی اس قدرداں بادشاہ نے اس جواں ہمت اور جواں طبیعت شاعر کو نظر شفقت وعنایت سے دیکھا اور اس کو انعام واکرام سے مالا مال کیا۔ سید انشار اہل دربار میں داخل ہوئے اور انہوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور چٹکلے بادشاہ اور اہل دربار کو سنانا شروع کئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی جدائی بادشاہ کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ آخر کار دلی کی تباہی سے بددل ہو کر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں ان کی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ سے مناقشہ کی وجہ سے انشار نے لکھنؤ کا رخ کیا[3] جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعراء اور دیگر باکمالوں کا ملجا و ماوی بنا ہوا تھا۔

یہاں پہونچ کر انہوں نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیماں کی ملازمت اختیار کر لی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدرداں تھے[4] انشار نے اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے ان کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد ان کے قدیمی استاد مصحفی کی جگہ لے لی[5] مگر ان کی منچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقی کے نئے راستے ڈھونڈتی تھی۔

انشا کی تقریب نواب سعادت علیخاں کے دربار میں

تفضل حسین خاں علامہ[6] جو اپنی قابلیت اور حسن تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب سعادت علی خاں کے

---

[1] انشار کا سنہ پیدائش نامعلوم ہے قیاس ہے کہ وہ تقریباً ۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵ء میں پیدا ہوئے (لطائف السعادت ص ۱۰۳ مرتبہ [illegible])

[2] انشار مرشد آباد سے نکل کر سیدھے دلی نہیں پہنچے بلکہ وہ ۱۱۷۸ھ/۶۵-۱۷۶۴ء کے قریب اپنے والد کے ہمراہ مرشد آباد سے فیض آباد آئے جب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایا تو انشار باپ کے ساتھ یہاں چلے آئے بعد ازاں ۱۱۹۴ھ/۸۰-۱۷۷۹ء کے بعد دلی گئے (مرتب)

[3] انشار ۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ء کے بعد لکھنؤ پہنچے ہیں۔ (لطائف السعادت ص ۲۲) (مرتب)

[4] سکینہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انشار نے لکھنؤ پہنچ کر سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اصل واقعہ یہ ہے انشا ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ گئے۔ اور سلیمان شکوہ ان کے دو برس بعد ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ (مرتب)

[5] یہ بیان درست نہیں، اس کی وضاحت ترجمہ مصحفی کے حواشی میں ص ۴۵-۴۶ دیکھئے۔ (مرتب)

[6] وزیر علی خاں کی مسند نشینی اور بعد کو ان کے اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی انہیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاست داں تھے

(باقی بصفحہ آئندہ)

مشیر کار تھے۔ سید انشا ان کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے۔ خان علامہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب صورت حال ان کے لئے نکالیں۔ اتفاق سے ایک دن سید انشا جوشِ تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو دو معنیین تھا اور اردو میں اس کے معنی قابل اظہار نہیں۔ کہنے کو تو کہہ گئے مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ وہ زبان مارواڑی میں "بیوقوف" کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا "خیر خاں صاحب انداز معلوم ہو گیا جلد کچھ صورت ہو جائے گی"[1] دوسرے دن نواب سعادت علی سے ان کے خاندان کی بزرگی اور ان کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا کہ آپ کی صحبت میں ان کا ہونا شغل صغری و کبری سے بہتر ہو گا وہ سن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خان صاحب سید انشا کو لے گئے۔ انشا[2] نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ ان کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ ان کی حاضر جوابیاں۔ ان کے پُر مذاق لطیفے، ان کی ظرافتیں نواب کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ ان کو ایک دم بھی اپنے سے جُدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی۔ انشا اپنے مذاق اور دل لگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گزر جاتے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے ایسی باتیں اکثر موقعوں پر تو نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ نواب کے مزاج کا پارۂ حرارت ناپنے کے واسطے سید انشا بسا اوقات اچھے بیرا میٹر نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مزاج میں بھی اختلاف تھا۔ انشا کی آزاد طبیعت یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ موقع وبے موقع اور جا و بیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟" انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اُٹھے "بلکہ انجب" (انجیب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیونکر واپس کیا جا سکتا ہے۔ نواب کے دل کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو انشا کو زک دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت

ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہیں۔ سر آئزک نیوٹن کے ڈزنشل کلکولس کا ترجمہ انھوں نے فارسی میں کیا ہے۔

[1] سکسینہ نے یہ روایت آبِ حیات سے نقل کی ہے جو محض قیاس پر مبنی ہے حقائق یوں ہیں کہ علامہ تفضل حسین خاں نے ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء میں وفات پائی (قیصر التواریخ جلد اول ص۱۵۲) اور انشا بقول صاحب گلشن ہند ۱۲۱۱ھ تک سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ تھے انشا اس سنہ کے بعد ہی نواب سعادت علیخاں کے دربار میں پہنچے ہونگے جبکہ تفضل حسین دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ (مرتب)

[2] ماخوذ از آب حیات ۱۲۔

سزائیں اور تکلیفیں ان کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سوائے ہمارے کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی ان کے واسطے قید بے زنجیر تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ جوان لڑکا تعالی اللہ خاں[1] مر گیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ آخر میں ایک جنونی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی ایک عبرتناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آب حیات میں بیان کی گئی ہے[2]۔ اسی اثنا میں تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہنچ گئی تھی[3]۔ وہ شخص جو کبھی چہکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ

۱؎ تعالی اللہ خاں ۱۲۱۸ھ میں فوت ہوا۔ مرتب)

۲؎ سعادت یار خاں رنگین کی زبانی سید انشا سے جن چار ملاقاتوں کا حال آزاد نے بیان کیا ہے ان کی کوئی سند موجود نہیں۔ رنگین اور انشا کی زندگی کے واقعات خود اس کی تردید کرتے ہیں۔ رنگین آصف الدولہ کی وفات ۱۲۱۲ھ کے بعد لکھنؤ سے نکلے۔ مرشد آباد، ڈھاکہ، گوالیار اور دوسرے مقامات میں ملازمت اور سیاحت کے بعد ۱۲۳۲ھ میں باندہ پہنچے گویا انشا کا سعادت علی خاں کے دربار میں عروج اور زوال کے تمام مراحل رنگین کی لکھنؤ سے غیر حاضری میں انجام پائے۔ انشا کی موت ۱۲۳۳ھ کے وقت بھی وہ لکھنؤ سے باہر تھے اس طرح آزاد کی بیان کردہ چار ملاقاتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے آب حیات مرتبہ راقم میں ترجمہ انشا کے حواشی)

جہاں تک انشا کی دیوانگی کا تعلق ہے انشا کے نواسے مرزا ادرج نے اس کی تردید کی ہے۔ حیاتِ دبیر کے مصنف مرزا افضل ثابت لکھنوی لکھتے ہیں کہ انشا کی تنخواہ بند نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی وہ مجنون ہوئے تھے۔ بات صرف اس قدر تھی کہ نواب اودھ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ سید انشا اپنے مکان پر ہر وقت رہا کریں جب ہمارا چوپ دار جائے تو آجائیں (حیات دبیر) مگر یکتا دستور الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں مجنوں ہو گئے تھے۔

مولوی عبدالقادر رام پوری ۱۲۲۹ھ میں انشا سے لکھنؤ میں ملے تھے وہ اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ سہ مذکور کو میر عبدالعلی۔ حکیم مرزا علی اور انشا ان سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ (علم و عمل جلد نمبر ۲ ص) مولوی صاحب نے انشا کی دیوانگی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ معلوم ہوا ۱۲۲۹ھ تک وہ ٹھیک تھے۔ یکتا نے دستور الفصاحت میں لکھا ہے، کہ انشا "آخر آخر مجنون شدہ۔ چند سال گذشتہ بودند کہ بہماں مرض درگذشت" (دستور الفصاحت ص ۱) انشا ۱۲۳۳ھ کو فوت ہوئے۔ قیاس ہے کہ ان کی دیوانگی کا زمانہ ۱۲۳۰ھ تا ۱۲۳۳ھ ہوگا۔ (مرتب)

۳؎ دفعات قتیل سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا نواب سعادت علی خاں کے دربار سے ربیع الاول ۱۲۲۶ھ / مارچ ۱۸۱۱ کو معزول ہوئے۔ (دیکھئے (دفعات قتیل ص ۱، نول کشور ۱۲۸۰) (مرتب)

سنہ ۱۲۳۳ھ کا ہے۔ جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

خبرِ انتقال میرِ انشا	دل غمدیدہ تا نشاط شنفت
سال تاریخ او ز جانِ اجل	”عرفی وقت بود انشا“ گفت

ان کے کلام کی خصوصیات

انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو مدون کی اور حسبِ تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی۔ اس سے ان کا پایۂ استادی بلند ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر ان کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل اسناد ہے۔ ان کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اُردو کے بڑے پایۂ کے استاد سمجھے جاتے۔ انشا کی خاص خصوصیات یہ ہیں۔ (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں ان کا ہم پلہ شعرائے اُردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں۔ (۲) جامعیت ان کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا نگینہ جس کے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ (۳) علم و فضل۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسا پر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے پیش کرتے کہ حریف اس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طبّاع تھے اور اُن کی قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے اور ان دونوں زبانوں میں ان کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری۔ اور ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرضکہ ایک بہت زبردست اور قابل زباندان تھے تضمین بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت تیز و طرار طبیعت پائی تھی اور مشکل اور نئی نئی چیزوں میں ان کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے۔ بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں مثلاً واسع الشفتین یا ذو لسانین وغیرہ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت بھاتیں اور اس میں اپنی زبان دانی کی قوت دکھائی ہے ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے ہیں اور گو کہ بہت ہشیاری سے نظم کئے ہیں مگر کانوں کو برے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں۔ ظرافت اور مذاق جوان کا خاصا ہے بعض اوقات اس کی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور شعر

میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کی بجائے اس کو مُھس اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ اس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں ریختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشاء اور رنگین کو سمجھنا چاہئے۔ انشار کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ ان کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشار کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت ہمہ گیر طبیعت، ہر صنف شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق و ظرافت۔ انشا نے سودا کی طرح مگر ان سے کسی قدر محدود درجہ پر ہندوستان کی تخئیل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انہیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ صائب رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمواری نہیں ہے غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے شاید ان کی مشکل زمینیں اور قوافی ہوں۔ قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی برتتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے' نواب اور ان کے عیش پرست درباریوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اس زمانہ کا عیب ہے یہی حال عہد ریسٹوریشن کے انگریزی شعراء کا تھا۔ جن کا کلام اس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ انشا نے شعر کو اپنے نواب   خوشی کے ماتحت کر دیا تھا۔ وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں ہوئے۔ شاعری ان کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی ان کا کوئی اعلیٰ سطح نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام ان کو پہنچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر ان کو معقول سزا ملی جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام سے ملتے تھے اور ان کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی وہ ایسے زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہر طور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مرتبہ میں کسی سے کم نہیں ان کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے سید انشاء اور ان کی شاعری کے متعلق میاں بے تاب کا چبھتا ہوا جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ انشار کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی درباری نے ڈبویا۔ اگر کسی کو انشار کے مفصل حالات دلچسپ لطیفوں اور چٹکلوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آبحیات میں ان کا حال پڑھے۔

تصانیف ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

کلیات جس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں

(۱) ایک دیوان اُردو غزلوں کا جس سے زبان پران کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے۔ مگر ہمواری نہیں ہے۔ فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں، چست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہو گئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور نظم اُردو کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہیں۔

(۳) قصائد اُردو و فارسی۔ جو حمد و نعت اور منقبت ائمہ معصومین اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازک خیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گو زبان کا زور اور لطف بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخراپن ہے اور کچھ نہیں اگر اپنے رفیق طبیعی یعنی تمسخر کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ضبط سے کام لیتے تو ان کا پایۂ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے کہ کھیر (شیر برنج) میں نمک ڈال کر تصوف کو تمسخر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جس کی سرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً ''حمد'' کے موقع پر لکھتے ہیں کہ ''لوحہ در حمد مالک الملک'' ''نعت'' کے واسطے ''لوحہ در مدح سرورِ کل'' ''منقبت'' کے واسطے لوحہ مدح سوار دلدل'' بادشاہ کی تعریف کے لئے ''لوحہ در مدح حاکم عصر'' وغیرہ وغیرہ یہ سب سرخیاں موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونۂ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوحِ سالِ کلامِ مسطور

دُر دُر سلک کلام کردم کردم سال در ا محرّر	گہر دُر گہرم الٰہ گردم طور الاسرار ۱۲۱۳ و سطر گوہر

(۷) مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کے شکار و ہر بہرہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روزنامچہ کے لکھی گئی تھی۔ اس کی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں۔

قطعہ در تاریخ

فوج ظفر موج بایں عز و جاہ	گرد رسانید چو بر اوج ماہ
شوکتش انشا بخط زر نوشت	فقرۂ تاریخ مظفر نوشت

(۸) ہجویں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں۔ مکھیوں۔ مچھروں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ ہے۔

(۱۱) ایک مثنوی بزبان مارواڑی جس میں گیان چند ساہو کار کی ہجو ہے ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جس میں مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ بیان کئے ہیں

(۱۲) مائۃ عامل عربی بزبان فارسی۔

(۱۳) متفرق اشعار، معمے، رباعیاں، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، چیستانیں وغیرہ

(۱۴) دیوان بے نقط[۱]۔

کہانی ٹھیٹھ ہندی میں اس مضمون کے نام سے ایک کتاب[۲] نثر اردو میں لکھی ہے جس میں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو ہے۔ مقدار میں تقریباً ۲۵ صفحے ہوں گے۔ اس کے اکثر حصے ان کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ ولیم کلکتہ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا اس کو کئی جلدوں میں شائع کیا تھا[۳]۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے

[۱] ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید انشاء نے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کی دل چسپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے۔ آخر الذکر کا دریائے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس کا نقش اول ہو۔

[۲] رانی کیتکی کی کہانی۔ [۳] رانی کیتکی کی کہانی مختصر سی تصنیف ہے کئی جلدوں میں اشاعت درست نہیں (مرتب)

ایک راجہ تھا جس کا نام سورج بھان تھا اور اس کی رانی کا نام لچھمی باس تھا۔ ان کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہ ہی اس قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا۔ ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا رات ہو گئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک باغ میں اس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا جن میں راجہ جگت پرکاش ورانی کام لتا کی خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ مدن بان رانی کیتکی کی سہیلی اور ہمراز تھی۔ اس کے کہنے سے ان دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو اس کی حالت کیتکی کے عشق میں خراب ہو گئی۔ آخر یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا تو اس نے شادی کا پیام راجہ جگت پرکاش کو بھیجا جسے اس نے بڑی حقارت سے رد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک مالن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور خفیہ بھاگ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ رانی کیتکی کی غیرت نے اس کو قبول نہ کیا۔ جگت پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اس نے اپنے گرو مہندر گر جو کیلاس پربت دکوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی کمک پر بلایا۔ اس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان اور سورج بھان اور مہارانی لچھمی ہرن ہرنی بن گئے اور کئی برس تک یوں ہی رہے۔ چلتے وقت گرو نے راجہ جگت پرکاش اور اس کی رانی کو ایک شیر کی کھال اور ایک بھبوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا میں فوراً پہونچ جاؤں گا اور بھبوت اس لئے ہے کہ جو کوئی چاہے اس کا انجن لگائے وہ سب کو دیکھے اور اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب تھی۔ ایک روز چالاکی سے آنکھ مچولی کھیلنے کے بہانے اس نے بھبوت مانگی اور اس کو لگا کر رات کو نکل گئی۔ اس کی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتکی کی تلاش میں بھبوت لگا کر نکلی۔ ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مدن بان واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز راجہ جگت پرکاش ورانی کام لتا پر ظاہر ہو گیا۔ جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کھال کے بال سے مہندر گر کو بلایا اور کل حالات بیان کئے۔ رانی کیتکی اور اس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مہندر گر نے تلاش کر کے کنور اودے بھان اور اس کے ماں اور باپ کو ان کی اصلی صورت میں کر دیا۔ راجہ اندر نے بھی اس کام میں اس کی مدد کی اور آخر ش رانی کیتکی کی شادی بڑی شان و شوکت و تزک و احتشام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہو گئی۔

نمونۂ کلام یہ ہے :- اب اس کہانی کا لکھنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے - اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر موچھوں پر تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ راو بھاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے ۔ ٹپ ٹکا

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں		کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی		کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت پہلی کتاب قواعد اُردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اُردو کے متعلق لکھی ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۲۲ھ ہے - اس کی تصنیف میں مرزا قتیل بھی شریک تھے - انشا نے اس کا پہلا حصہ لکھا جس میں زبان اردو کی صرف و نحو کا حال ہے - اس میں اُردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کئے ہیں - طرز تحریر میں وہی ظرافت اور تمسخر ہے جو اُن کے دم کے ساتھ ہے - دوسرا حصہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے اس میں عروض و قافیہ، منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے - مرزا قتیل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لطف سے خالی نہیں - مثلاً تقطیع میں بجائے مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین کے پری خانم - پری خانم - پری خانم - پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول، مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خانم - بیجان پری خانم درج ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے - سید انشا پہلے شخص ہیں جنہوں نے زبان اردو کی اہمیت اور اردو کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا - انھوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور لفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں - انھوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اردو کی ترقی پر ڈالتی ہیں - قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے - اردو کے حروف تہجی اور ان کی آوازوں کو نظر تعمق سے دیکھا ہے - ان کی رائے میں مجموعی آوازوں کی تعداد ۸ ہے - زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوربی، مارواڑی وغیرہ کے نمونے دیئے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا اثر اُردو پر کس طرح پڑتا ہے - یہ کتاب اس وجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں بہت سے متروکات دے کر ان کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان کیا ہے - پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اس کے وہ قدیم اردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے -

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انشا من حیث الادیب اور نیز من حیث الشاعر بہت بلند پایہ رکھتے تھے ان کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشاق تھے چنانچہ ان کا ایک قصہ خمخانۂ جاوید جلد اول سے نقل کر کے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلص ایک شاعر تھا جس نے ان کی ہجو کہی اور خود لا کر سنائی تھی۔ انھوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپے دیئے یہ قطعہ بھی لکھ کر روپوں کے ساتھ ساتھ اس کے حوالہ کیا۔

فائق بے حیا چو ہجوم گفت	دل من سوخت سوختہ بہ
صلہ اش بہ پنج روپیہ دادم	دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

اس شاعر نے لفظ ید کو مشدد باندھا تھا۔ انشا نے اس کے جواب میں بطور تعریف کے جو قطعہ لکھا ہے۔ درج ذیل ہے۔

چو خوش گفت فائق شاعر غرّا	کہ چوں قہن او ذہن رسا نباشد
یکے شعر نادر کہ در چند وزن	شود۔ خوانده و شک بمعنا نباشد
دراں لفظ ید را بدال مشدّد	نوشتست و ایں غلط اصلا نباشد
تشدید ایں سخن را چو گرد سخن	ز انشا کہ ہمسرش اصلا نباشد
بگفتا کہ من شاعر خوش فکرم	چو من ہیچ مغلق گو با نباشد
تو گلستاں را ندانی درست	ترا ہیچ شعور و ذکا نباشد
سند یاو از استاد ست مارا	بکلام ما ہیچ خطا نباشد
چو تشدید در شعر ضرورت افتد	تشدید صحیح جدا نباشد

جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ)[1] جرأت تخلص۔ مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان اور سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت دربانی پر مامور تھے۔ دلی میں کوچہ رائے مان[2] انھیں کی طرف منسوب ہے۔ اور یہ نادر شاہی حملۂ دہلی ۱۷۳۹ء میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانۂ بچپن فیض آباد میں گزرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ دہلی سے بہت کم سنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی[3] چنانچہ خود کہتے ہیں۔

[1] جرأت کا سنہ پیدائش ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۳ھ کے درمیان۔ جرأت کا صحیح سال وفات ۱۲۲۴ھ ہے۔ (مرتب)

[2] گلی کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اس پر "کوچہ رحمن" لکھا ہے ۱۲

[3] جرأت ۱۱۸۰ھ میں نواب محبت خاں کے متوسلین میں شامل ہوئے انہی کے ساتھ ۱۱۸۹ھ میں لکھنؤ گئے۔ (مرتب)

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے۱؎ اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ ناسخ اور نساخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی تاریخ یہ ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے		گلشن فردوس کو جانا ہوا	
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا		ہائے ہندوستان۲؎ کا شاعر موا	

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے۔ افسوس ہے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی۳؎۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کو بہت طول دے کر لکھا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پُرلطف صحبت کا بہت دلدادہ تھا مگر پردے کے سبب سے شرفا اور امرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا آخرکار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق ان کو خلقی تھا۔ کبھی فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں

۱؎ جرأت سلیمان شکوہ کی سرکار میں ۱۲۱۵ھ/ ۰۱-۱۸۰۰ء میں نہیں بلکہ ۱۲۰۵ھ اور ۱۲۰۹ھ/ ۹۱-۱۷۹۰ء اور ۹۵-۱۷۹۴ء کے درمیان داخل ہوئے۔ قرین قیاس ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء ہے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی میں جرأت کی ملازمت کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ ہندی کا زمانہ تالیف ۱۲۰۰ تا ۱۲۰۹ھ/ ۸۶-۱۷۸۵ء اور ۹۵-۱۷۹۴ء ہے۔ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ/ ۹۱-۱۷۹۰ء میں لکھنؤ آئے اس طرح جرأت اس سنہ کے بعد ہی ملازم ہوئے ہوں گے۔ مصحفی نے سلیمان شکوہ کے جو حالات لکھے ہیں ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جرأت ۱۲۰۸ھ میں ملازم ہوئے ہوں گے۔ گلشن ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۱۵ھ تک ملازمت میں تھے۔ (مرتب)

۲؎ ہندستان بغیر واؤ کے پڑھنا چاہیے ۱۲۔

۳؎ جرأت کا بینائی سے محروم ہونے کا قطعی سنہ معلوم نہیں۔ بعض واقعات سے تعین کیا جا سکتا ہے کہ ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء اور ۱۲۰۰ھ/ ۸۶-۱۷۸۵ء کے درمیان وہ بینائی سے محروم ہوئے۔

(میر حسن اور ان کا زمانہ ص ۱۶۲) (مرتب)

لکھتے ہیں "دیوانۂ فن شعر است کہ گاہے بے فکرئی ماند۔ بسیار دردمند و گداز است"۔

تصانیف | ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان میں غزلیں، فردیات، رباعیات مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، واسوخت، تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مرثیوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں ان سے ۱۱۹۱ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں مثنویوں میں ایک ۴۰ صفحات اور دوسری ۳۲ صفحات کی ہے ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے دوسری مثنوی کا سن تصنیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام "حسن وعشق" اور اس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح دلپذیر لطف اور کلام نہایت نمکین و بامزہ ہے۔

جرأت کی خصوصیات اور ان کا مقابلہ میر کے ساتھ | جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری مشکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا۔ فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اس زمانہ کے ذی استعداد شعراء کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب کے دور چلتے ہوں اور حسن وعشق کے چرچے ہوتے ہوں۔ عاشقانہ رنگ بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اس میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض اوقات زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی سرحد سے مل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام مشابہ ہے کیونکہ دونوں غزال تھے۔ ان دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرأت کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرأت سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز و کرشمے۔ عشاق کی حرماں نصیبی، ہجر کی مصیبتیں۔ درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرضیکہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سوسائٹی کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے ان کی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو انہوں نے اختیار کیا اور اس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرز علیحدہ ہو کر مقبول عام ہو گیا مگر اس میں شک نہیں کہ میر میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے میر کا تخیل بلند اور ان کا عاشقانہ رنگ بہت اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے، جرأت کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ میر کے قدردان اہل دل سخن شناس اور جرأت کے دلدادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھئے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف اس کے جرأت ایک حریف ظریف، ہشاش بشاش خوش طبع آدمی تھے۔ ہمیشہ صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعۂ معاش اور طلب زر کا ایک ذریعہ وسیع آلہ سمجھتے تھے۔ اور شعر کے ذریعے سے اپنے

تیں اپنے مربیوں اور سرپرستوں کا ایک دلچسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور ان کے دل کو خوش کرکے ان سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے ان میں میر اور انشا کا ایسا علم وفضل اور قواعد شعر سے دلچسپی و واقفیت نہ تھی مگر پھر بھی ان کا ایک طرز خاص ہے اور ان کے کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام لوگوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جرات کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی رئیس اور شاعر جمع تھے جرأت نے جو غزل پڑھی اس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں۔ وہ از راہ تحتیر یا شوخی سے ہو جو کچھ سمجھئے، میر صاحب کے پاس آبیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی۔ میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کر لیا کرو" مختصر یہ کہ جرأت کا پایۂ شاعری بہت بلند نہیں۔ دربار کے توسل نے ان کو بھی مٹایا جیسا کہ انشا کو مٹایا تھا پھر بھی انشا کو ان کے علم وفضل نے بچالیا۔ ان کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظم اُردو کی ترقی میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اس پر آنکھیں بند کرکے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعوے صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں ہے۔

جرأت اور داغ نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی شاعروں میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

مصحفی (۱۱۶۴ھ؁[1] تا ۱۲۴۰ھ) شیخ غلام ہمدانی نام۔ مصحفی تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۰ھ میں دلی آئے جہاں تکمیل علوم کی اور شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے ان کو پڑھنے کا اس قدر شوق اور کتب بینی سے اس قدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھے جاتے تھے انھوں نے ۱۱۹۵ھ ہی میں شعرگوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ تذکرۂ میرحسن ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے[2]۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جن میں معزز شعراء مثل انشا اور میرحسن اور جرأت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہ کر مثل اور شعراء کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریر آرائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں انھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوگئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رہ کر

[1] سنہ پیدائش ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء زیادہ معتبر ہے۔ (مرتب)

[2] تذکرہ میرحسن کا زمانۂ تالیف ۱۱۹۱ھ/۷۸-۱۷۷۷ء تا ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء ہے تفصیل کے لئے حاشیہ صفحہ ۱۰۳۔

پھر دلی چلے گئے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش ان کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی[1]۔ آزاد کی تحقیق کے موافق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔ شیفتہ بھی اپنے گلشن بیخار میں جو سنہ ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو مرے دس برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ لکھتے ہیں۔ لہٰذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ برس کی ہوگی۔

تصانیف | مصحفی اُردو اور فارسی کے پر گو شاعر تھے سنہ ۱۷۹۴ء کے پہلے انہوں نے دو دیوان فارسی مرتب کئے تھے۔ ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں[2] اور دوسرا اپنی طبعزاد غزلوں کا مجموعہ ان کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی لکھے۔ ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں یہ دونوں دیوان چوری ہو گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مروج ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اردو شعرا کا فارسی زبان میں لکھا ہے شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں[3]۔

تذکرۂ شعرائے اُردو مصنفہ سنہ ۱۷۹۴ء | مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اُردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے۔ آٹھ اُردو دیوان ان کی یادگار رہ گئے ہیں۔ جن میں ہزارہا غزلیں، قطعے، قصائد

---

[1] سکینہ کا یہ بیان تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ پہلے بتاتے ہیں کہ مصحفی سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلی آئے۔ پھر کہتے ہیں کہ بارہ برس دلی میں رہ کر لکھنؤ گئے۔ گویا مصحفی پہلی بار سنہ ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ گئے۔ حالانکہ مصحفی خود لکھتے ہیں کہ وہ معرکہ سکرتال سنہ ۱۱۸۸ھ کے بعد لکھنؤ گئے تھے (تذکرہ ہندی صفحہ ۱۴۰) اس وقت شجاع الدولہ اودھ کے نواب وزیر تھے نہ کہ آصف الدولہ۔ اسکے بعد بتایا ہے کہ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں قیام کیا جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے سکینہ سمجھتے ہیں کہ مصحفی سنہ ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ آئے۔ اسطرح وہ ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس سنہ ۱۲۰۲ھ سے قبل کچھ دن رہے ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد یار خاں کا تو ذیقعدہ سنہ ۱۱۸۸ھ (جنوری ۱۷۷۵ء) کو انتقال ہو چکا تھا (فرح بخش قلمی مؤلفہ شیو پرشاد نسخہ پنجاب پبلک لائبریری) اس کے بعد بھی سکینہ نے مزید غلطیاں کی ہیں بتایا ہے کہ لکھنؤ کچھ دن رہ کر پھر دلی چلے گئے اور تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ دوبارہ چلے آئے۔ سکینہ نے بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ سنہ ۱۱۹۰ھ میں آمد دلی ظاہر کی ہے اور بارہ برس کا قیام ثابت کر کے لکھنؤ بھیجا ہے۔ اس طرح مصحفی بقول سکینہ سنہ ۱۲۰۲ھ ہی میں واپس دلی چلے گئے اور کچھ دیر رہ کر دوبارہ لکھنؤ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصحفی پہلی بار سنہ ۱۱۸۵ھ اور دوسری بار سنہ ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آئے۔ قیام دلی کا زمانہ سنہ ۱۱۸۶ھ تا سنہ ۱۱۹۸ھ ہے۔ وہ دلی ایک بار ہی سنہ ۱۱۸۶ھ میں آئے۔ (مرتب)

[2] اس دیوان پر احتشام حسین کا مضمون دیکھئے اردو اپریل سنہ ۱۹۶۰ء (مرتب)

[3] مصحفی کی یہ تصنیف نایاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کلیات مصحفی میں نثر فارسی کا ایک مجموعہ مجمع الفوائد ہے اس میں مندرجہ ذیل چھوٹے چھوٹے نثری رسائل شامل ہیں۔

(باقی بصفحۂ آئندہ)

وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعرائے اُردو جو زبان فارسی میں ہے ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر ہے[1] جو محمد شاہ کے زمانہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک تھے۔ انھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمائش پر لکھا گیا تھا یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں[2]

خصوصیات کلام سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زود گو تھے جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لئے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے۔ معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لئے رکھ لیتے تھے[3]۔ کہا جاتا ہے کہ اس زود گوئی یا پُر گوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا ہو گئی۔ کیونکہ پُر گوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت استاد تھے اور بڑے بڑے استاد ان کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ مثلاً میر مستحسن خلیق۔ ضمیر۔ آتش۔ شہیدی۔ عیشی وغیرہ۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعرا بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں کے شاگرد تھے ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ ان کو کسی سے فخر تلمذ حاصل نہ تھا مگر وہ بھی محمد عیسٰی تنہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے۔ اسی مائدۂ سخن کے ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا ہے اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استاد ان کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور شترگربہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے

نثر ہفت تصویر۔ خطبہ نشاط باغ۔ مفید الشعراء۔ رسالہ در فضیلت انسان بعضے جانوران۔ کشکول (چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ) مکتوب بطور پنج مکتوب ملا ظہوری در وصف دکان تنبول بہ تتبع ظہوری۔ (مرتب)

[1] اس تذکرہ کا نام "تذکرہ ہندی" ہے۔ اس کا عہد تالیف ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء تا ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء ہے۔ اس میں ساڑھے تین سو شعراء کا نہیں صرف ۱۹۳ شعراء کا ذکر ہے۔ مصحفی کے تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے جس کا عہد تالیف ۱۲۲۱ھ/۰۷-۱۸۰۶ء تا ۱۲۳۶ھ/۲۱-۱۸۲۰ء ہے۔ (مرتب)

[2] مصحفی کے آٹھوں دیوان خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں پانچ دیوان غزلیات اور تین دیوان قصائد ہیں۔ رام پور میں ۱۴ (بقول نورالحسن مرتب کلیات مصحفی) دیوان موجود ہیں۔ (مرتب)

[3] یہ روایت آزاد آب حیات میں بیان کی ہے۔ کسی معاصر شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اس لئے روایت مشکوک ہے۔ (مرتب)

ان کا کلام پاک ہے۔ ناسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجہ تکمیل پر پہونچایا مگر ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے۔ کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پروازی، کہیں فغاں کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی سادگی۔ کسی میں جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گو کہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور اور استادی نہیں پائی جاتی اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کہے ہیں مگر پھر بھی مذکورہ بالا استادوں کی وہ بات کہاں مختصر یہ کہ غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی آخر نباہ نہیں سکتا۔ یہی حال ان کے قصیدہ کا بھی ہے جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معنی کی بلندی تو ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند مثنویاں بھی لکھی ہیں[1]۔ جن میں ایک "بحر المحبت" "میر کی مثنوی" "دریائے عشق" کے رنگ میں بلکہ اس کی نقل ہے۔ قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی سے ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ملکی خصوصیات ان کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشاء سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں ریختگی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشاء کے معرکے

مصحفی اور سید انشاء کے معرکے نہایت مشہور ہیں جن میں مختلف ہجووں اور مذاق و تمسخر سے، جو بسا اوقات فحش کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبحیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اس کتاب کو دیکھنا چاہئے۔ یہاں مختصراً بمصداق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتدا اس واقعہ کی یوں ہوئی[2] کہ میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو ان کے سامنے ان کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غزلیں ان کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا۔ اسی اثنا میں ان کی تنخواہ بھی کم کر دی گئی جس کے متعلق ایک قطعہ لکھ کر انہوں نے شہزادہ موصوف کو گزرانا جس کے چند

---

[1] مصحفی کی کل مثنویوں کی تعداد بیس ہے۔

[2] سکینہ نے یہ روایت آزاد سے لی ہے جو غلط ہے۔ یہ بیان درست نہیں کہ مصحفی سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے اور بعد میں سلیمان انشا سے اصلاح لینے لگے تو تنازعہ پیدا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ (باقی بصفحہ آئندہ)

اشعار یہ ہیں ؎

چالیس برس ہی کا ہے چالیس کے لائق — تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ چالیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی تھے کسی روز وں میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر — ہوتا ہے جو در ماہہ کہ سائیس کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھونک ہوتی اور ایک دوسرے کا مذاق اڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا ؎

تھا مصحفی مائل بگریہ کہ پس از مرگ — تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اس شعر کو انشاء نے یا ان کے دوستوں نے الٹ دیا اور کہا ؎

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ — رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے ؎

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن — نے موے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر سید انشاء نے بہت سے اعتراض وارد کئے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ غزل کا مطلع ہے ؎

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن — رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اور قطعہ اس طرح شروع کیا۔

سن لیجئے گوش دل سے مری مشفقانہ عرض — مانند بید غصہ سے مت تھرتھرائیے
بطور گو درست ہو لیکن ضرور کیا — خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپائیے
دستور و طور و نوریہ ہیں قافیے بہت — اس میں جو چاہئے تو قصیدہ سنائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر — مردے کی باس زندوں کو لا کر سنگھائیے

اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں۔ جن میں مصحفی کے زبان دان ہونے پہ اعتراض کیا گیا ہے مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا اور انشاء کی غزل میں جو ان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پہ اعتراض جمائے۔ مثلاً

انشا سلیمان شکوہ کی سرکار میں مصحفی سے پہلے ہی ملازم تھے اور مصحفی خود ان کی وساطت سے سلیمان شکوہ کے دربار تک پہنچے تھے جیسا کہ انھوں نے تذکرہ ہندی صفحہ ۱۲ میں اقرار کیا ہے۔

تنخواہ کم ہونے پر قطعہ پیش کرنے والی روایت بھی آزاد نے بیان کی ہے۔ حالانکہ اصل حقائق یہ ہیں کہ یہ قطعہ مصحفی کے دیوان ہفتم میں شامل ہے جو ۱۲۲۴ھ/۱۰-۱۸۰۹ء کے بعد تصنیف ہوا اور مصحفی و انشاء کے جھگڑے زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء سے ۱۲۱۲ھ/۹۸-۱۷۹۷ء تک ختم ہو چکے تھے۔ مذکورہ قطعہ ۱۲۲۴ھ/۱۰-۱۸۰۹ء کے بعد کسی امیر کے متعلق کہا گیا ہے۔ (مرتب)

اے آنکہ معارض ہو مری تیغِ زباں سے تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک کا پتلا گر نور کا سر ہوئے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لئے وضع ہے نادان بیجا ہے خُمِ بادہ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ جھگڑ شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی پچ میں وہ وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کہ اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے اور آمادہ تھے کہ مار پیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشار کو اس کی پہلے سے خبر ہوگئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے بجائے ان لوگوں پر غصہ کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کے انھوں نے ان کی بہت خاطر و مدارات کی ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کئے۔ اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا۔ ایک پرتکلف بارات کی شکل بنائی جس میں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڈا اور ایک گڑیا ہاتھ میں ہلاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پرفتنہ مذاق سے لطف اٹھانے تھے۔ اکثر امرا نے خاص کر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا چنانچہ انھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہم پر بھی چوٹیں کی ہیں اور وہ ناراض ہوگئے تھے۔ مصحفی نے اس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے۔

قسم بذات خدا کہ ہے سمیع و بصیر کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ غمخوار قدیم حضور کی نسبت کوئی برا لفظ کہے یہ افترا سب انشا کا بنایا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے

منحرف کردیا ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی اور ساتھیوں کی بریت اور سید انشاء کی خطا ثابت کی ہے مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی بحیثیت شعر و شاعری ایک یادگار معرکہ ہے ہر چند اس میں خلاف تہذیب نظمیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور اس زمانہ کی ایک خاص یادگار ہے۔

رنگین سنہ ۱۱۶۹ھ تا سنہ ۱۲۵۱ھ[1] سعادت یار خاں رنگین طہماسپ بیگ خاں تورانی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد توران سے آکر چند دنوں لاہور میں حسین الملک میر منو خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اس کے بعد دلی آئے جہاں پیش گاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگین نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدرآباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشاء کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر ان سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے۔ اوائل عمر شعر کہنا شروع کیا اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا امیر آدمی کے لڑکے ہو تم کو شاعری نہیں آسکتی تمہارے لئے شہسواری ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا۔ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھلاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لیتے تھے[2]۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پریوشوں کے جھگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق، متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور کرم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ اسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے مگر شیفتہ اور گارسین ڈتاسی ان کی عمر اکاسی اور سن وفات بارہ سو پچاس بتلاتے ہیں۔

تصانیف (۱) "مثنوی دلپذیر" جس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے۔ اس میں شاہزادے ماہ جبیں اور رانی سری نگر کا قصہ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۱۳ھ ہے جیسا کہ جرأت اور انشاء وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) "ایجاد رنگین" یہ بھی ایک مثنوی ہے اس میں فحش قصے اور دلچسپ حکایات ہیں

(۳) چار دیوان جن کے علیحدہ علیحدہ نام "دیوان[3] ریختہ۔ دیوان بیختہ۔ دیوان آمیختہ۔ دیوان انگیختہ" ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "عنصر رنگین" ہے۔

---

[1] سنہ پیدائش ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء ہے (سعادت یار خاں رنگین ص۳۵) (مرتب)

[2] مصحفی سے صرف دیوان اول پر اصلاح لی تھی۔ (تذکرہ ہندی ص۱۰۱) (مرتب)

[3] ان دواوین کے سال ترتیب یہ ہیں۔ دیوان ریختہ ۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ء یہ دیوان جے نگر کے قریب

(باقی بصفحہ آئندہ)

(۴) "مثنوی "مظہر العجائب یا غرائب المشہور" اس میں بھی حکایتیں ہیں۔

(۵) "مجالس رنگین" یہ انکی بہت دلچسپ تصنیف اور اس میں اپنے زمانے کے شعراء کا حال لکھا ہے اور ان کے کلام کی تنقید بھی کی ہے

(۶) فرسنامہ مصنفہ ۱۲۱۰ھ اس میں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور ان کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۲۵ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۲۷ صفحہ غزلیات ۲۴ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰۰ شعروں کا ہے۔ دوسرا دیوان ۹۴ صفحہ کا غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بدچلن عورتوں کی جن کو وہ عروس شیطان لکھتا ہے۔ بول چال درج ہے۔

ریختی سے کیا مطلب ہے اور اس کی ایجاد کے اسباب

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دل چسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں۔ نساخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعراء علی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھے مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہمعصر تھے اور جن کا تخلص خالی تھا اور جن کا دیوان ۱۱۰۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اس کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ بخلاف معمولی اردو کے جس میں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشاء اور رنگین کے طرز کے جنکا دار و مدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھ کر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہوا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیال بیان

جنگ بائن میں ضائع ہوگیا۔ موجودہ دیوان دیوان ریختہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء۔۱ کا ہے۔ دیوان ریختہ (غزل ور غزل) ۱۲۲۱–۱۲۱۵ھ/۱۸۰۶–۱۸۰۰ء۔ دیوان آمیختہ (دیوان ہزل) ۱۲۳۰ھ/۱۵–۱۸۱۴ء۔ دیوان انگیختہ (دیوان ناری) ۱۲۳۰–۱۲۱۵ھ/۱۸۱۵–۱۸۰۰ء (سعادت یار خان رنگین صفحہ ۴۰) (مرتب)

ؔ رنگین کی تصانیف کی یہ فہرست نامکمل ہے۔ تفصیل کے لئے ڈاکٹر صابر علی خاں کی تصنیف سعادت یار خاں رنگین۔ دیکھئے۔

تک کر بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ ان دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے۔ بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لئے مخصوص ہیں جن کو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں۔ اکثر پرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں۔ پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کرلیں مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں لہٰذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اس کے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہیں اور اس کی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر ناآشنائی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کڈھب الفاظ ان کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید برآں ان میں چونکہ قدرتاً شرم و حیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ ان کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں جن کے نام لینے میں ان کو شرم و حیا مانع ہو یا وہم و خوف دامنگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ ان گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے اس فرق مذکورۂ بالا سے انشا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لئے فائدہ اٹھایا اور اپنی نو ایجاد طرز کا دار و مدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بداخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جب کہ لکھنؤ کے عیش پسند فرمانرواؤں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہوگیا تھا۔ شہر کے نوجوان امرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کی بجائے ان کو کھلم کھلا اور بلاخوف لومۃ لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی ان کے جذبات اور ان کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہئے مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود انشا نے بھی اس قسم کے فواحش کے برے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہے۔ بہر طور یہ طرز اس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اس کی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میر امن کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔ جان صاحب

نے اپنی تمام عمر اس خاص صنعت میں بسر کردی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ ہوجاتے تھے ۱۸۳۷ء میں وہ دلّی گئے تھے اور وہاں سے بتلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام ہے آخرکار رامپور میں نواب کلب علیخاں کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے اور یہیں رامپور میں کچھ اوپر ستر برس کے سن میں ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔

غرضکہ یہ صنعتِ شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق و ظرافت کے وہ اشعار جو دائرہ تہذیب سے خارج نہ ہوں عام طریقہ سے پسند کئے جاتے ہیں۔

شاعر شاہانِ دہلی
شاہ عالم ثانی
۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء

آخر زمانہ کے شاہانِ دہلی شعراء کے مربی بھی تھے اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے۔ مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ مضمون اقدس کے مصنف ہیں جس میں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہے۔ یہ مثنوی کا تاریخی نام ہے[1] جس سے ۱۲۰۱ نکلتے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۲۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے چنانچہ ان کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جس میں نمکحرام غلام قادر کے ظلم و ستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جانے کا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا۔ میر۔ نصیر۔ اعظم۔ انشاء۔ زار۔ ممنون۔ احسان اور فراق وغیرہ یہ سب ان کی سرکار کے دعاگو تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ
متخلص بہ سلیمان

شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی بغاوت کے بعد دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے[2] اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جوان بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب بہادر آصف الدولہ بہادر نے اخراجات کے لئے چھ ہزار ماہوار مقرر کر دیئے تھے۔ نواب سعادت علیخاں اور غازی الدین حیدر ۱۸۱۶ء تک ان سے جھک کر ملتے تھے اور نذریں دیتے تھے جب غازی تاج الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجۂ مساوات چاہی۔ شہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردی جنھوں نے سلطان مہر کا خطاب پایا مگر شوہر و بیوی میں ناموافقت رہی۔ ۲۰ سال لکھنؤ میں رہ کر کانگیج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے بعد میں اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کئی بار دہلی آئے ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے۔ شعراء کے بہت بڑے سرپرست تھے خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان ہیں۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد مصحفی اور

---

[1] تاریخ صحیح نہیں نکلتی اس سے صرف ۱۱۰۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲

[2] سلیمان شکوہ ۱۷۸۹ء میں دلی سے نکلے۔ رامپور اور مراد آباد ہوتے ہوئے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں لکھنؤ پہنچے۔ (مرتب)

انشا کو کلام دکھایا[1] دہلی سے جو باکمال لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیرانہ سے پیش آتے۔ لکھنؤ میں مشاعرے کرتے مصحفی۔ قتیل۔ انشا۔ میر حسن[2] سب اسی سرکار کے مصاحب تھے۔ ان کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانۂ جاوید کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی
۱۸۰۶ تا ۱۸۳۷ء

ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے ۱۸۰۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔ ظفر نے تاریخ کہی ہے

پے سال وفات گفت ظفر		عرش آرام گاہ عالی قدر	

موزوں طبع تھے اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے۔ فکر سخن کی طرف توجہ کم تھی لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ میر نظام الدین ممنون، غالب علی خاں سید، شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے۔

بہادر شاہ ثانی
متخلص بہ ظفر

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۷ء میں معزول ہو کر ملک برہما میں جلاوطن کئے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اُس میں صرف کرتے تھے چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ استاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے استفادۂ سخن کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا ان کی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف دلی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ بھیجے تھے انھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر ان کی شہرت کی اصل بنا ان کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان ان کے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس قدر مقبول ہیں کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں کہہ کر دیتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں ان دونوں استادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ ان کی بہت سی غزلیں ان کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق و غالب سے بالکل علیحدہ ہے معلوم نہیں کہ

---

[1] سلیمان شکوہ نے مصحفی کو کلام نہیں دکھایا تھا۔ اس کی تردید کی جا چکی ہے۔ (دیکھئے حاشیہ ترجمہ مصحفی۔ (مرتب)

[2] میر حسن سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ رہے۔ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں لکھنؤ آئے جب کہ میر حسن ۱۲۰۱ھ/۸۷-۱۷۸۶ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ (مرتب)

ظفر نے بحالت قید بھی مشغلۂ شعر و شاعری جاری رکھا تھا یا نہیں اغلب ہے کہ یہ دلچسپ مشغلہ ان سے نہ چھوٹا ہو اور کچھ ان کا اس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو۔ کیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آئندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزیدار سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو ان کے مصائب کی اصل تصویر ہے۔ ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحریں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں رنگین اور جذبات دل نشین ہوتے ہیں۔

اس دور میں مذکورۂ بالا شعراء کے علاوہ اور بھی شعراء گزرے ہیں جو اگرچہ اس پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائمؔ۔ قاسمؔ۔ حسرتؔ۔ منتؔ۔ نسون وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعرائے دورِ سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہ گیا تھا۔ مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قائمؔ چاندپوری[1] شیخ قیام الدین نام تھا۔ بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاص کر قطعات اور رباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغہ توپ خانہ تھے۔ شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے۔ انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کمیاب ہے[2]۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے اس کے بعد رامپور گئے جہاں ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا[3]۔ ان کی نسبت مصحفی لکھتے ہیں "در پختگی کلام و چستی مصراع غزل در رویہ و قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ و تتبع بروش استاد رہ می رفت در بعضی مقام رجحان می جست" اور مرزا علی لطف اپنے تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں "مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو طور گویائی اس سخن آفرین کا نہایت مرغوب ہے"۔

منتؔ میر قمر الدین منتؔ دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایۂ عاطفت میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا

---

[1] پیدائش تقریباً ۱۱۳۸ھ - ۱۱۳۵ھ/۲۶-۱۷۲۵ء - ۲۳-۱۷۲۲ء (مقدمہ کلیات قائمؔ) (مرتب)

[2] تذکرہ مخزن نکات کا ایک ایڈیشن مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا تھا اب ایک نیا ایڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا ہے جسے ڈاکٹر اقتدا حسن نے ترتیب دیا ہے۔ مخزن نکات ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) میں مکمل ہوا مگر اس میں ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء تک اضافے ہوتے رہے۔ (مرتب)

[3] دلی کی تباہی کے بعد قائمؔ ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء یا ایک دو سال بعد یہاں سے نکلے اور اپنے وطن چاندپور چلے گئے نواب محمد یار خاں امیر کی رفاقت میں ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء میں تھے انتقال کا صحیح سال ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء ہے۔ (مرتب)
(مقدمہ مخزن نکات مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)

فخرالدین رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کی اور مشورۂ شعر و سخن میر نورالدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے
بہت پر گو شاعر تھے ایک کلیاتِ تخمیناً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد مثنویاں تصنیف کیں جن
میں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی ہے[۱] چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دریں عمر دہ مثنوی گفتہ ام		بہ آئین طرز نوی گفتہ ام	
چو اشعار من در عدد میرسد		شمار قصائد بعد میرسد	
بود شعر من در غزل سی ہزار		ز پانصد رباعی گرفتم شمار	

دلی چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی جو ان کو کلکتہ لے گئے اور
مارکوئس آف ہسٹنگز کے روبرو ان کو پیش کیا۔ لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا ان
کی مدح میں ان کے اکثر قصائد ہیں۔ سنہ ۱۲۰۱ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر ان کو حیدر آباد بھیجا۔
وہاں پہنچ کر حضور نظام کی مدح میں انہوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام و اکرام پایا بعد
واپسی حیدر آباد عظیم آباد میں مہاراجہ شکیٹ رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رخ کیا۔
جہاں پہنچتے ہی ۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے		ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم
	ولہٗ	
آہ اب کثرت داغ غم خوباں سے مدام		صفحۂ سینہ پہ از جلوۂ طاؤسی ہے
	ولہٗ	
گر اس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں		عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوات سناؤں

ممنونؔ[۲] میر نظام الدین ممنونؔ خلف میر قمر الدین منتؔ۔ ان کے آباؤ اجداد سونی پت کے رہنے
والے تھے مگر ان کی ولادت دلی میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پایا۔ اکبر ثانی نے ان کو فخر الشعراء کا خطاب
عطا کیا[۳] اکثر لوگ ان کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں بحیثیت صدر الصدور رہے تھے مگر پھر دلی آ گئے جہاں سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال
کیا خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی گرامی چھوڑے۔ مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ

---

[۱] شکرستان، مثنوی نہیں، فارسی میں نثری حکایات کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری
لاہور میں موجود ہے۔

[۲] پیدائش ۱۱۷۶ھ اور ۱۱۸۰ھ کے درمیان (صحیفہ نمبر ۲۸۔ مضمون میر نظام الدین ممنونؔ)

[۳] فخر الشعراء کا خطاب اکبر ثانی نے نہیں دیا۔ بلکہ یہ خطاب شاہ عالم ثانی نے دیا تھا (دیکھئے
مجموعۂ نغز حصہ دوم ص ۲۱۲) (مرتب)

وغیرہ ان کا دیوان کمیاب ہے۔ اس کے دیکھنے سے ان کی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی | مرزا جعفر علی نام حسرت تخلص، ابوالخیر عطار کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے[1] اور ابتداً عطاری کا پیشہ کرتے تھے شعر سے ان کو فطری ذوق تھا اور اس فن میں انھوں نے کمال حاصل کیا جب شاہ عالم ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعرا کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہو گئے جب نمک حرام غلام قادر نے بدنصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کر کے لوٹ مار و بیگمات شاہی کی بے حرمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا تو اس عبرتناک منظر کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت ان کی ایک درد انگیز نظم ہے۔ حسرت دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا آپ نے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں انھوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی ہے جس میں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدت، پانی کی قلت، سست رو گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ فیض آباد پہونچ[2] انھوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے ان کی تہنیت میں ایک دوسرا قصیدہ کہہ کر ان کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آگئے اور یہاں گڑھیا پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرأت بھی اپنے استاد کے پاس رہنے لگے اور یہ دونوں شاگرد و استاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی پر کیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حسرت سب سے پہلے مرزا احسن علی خاں بہادر کی رفاقت میں تھے اس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے۔ مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امرا کے لئے مخصوص تھی۔ اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور انھوں نے ان کے چڑھانے کے لئے بہت سی ہجویں کہیں اور تمسخر کے اشعار لکھے۔ سودا

---

[1] پیدائش ۱۱۵۰ھ / ۳۸-۱۷۳۷ء کے لگ بھگ ہے۔ (قاضی عبدالودود معاصر ح ۱ ص ۱۵۱) (مرتب)

[2] یہ حقائق تاریخی طور پر غلط ہیں۔ سکسینہ کا خیال ہے کہ حسرت دلی سے اس وقت نکلے جب شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔ شاہ عالم کی آنکھیں ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ / اگست ۱۷۸۸ء کو نکالی گئی تھیں (Twilight of the Mughals P-27) اس کے بعد سکسینہ نے بتایا ہے کہ حسرت فیض آباد پہنچ کر شجاع الدولہ کی سرکار میں وظیفہ خوار ہوئے۔ حالانکہ شجاع الدولہ کا سال وفات ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء ہے اصل حقائق یہ ہیں کہ حسرت نے حملہ درانی ۱۱۷۴ھ کے بعد دلی چھوڑی تھی اور فیض آباد میں تقریباً ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء کے بعد آئے تھے جب ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ / اگست ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کی آنکھیں نکالی گئیں تو وہ لکھنؤ میں تھے۔ لکھنؤ پہنچنے کا قطعی سن معلوم نہیں۔ مبتلا نے ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء میں انہیں لکھنؤ کے مشاہیر شعرا میں بتایا ہے (گلشن سخن ص ۱۱۳ مرتبہ مسعود حسن رضوی) قیاس ہے کہ آصف الدولہ نے (باقی بصفحہ آئندہ)

نے بھی اس میں حصہ لیا۔ خود حسرت نے لکھنؤ کے ایک حکیم کی ہجو لکھی ہے جس میں اس کے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے۔ ان کو شاہزادۂ سلیمان شکوہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے وہ رائے سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد بکثرت تھے۔ چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "کثرت شاگردانش چناں ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران ست ان سب میں جرأت اور نواب محبت خاں محبت بہت نامور شاعر ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۶ھ میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے [1] تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں اور دو دیوان غزلوں کے ہیں [2] غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پہ لکھتے ہیں

قدرت [3] شاہ قدرت اللہ قدرت میر شمس الدین فقیر کے برادر عزادہ تھے اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے [4] ۱۲۰۵ھ میں مرشد آباد میں انتقال کیا۔ میر ان کی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور ان کو "عاجز سخن" لکھا ہے مگر میر حسن نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں "سمند نطقش در میدان فارسی و ہندی چالاک و چست و تصویر بینظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست بندہ ویرا یک بار در مشاعرہ لکھنؤ دیدہ ام" اسی طرح مرزا علی لطف بھی ان کے بہت مداح ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے		اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابر تر آیا شاید تہ مژگاں کوئی لخت جگر آیا
	ولہ	
مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی		آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا
	ولہ	
سینہ اس کا ہے دل اسکا ہے جگر اسکا ہے		تیر بیداد جدھر رخ کرے گھر اسکا ہے
	ولہ	

جب مرکز سلطنت فیض آباد سے لکھنؤ تبدیل کیا تو یہ بھی ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ پہنچے ہوں گے۔ (مرتب)

[1] صحیح سال وفات ۱۲۰۶ھ/۹۲-۱۷۹۱ء ہے (حاشیہ دستور الفصاحت اور مقدمہ کلیات حسرت)

[2] کلیات حسرت ستمبر ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے لکھنؤ سے شائع کیا ہے جو ۹۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں حسرت کی تصویر بھی ہے۔ (مرتب)

[3] قدرت اللہ قدرت م ۱۲۰۵/۹۱-۱۷۹۰ء (گلشن ہند ص ۱۹۵) (مرتب)

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں لاب	گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے	اب وداع ننگ ہے اور رخصت ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	کیا ہی ملک روم ہے کیا سرزمین روس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجئے زندگی	اس طرف آواز طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور	شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے	چل دکھاؤں کیا تو اپنی آز کا محبوس ہے
لے گئی اک بارگی گور غریباں کی طرف	جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے	یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج	کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہن جام مے یہ خرقۂ سالوس ہے!

بیدار میر محمد علی عرف محمدی متخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد بھی تھے فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین علیہ رحمتہ کے مریدوں میں تھے۔ آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے۔ جہاں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے ہمعصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں۔

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن		جی سے نہ ترے غبار نکلا
	ولہ	
تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار		گل جدا، سرو جدا نرگس بیمار جدا
	ولہ	
بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی		صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا
	ولہ	
چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو		جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپنا
	ولہ	
ربط جو چاہیئے بیدار سو اس سے معلوم		مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت ہدایت اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے ۱۲۱۵ھ

میں انتقال کیا۔[1] صاحب دیوان ہیں اور بقول مرزا علی لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کمالات شاعری کے معترف ہیں

فراق | حکیم ثناء اللہ خاں متخلص بہ فراقؔ ہدایت اللہ خاں ہدایت مذکورہ بالا کے بھتیجے تھے۔ کسب فن اور کسب باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے۔ مشاہیر عصر میں سے تھے اور دلی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے۔ مصحفی اور میر حسن نے ان کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انھوں نے تحصیل طب کی اور جب میں شاہجہاں آباد میں تھا تو مجھ سے اور ان سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

ضیا | میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی سوداؔ کے معاصر تھے۔ دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ متخلص بہ راجہ اُن کے شاگرد ہوئے۔ پٹنہ ہی میں انتقال کیا۔[2] میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معترف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامقبول را دلہا ساختن کار اوست" میر حسن ابتدا میں انہیں کے شاگرد تھے۔ ان کو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا، صرف غزل کو پسند کرتے تھے۔ جیسا کہ میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں		ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں
کسی دشمن کی بھی یارب نہ گزرے شب جدائی کی		کہ جیسے اس سے میرے وصل کا اک دن گزرتا ہے
	ولہ	
راز دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں		بات منھ پر آ رہی ہے لب ہلانا منع ہے
	ولہ	
اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے		یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے
	ولہ	
کون سے زخم کا کھلا ٹانکا		آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا!

کل کی رسوائی بھی کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچہ میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا

---

[1] سال وفات ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء شیفتہ نے لکھا ہے۔ خوب چند ذکا، (عیار الشعراء) اور سرور (عمدۂ منتخبہ) ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء لکھتے ہیں مؤخر الذکر شیفتہ سے قدیم ہیں اس لئے اول الذکر شہادت سے زیادہ قرین قیاس ہیں (مرتب)

[2] صحیح سال وفات معلوم نہیں

(باقی بصفحۂ آئندہ)

بقا ۔ شیخ بقاء اللہ اکبرآبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ پر توطن اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں حزیں اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا۔ میر و سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر چوٹیں چلتی تھیں چنانچہ جب ان کے دوآبہ کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انھوں نے جل کر کہا ؎

اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو		میر نے گر ترا مضمون دو آبے کا لیا
اور بیتی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو		یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کر دے

اک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ؎

اور بستی نہیں یہ دلی ہے		پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور مشغلوں میں اس طرح دکھایا ہے ؎

بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی !		میر و مرزا کی شعر خوانی نے
اے بقا ہم نے جب زیارت کی		کھول دیوان دونوں صاحب کے
ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی		کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن

یعنی ایک کے کلام میں روکھی پھیکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض ظرافت و تمسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال کا شوق کیا تھا اس سے ان کا دماغ خراب ہوگیا۔ آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر ۱۲۱۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔

حزیں[۱] ۔ میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ بزرگ استاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا		جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں

مصائب روزگار سے تنگ آکر دلی سے پٹنہ عظیم آباد پہونچے وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔ ایک دیوان یادگار ہے جس میں قصائد اور غزلیں اور ردیف وار موجود ہیں۔ دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیئے جاتے ہیں۔

دل میں میرے وہ اضطراب نہیں		کچھ کہا شاید اس نے قاصد سے
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو		حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ

۹۶-۱۱۹۳ھ/ ۸۱-۱۷۸۰ء کے لگ بھگ فوت ہوئے۔ (مرتب)

[۱] سال وفات تقریباً ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء۔ (مرتب)

دلبروں کے دیکھنے میں بھی مرا ناچار ہے		ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح پر ایک

بیان خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مولانا فخرالدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی۔ ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے "استاد از جہاں رفت" میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کے بڑے معترف ہیں لکھتے ہیں "شاعر عذب البیان اند خوش گو بیان زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذۂ مرزا مظہر جانجاناں... نمیچ نامہ از د مشہور است بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" نمونۂ کلام یہ ہے۔

سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا		کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا		مصلحت ترک عشق ہے ناصح
کانوں تلک تو اس کے تو لے نارسا پہنچ		کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ آپ مجھ کو اپنی آہ پر

صاف منھ پر میں نہیں کہتا کہ ہو گا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میرا جس کے پاس

اک بغل میں مکاں ہو بس میں ہوں اور تو ہو		کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں ہی		وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تم سے ہمنشیں
تغافل کے قرباں تجاہل کے صدقے		بیاںؔ کون ہے اب تلک پوچھتے ہو
ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی		جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی

راسخ شیخ غلام علی راسخ شاگرد میر ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے[1] شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اشرف کو کلام دکھلاتے تھے[2] مگر آخر میں باقاعدہ طور پر میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب ان کا بڑا خیال کرتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، دلی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں بہت زور شور سے شروع کر دیا۔ چھتر برس کی عمر پا کر ۱۲۳۸ھ یا ۱۲۳۴ھ میں وفات پائی[3] زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف

---

[1] قاضی عبدالودود کی رائے میں ۱۱۶۲ھ/۴۹-۱۷۴۸ء محض اختراع ہے۔ صحیح سال ولادت معلوم نہیں ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہونا قرین قیاس ہے۔ (ہماری زبان ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء تبصرہ "دلی کا دبستان شاعری") (مرتب)

[2] ڈاکٹر ممتاز احمد نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اشرف کو کلام دکھانا محض بے بنیاد ہے۔ (مثنویات راسخ صفحہ ۹۳) (مرتب)

[3] صحیح سال وفات ۷ رجمادی الاول ۱۲۳۸ھ/۲۱ جنوری ۱۸۲۳ء ہے۔ راسخ کے ایک شاگرد انور علی یاس نے (باقی صفحہ آئندہ)

صاف و سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ رنگین شعر بھی بہت ملتے ہیں۔ جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے[1]

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکزی شاعر لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے

شاعری کا مرکز ترقی دلی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آگیا۔ اس کے اسباب مختصراً یہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصرِ سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازۂ حکومت بکھر گیا اور درختِ اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ درّانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی۔ بدبخت اور نمک حرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور ان کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سیندھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی۔ چنانچہ ان کے اس دردناک قصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں لکھا تھا۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

شاہ تیمور[2] کہ دارد سر نسبت با من	زود باشد کہ بباید بمددگاری ما
مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من است	ہست مصروف تلافی ستم گاری ما
راجا و راؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر	حیف باشد کہ نسازند بہ غم خواری ما

قطعۂ تاریخ وفات لکھا جس کا مصرع ہے ع "دل من گفت" ہے ہے استادم "۱۲۵۴ھ" (مثنویات ناسخ ص۹۵) (مرتب)

[1] ناسخ نے بہت سی مثنویاں لکھی ہیں جنہیں ڈاکٹر ممتاز احمد نے مرتب کر کے پٹنہ سے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

[2] تیمور شاہ والیٔ کابل ان کے بہنوئی تھے ۱۲۔

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند   چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امرائے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بدامنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے وہ شاعر جو سلطنت کے دامن سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسن، انشاؔ وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا[1] جو اس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دلی کو اہلِ لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں، وظائف و انعام و اکرام مرحمت ہوئے اور ان کی نازک مزاجیاں اور بدمزاجیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انہیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعراء کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا مگر سچ پوچھیئے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ داران شعر آزاد مزاج اور خود دار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی مگر مابعد کے زمانہ میں جب کہ شعراء اپنی عزت و آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت بُرے نتائج سرزد ہوئے مرتبۂ شاعری پست ہو گیا۔ شعراء نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا۔ مثال کے لئے میرؔ و سوداؔ اور انشاؔ و مصحفیؔ کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں اصحاب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے تھے۔ وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں کرتے تھے۔ برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ درباری کے اثر سے متاثر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رنگینی

لکھنؤ کا طرز شاعری | اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دلی والوں نے روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انھوں نے پھیلایا۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی

---

[1] شعرا کے لکھنؤ پہنچنے کے سنین۔

میرؔ اوائل ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء

سوداؔ ۱۱۸۸ھ / ۷۵-۱۷۷۴ء (اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۱ء تنقید بر آب حیات پروفیسر شیرانی)

میر حسن ۱۱۷۸ھ / ۶۵-۱۷۶۴ء یا اس کے بعد پہنچے۔ (میر حسن اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۲۳)

انشا ۱۲۰۲ھ / ۸۹-۱۷۸۸ء (لطائف السعادت صفحہ ۲۴۶) (مرتب)

نہیں تھے لکھنؤ کے مستقر الخلافت ہو جانے اور شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت آجانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا اور شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے۔ سودا کے بلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے ان کو طلب کیا اور ایک خوبصورت حیلہ سے انھوں نے اس کو ٹال دیا۔ شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ اُمرا اور رؤسا اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے۔ عمدہ اشعار پڑھ کر اور سن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے ان کے دل بڑھتے تھے اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سر سبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں سکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جُدا جُدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور نُدرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور ان کے بعض مشہور شاگرد بھی ان کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے۔ یہاں تک کہ زمانۂ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرزِ دہلی اور طرزِ لکھنؤ کا فرق اور ان کا تقابل

طرزِ دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پُر اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے۔ تخییل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ اور متبعین نے بر خلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کر دی یعنی الفاظ کی مصوری ایک نئے اسلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ منتخب کئے جو کسی پہلو سے مراعات النظیر میں شامل ہو سکتے تھے مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کئے جاتے دوسرے الفاظ گو کتنے ہی مناسب اور موزوں ہوتے مگر ان کو جگہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کر دیا جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی ایسے الفاظ ڈھونڈے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ سے وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دار و مدار رہ گئی۔ اور الفاظ کے قربان پر درد و اثر

جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھادی گئیں اور اس کمی کو اغراق، غلو اور دور ودراز کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی اور وہ روح کے اہتزاز کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی۔ اس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوشنما گھروندا ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ انھوں نے غور سے کیا۔ صائب کی طرح مثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اُردو میں آکر وہ محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھندا بن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخئیل پرانے شعراء کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ لکھنؤ کا طرز شاعری دماغ کو تو متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اس کا وہی حال ہے جیسا کہ انگریزی میں پوپ اور اس کے تبعین کی شاعری کا ہے جس میں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد واثر مطلق نہیں۔ جس سے گو دماغ لطف اندوز ہوتا ہے۔ مگر دل کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے۔ پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جدت پسند طبیعتیں ان سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تمسخر انگیز ہو گئی۔ بے مزہ اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل بھر گیا اور اب وہ انیس و دبیر کی جادو نگاری اور غالب و مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ہر دور کی شاعری اس وقت کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں کا کلام اس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی غزلوں سے اس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دلی والوں کے یہاں نہیں ہے۔ دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفی اور جرأت کی نکالی ہوئی تھی اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بدمزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ جس کی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور ان کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا۔ یہی لوگ اصطلاح میں زباندان کہلاتے ہیں۔

رشک ۔ بحر ۔ سحر ۔ منیر ۔ جلال ۔ برق ۔ واجد علی شاہ اختر ۔ اسیر ۔ وغیرہ یہ سب لوگ الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے استعمال کئے جائیں ۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے تھے ۔ اس چھان بین اور دقتِ نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیئے گئے اور لغاتِ شعریہ بہت کم رہ گئے ۔ اسی وجہ سے زبان میں ایک گرختگی پیدا ہو گئی کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کئے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی ۔

اس جدید طرزِ لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے ۔ لکھنؤ کے شعراء اور عوام الناس نے بھی بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقۂ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے ۔ نیز یہ کہ اُن کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہیں ۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہونچ گیا اور تذکیر و تانیث میں فرق کیا جانے لگا ۔ یعنی بعض الفاظ جو اہلِ لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں اور بعض جو وہاں مؤنث ہیں وہ یہاں مذکر بولے جاتے ہیں یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے اس کی ابتدا امیر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی ۔ ان کے بعد سے یہ قضیہ اب تک چلا آتا ہے اور دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔

شیخ امام بخش ناسخ[1]
متوفی ۱۲۵۴ھ
مطابق ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ زبان اُردو کے بہت بڑے شاعر اور طرزِ لکھنؤ کے موجد تھے ۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمّی خدا بخش خیمہ دوز نے جو لاہور کا ایک دولتمند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا ان کو متبنیٰ کر لیا تھا ۔ اس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے ان سے محبت کرتا تھا ۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی متبنیت کو غلط ٹھہرا کر ان کو اپنے بھائی کا غلام بنایا ۔ رفتہ رفتہ کچھ مصالحت کی صورت پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہونچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا ۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ مثلاً

---

[1] سالِ پیدائش نامعلوم اندازاً ۱۱۸۰ھ/۷۲-۱۷۷۳ء (مرتب)

(۱)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص و عوام
وراثت ہونا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام
میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو
حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں جو لکھنؤ میں ایک بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں ان کو کس سے تلمذ تھا مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میر کے پاس بغرض شاگردی گئے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاولت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر استاد مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے۔ جن میں سے اکثر مرتبۂ کلام میں ان سے کم نہیں ہیں ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا بڑے فن ورزش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے اُن کے حریف اور بامذاق لوگ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اٹھتے۔ ورزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے۔ اس کے بعد قریب بارہ بجے کھانا کھاتے اور تھوڑی آرام کرتے۔ سہ پہر کو وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی اس واسطے کہ باوجود شاعرانہ بددماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے اُمرا اور رئیس ہوتے تھے خود کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدر دانوں کی قدرشناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ ان کو دیا تھا۔ وہ انھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انھی کے یہاں ہے چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا انھوں نے تاریخ کہی ؎

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب
نہ زر و سیم نہ بد مس مجمل آمد بیروں

بہرِ تاریخ مسیحی چو بریدم سرِ دزد	دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

اس سے ۴ کے تخرجہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے۔ وجہ یہ تبلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف ان کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے۔ ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار گزرا اور یہ کہہ کر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہان دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریزی کا ایسا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لے کے کیا کروں۔ اس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چند روز قیام کیا یہاں راجہ چندولال دیوان سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن نے ان کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کی قدر و منزلت کی جائے گی۔ وطن کی محبت سے انھوں نے اس قدر دور و دراز جانے سے انکار کیا۔ مشہور ہے ایک مرتبہ اور انھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جس کے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کئے تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے۔ مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو ان کے سرپرست اور قدردان آغا میر کے دشمن تھے ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اب کی مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے۔ آخر کار حکیم مہدی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۸ھ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہ کر ۱۲۵۴ھ ہجری میں انتقال کیا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی ہے

	ولا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے	

تصانیف | ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ ہجری ہے۔ اس کا نام دفتر پریشاں رکھا۔ اس میں غزلوں رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ لطیف علی الترتیب ۱۲۴۶ھ اور ۱۲۵۴ھ ہے[۱]۔ ان کے دیوانوں میں جو تاریخیں ہیں وہ اس لئے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعراء اور دیگر مشاہیر کا سن وفات معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی

---

[۱] ناسخ کے دواوین کی اصل ترتیب یہ ہے

پہلا دیوان ۱۲۳۱ھ/۱۶-۱۸۱۶ء میں مرتب ہوا۔ "دیوان ناسخ" اسکا تاریخی نام ہے۔ دوسرے دیوان کا نام دفتر پریشاں ہے جس سے ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء برآمد ہوتے ہیں۔ یہ دیوان الہ آباد میں پریشانی کے زمانے میں مرتب ہوا تیسرے دیوان کا نام انکے شاگرد میر علی اوسط رشک نے "دفتر شعر" رکھا اسکی ترتیب ۱۲۵۴ھ/۳۹-۱۸۳۸ء کو دی گئی۔ کلیات ناسخ کا پہلا ایڈیشن ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ (مرتب)

قصیدہ نہیں کہا[1]۔ ان کے کلام میں قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے۔ ہجو[2] اور مذاق کا پتہ ان کے یہاں نہیں۔ ان کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا نام "نظم سراج[3]" ہے، جو تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۵۲ نکلتے ہیں یعنی اس سال ان کے شاگرد رشک نے ان کی وفات کے بعد اس کو شائع کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر

شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور رہیں۔ ایک ان کی قادر الکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انہوں نے ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جن کو اپنے بعد وہ چھوڑ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلّم الثبوت استاد تھے جن کو زبان اردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ شعر کی آرائش ظاہری کا حقہ کرتے تھے۔ لکھنؤ کے حلقۂ شعراء میں ان کا بہت بڑا اثر تھا اور اب تک کسی متنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و میر کے زمانہ کی یادگار رہ گئے تھے۔ ان سے اجتناب کرتے تھے۔ برخلاف ان کے مصحفی زمانہ قدیم کے بہت بڑے متتبع تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے انہوں نے الفاظ کی تلاش و جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بدنصیبی سے کہیں کہیں ایسے مغلق اور ثقیل الفاظ فارسی و عربی داخل کرنا چاہے جو غزل کے شایاں نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں

ان کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثانوی کے ان کے یہاں اصلی غرض ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت

---

[1] سید مسعود حسن رضوی "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" میں لکھتے ہیں کہ ان کے کتب خانہ میں ناسخ کے کئی فارسی قصیدے موجود ہیں۔ (مرتب)

[2] آب حیات میں ڈھونڈھ کے ایک تاریخ نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال معلوم ہوتا ہے میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا۔

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منھ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا (مؤلف)

[3] صحیح نام سراج نظم ہے (مرتب)

کی بہتات میں شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلیں صائب اور مرزا بیدل کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں ان میں پائی جاتی ہیں۔
ناسخ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں ؎

غیرِ کوثر کسی دریا کا میں سبّاح نہیں
بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سیّاح نہیں

ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا
دادرس کوئی بجز خالقُ الاصباح نہیں

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰؑ مار پر

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

کیونکر اے ناسخ خمارِ نجف دشمن نہ ہو خوار
کیسے موسیٰ کا علی شیرِ خدا یاور ہوا

معمولی کلام کا انداز یہ ہے۔

روئے جاناں کا تصور میں جو نظّارا ہوا
دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا

وہ مہِ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا
اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا

محفلِ مے میں جو آیا تو برائے مے کشی
تھا جو شیشہ جوشِ مے سے ایک فوارہ ہوا

چشمِ بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا

شب ہوا سے ہل گئی جو اس کی زلفِ عنبریں
دم میں دم شمع سارا عنبر سارا ہوا

پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ بلا
پیٹھ پہ بارِ گنہ کا جمع پشتارا ہوا

دور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں
ہاتھ میں جامِ مۓ گل رنگ انگارا ہوا

جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پُتلا نور کا
حوض میں روشن برنگِ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں تاریخ گوئی میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے بعض تاریخیں بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً کسی نے ان کے خطوط چرائے تو کہا ؎

سیاہ ہمچو قلم باد روئے حاسدِ من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا ؎

صد حیف تلف چار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ؎

شدہ نوشتہ وزیرِ من بامر ورز

جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ؎

	صبح طالع شد بر آمد آفتاب	

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو انھوں نے تاریخ کہی ؎

افتاد حکیم از وزارت از جائے حکیم ہشت بر گیر		تاریخ بطرز نو رقم کن سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

قصیدہ نہیں کہا تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی درحالیکہ اس کی ترتیب میں ورود اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی بلکہ ان کا شوق شکوہ الفاظ کا اس کا ممد و معاون ہوتا ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی فطری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چاپلوسی کی اجازت نہ دی ہو وہ تصوف سے بھی بیگانہ ہیں ان کے بعض اشعار جو صوفیانہ کہے جا سکتے ہیں ان میں بھی خود انھیں کا رنگ رنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح ظرافت کا بھی کہیں ان کے کلام میں ذکر نہیں۔ ان کی ہنسی بناوٹی ہوتی ہے اور مذاق بھس پھسا۔ کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے،

نقائص کلام کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پر ان کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا ان میں پتہ نہیں۔ ان کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں دھڑکتا۔ نہ اس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے۔ اشعار پھس اور بے لوچ ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں۔ تصنع اور تکلف فارسی تشبیہات جو اُردو کا جامہ پہن کر بد نما ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی متعلق الفاظ جن کی اُردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ظاہری آرائش کو مقدم سمجھنا معمولی اور پست خیالات کا بے موقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرقہ کا بھی الزام ان پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کارنامے ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے مگر غور سے دیکھئے تو اس تغیر شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا مگر انھوں نے اس کی ابتدائی اور اپنے کلام میں اس کو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اس زمانہ کے ایک متموّل اور بارسوخ رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور ان کی سرکار میں مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے۔ ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ اور دل میں

لہ اس کی تردید کی جا چکی ہے۔ دیکھیے۔ حواشی صہ ۱۶۸ (مرتب)

جوش بڑھ گیا۔ غرضکہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے ان میں سے بعض یہ ہیں لفظ اُردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دلّی میں عرصہ تک وہی پرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جن کی ردیفیں الھری۔ مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ نہیں۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تغیر کیا۔ مثلاً آئے ہے۔ جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں۔ دکھائیاں وغیرہ ترک کر دیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلّی کی زبان کا بہت ممتاز فرق تھا جو ابھی تک کسی قدر باقی ہے۔ نا مہذب اور فحش الفاظ جو بعض تذکار کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کر دیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا۔ الفاظ کا استعمال مقرر کیا ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو ان کے زمانہ میں عمل میں آئے "تذکرۂ جلوۂ خضر اور شعر الہند" میں دی ہوئی۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی عمل درآمد پر مجبور کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے ان سب تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا۔

شاگرد | ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔
وزیر۔ برقؔ۔ رشکؔ۔ بحرؔ۔ منیرؔ۔ قمرؔ۔ نادرؔ۔ آبادؔ۔ طاہرؔ۔

برقؔ | فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برقؔ، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے۔ بادشاہ کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی۔ چنانچہ جب انتزاع سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جہاں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر انکا ان کے حسب حال ہے۔

	برقؔ جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کر اُٹھے	

برقؔ شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار ان کے عالی خاندان اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز ان کے اخلاق و سیر چشمی کی وجہ سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ پرگو شاعر تھے اور اپنے استاد ناسخ کے متبع تھے ان کے کلام میں بھی مثل ان کے استاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ ہے ایک ضخیم دیوان چھپا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں۔ ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت موثر و درد انگیز ہیں اور بحر ان کے

دو مشہور شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ولہ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

ولہ

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی
اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

ولہ

آتا نہیں قرار دل بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

بحر[1] | شیخ امداد علی بحرؔ شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخؔ کے ہمنام کے بیٹے تھے۔ عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گزری۔ آخر عمر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور ان کی سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں پچھتّر برس کی عمر میں سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ ان کے دیوان کی ترتیب ان کے دوست نواب سید محمد خاں رندؔ شاگرد آتش نے کی[2] ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اس قدر تصنع اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف اور سلیس اور پُر اثر بھی ہوتے ہیں صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے استاد تھے۔ ناسخؔ اور رشکؔ کے بعد لکھنؤ کے دورِ متوسط کے شعراء میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاص کر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف و سادہ اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں۔

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ولہ

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

ولہ

مدت سے التفات میرے حال پر نہیں
کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

ولہ

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں
دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

[1] پیدائش ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۰ء تقریباً (مرتب)

[2] بحر کا دیوان رندؔ نے ۱۲۵۲ھ میں مرتب کیا تھا جس کا تاریخی نام ریاض البحر ہے ۱۲۸۵ھ میں مطبع مصطفائی سے شائع ہوا (مرتب)

ولہ

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی	پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح !

آباد | مرزا احمدی حسن خاں متخلص بہ آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے ۱۲۲۸ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے نوابان فرخ آباد سے سلسلہ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بڑا شوق تھا مقررہ اوقات پر اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے۔ پر گو شاعر تھے۔ دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں۔ جن میں سے ایک دیوان موسوم بہ "نگارستان عشق" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن" جس میں ناسخ و آتش کی ہمطرح غزلیں جمع کی ہیں۔ بہت مشہور ہے جس سے ان دونوں استادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں البتہ کہیں کہیں کوئی پھڑکتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ محمد وزیر | خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلہ خاندان ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی۔ فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے۔ سو روپیہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر ۱۲۷۰ھ[1] میں وفات پائی منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادۂ تاریخ خوب نکالا ہے۔

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کر کے شائع کیا اور اس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے ۱۲۶۳ فصلی مطابق ۱۲۷۱ھ اس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ ان کے بہت شاگرد تھے جن میں سب سے مشہور فقیر محمد گویا ہیں۔ خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے استاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے محبوب شاگرد یہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر	زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے	اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

---

[1] ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ/جولائی۔ اگست ۱۸۵۴ء (در شہپارۂ تاریخ اردو ص ۵۴۲) (مرتب)

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو ۔۔۔ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ولہ

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے ۔۔۔ فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

ولہ

نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بیحد پر ۔۔۔ الٰہی تجھکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج ۔۔۔ یہ ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

رشک میر علی اوسط رشک[1] میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن فیض آباد تھا مگر ان کی نشوو نما لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں ان کی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے مشہور شاگرد تھے۔ زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ" پر مبنی ہے جو زبان فارسی میں ہے۔ اور اُردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اس میں کی گئی ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے وہ ان کی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو[2] دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ) ہیں۔ رشک کا بھی وہی رنگ ہے جو ان کے استاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں۔ رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے بات بات پر تاریخ کہتے تھے اپنے بعد انہوں نے بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں منیر مشہور ہیں۔ منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے مگر ان کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الٰہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے استاد کے زمانے میں بھی اس بات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں معمولی باتیں کہتے اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے۔ مثلاً ہم آپ میں آئیں

[1] رشک ۱۲۱۲ھ/ ۹۸-۱۷۹۷ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ (ہماری زبان ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء مقالہ رشک لکھنوی از سلیمان حسین)

[2] رشک نے اپنے یہ دونوں دیوان ۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ نے حاجی محمد حسین کے اہتمام سے چھپوائے تھے۔ دیوان اول حرفی میں اور دیوان دوم حاشیہ پر۔ اس کے علاوہ دیوان سوم ۱۲۷۰ھ میں مکمل ہوا تھا رشک کربلا چلے گئے اسلئے شائع نہ ہوا۔ اس دیوان کے تین قلمی نسخے کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اور ایک نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ہے۔ ہماری زبان علی گڑھ ۱۵-۲۲ مارچ ۱۹۶۷ء مقالہ رشک از ڈاکٹر سلیمان حسین) (مرتب)

گے تو وہ آئیں گے آپ ہی۔ (آپ ہی)

دل ہی جائیں سراغ درِ دل دار ملے گا

بہت پرگو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ، "لگاؤ۔ تاؤ" وغیرہ ہے۔ چونکہ قافیہ مشکل تھا انھوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں ۔

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

پرزوں میں دستخط کروں کیا حال
ایک دو تین چار تاؤ نہیں

گنگ کو بحرِ غم سے کیا نسبت
یہ وہ دریا ہے جس میں ناؤ نہیں

ایکی جاڑے ہیں اور نالہ و آہ
اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں

چاول الماس گوشت لختِ جگر
فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں

میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب
پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں

ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبائے
بارِ غم پہ مرا دباؤ نہیں

یہ زمین غزل وہ ہے اے رشک
جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا اس کی کمی کسی ظریف نے پوری کر دی اور خود انھیں کی طرف منسوب کر دیا۔

دور سے پھپھڑے دکھاؤ نہیں
رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ مہر سنہ ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان اصفہانی کے نونہال تھے۔ ان کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ ان کے دادا مرزا مراد علی خاں بعہد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوئے۔ وہ کسی زمانہ میں رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا مشہور ہے کہ ان کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے۔ جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو خود انھوں نے زانوئے شاگردی ناسخ کے سامنے تہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہو گئے۔ سنہ [illegible] میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنار گڑھ ضلع مرزاپور کے منصف ہوئے چنانچہ ان کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

از بسکہ سوزِ ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالت العالیہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں چند انگریزوں کو انہوں نے پناہ دی تھی جس کے صلے میں خلعت فاخرہ اور ڈوگاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرے آگئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹی بھی کی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں ان کے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔

مہرؔ مذہب امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی مثلاً غالبؔ انیسؔ۔ دبیرؔ۔ غلام امام شہیدؔ۔ صباؔ۔ منیرؔ وغیرہ چنانچہ غالبؔ کے اکثر خطوط ان کے نام اُردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو ان دنوں آگرہ میں ٹھہرے تھے ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

تصانیف | مہرؔ کی اکثر تصانیف زمانہ غدر میں تلف ہوگئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں

(۱) دیوان اُردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "مخیالات مہر" (۱۲۸۶ھ) اس کو ان کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شائع کرادیا ہے۔

(۲) "پیرایۂ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔

(۳) "ایاغ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) "مثنوی داغ نگار" جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) "داغ دل مہر" واسوخت۔

(۶) "مثنوی شعاع مہر" ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی جس کی تعریف مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ "تنبیہ عشرت" "ضبط انتظام" "ہمدم آخرت" "بیان بخشایش" "عید قیصریہ" "پنجۂ مہر" "توقیر شرف" اور کچھ نظمیں بھی ان کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پُرگو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے۔ دوسرے درجہ کے شعراء میں مہرؔ کا مرتبہ بلند ہے ان کے کلام میں سلاست و روانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے۔ بعض اشعار ان کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پُرلطف ہوتے ہیں۔

منیرؔ | سید اسمٰعیل حسین متخلص بہ منیرؔ[۱] خلف سید احمد حسین شادؔ شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں انہوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کئے ہیں۔

---

[۱] کلیات منیرؔ سے معلوم ہوتا ہے کہ منیرؔ ۹ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ/ ۲۲ نومبر ۱۸۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ (مرتب)

پہلے ناسخ سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے۔ پھر کانپور میں جب وہ نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ ان سے ملنے گئے اور شاگرد ہو گئے اور انھی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور ان کی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور الٰہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے۔ یہاں کی دلچسپیاں ان کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا ذکر ان کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہوئے اور ان کے کلام کو اصلاح دینے لگے۔ لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجمل حسین خاں کی فرمائش سے فرخ آباد گئے۔ جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں مہاراجگان دھولپور اور الور نے بھی ان کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر انھوں نے باندے میں ملازمت کرلی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی[1]۔ بالآخر بعہد نواب کلب علی خاں رامپور میں قیام کیا اور یہیں کی خاک میں ۱۸۸۱ء میں آرام کیا[2]۔

تصانیف تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) "منتخبات عالم (۲) تنویر الاشعار (۳) نظم منیر۔ مثنوی معراج المضامین" جس میں ائمہ معصومین کے کشف و کرامات بیان کئے ہیں انھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُرگو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ مرثیے میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے قصیدے بڑے زور دار کہتے تھے اور قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے استاد ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہئے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخئیل ہے۔ قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے۔ مختصر یہ کہ منیر کا مرتبہ اس زمانے کے شعراء میں بہت بلند ہے۔

آتش متوفی ۱۲۶۳ھ ہجری خواجہ حیدر علی آتش خلف خواجہ علی بخش دلّی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلّی چھوڑ کر فیض آباد

[1] منیر نے قید سے رہائی پر جو نظم لکھی تھی، اس کے مطابق وہ ۹ صفر ۱۲۸۲ھ / ۴ جولائی ۱۸۶۵ء کو رہا ہوئے۔ (مرتب)

[2] وفات ۱۳ اگست ۱۸۸۰ء بمرض ہیضہ (اخبار دبدبۂ سکندری ۱۶ اگست ۱۸۸۰ء بحوالہ معاصر نمبر ۲۔ (مرتب)

آئے[1] اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن آ گیا۔ نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اس زمانے میں مصحفی اور انشاؔ کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے[2] اس کو دیکھ کر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے۔ ناسخ اور انشا کی طرح ان کی استعداد علمی درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

ناسخ اور آتش کے طرز زندگی میں بھی مثل ان کے کلام کے بیّن فرق تھا۔ آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا وہ حسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے مگر اس میں بھی بانکپن کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی۔ کبھی کسی امیر کی اس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔ اسّی روپیہ ماہانہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ معالیخاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضع داری اور خود داری تھی اُمرا سے بہت نوک کی لیتے تھے لیتے تھے مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوتے تھے۔ آخر میں ان سے اور ان کے استاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا اصلاح لینا بند کر دی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے رہتے تھے ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانبداران ناسخ دوسرا طرفداران آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں استادان سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دے کر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے پر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر انشاؔ اور مصحفی کی طرح دائرۂ تہذیب سے باہر

---

[1] صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ڈاکٹر وحید قریشی نے بعض حقائق کی رو سے ۱۱۹۲ھ اور ۱۲۰۰ھ کے درمیان ثابت کی ہے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۱ کلاس نمبر ا صفحہ ۱)

ایک اور محتاط تخمینہ کے مطابق آتش کی پیدائش ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۷ھ کے مابین بیان کی ہے۔ (اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۱ء تبصرہ مقدمہ کلام آتش صفحہ ۹) (مرتب)

[2] محمد تقی خاں ترقی ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ منتقل ہوئے اور مصحفی و انشا کے مقابلے ۱۲۰۸ھ تا ۱۲۱۲ھ کے دوران ختم ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ جب آتش لکھنؤ آئے تو مصحفی و انشا کے مقابلے ہو رہے تھے۔ (مرتب)

نہ ہوتے تھے اس قسم کے دو چار شعر نمونتاً لکھے جاتے ہیں

ناسخ ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بومسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اس پر آتش نے کہا

آتش ؎

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

آتش نے ایک مرتبہ کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسفؑ بکے غلام نہیں

مگر باوجود اس کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی ؎

خواجہ حیدر علی اے وا مردند

طرزِ کلام | کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنع اور تکلف مطلق نہیں، نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہِ الفاظ سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات، کو نہایت موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ غوق البھڑک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزے دار اور روزمرہ کی بول چال ہے جس میں ابتذال نہیں ہے۔ شعر بآسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں۔ تلاشِ الفاظ بہت قابلِ تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک و صاف ہے۔

تصانیف | پہلا دیوان خود انہیں کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا[1]۔ انھوں نے سوائے غزل کے اور کسی صنفِ شعر

[1] آتش کے دونوں دیوان ان کی زندگی میں ۱۲۶۲ھ میں لکھنؤ سے مطبع محمدی میں طبع ہو کر شائع ہو گئے تھے۔

(باقی بصفحۂ آئندہ)

میں طبع آزمائی نہیں کی۔

نقائص کلام | بعض کوتاہ نظر لوگ انکے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ ان کے یہاں فقط زبانی باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں پختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ ان کی بے استعدادی کا نکالتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً المضاعف بجائے المضاعف، حلوا بجائے حلوائے، بیدود بجائے بیدود، کفارا بجائے کفارہ، بتشدید فا مطالع بجائے مطالعہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ مروجہ کے مطابق ان الفاظ کو استعمال کیا اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوچ کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھرمار کر دی۔

ناسخ اور آتش کا مقابلہ | دونوں زبان اُردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے، اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا اس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالبؔ اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے ہیں[۱] اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت موثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت

دیوان اول کے دو سو پچاس صفحات تھے اور دیوان دوم کے ۷۰ صفحات تھے۔ (مرتب)

[۱] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں آتش کے حال میں جو ان کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے۔ جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی فرماتے ہیں "مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم انجاست۔ قریب ہم انگارند و ہر دو را ہموزن شمارند و قباحت ایں تحقیق لایخفی علی من لہ حظ من الفہم"۔ اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً ان کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق ان کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں "دیوانے دیگر از افکارش نگارش فراہم آمدہ و ہم در شہر رسید اما خاطر آسودگی جو از انتخاب آں بازایستاد" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔ ۱۲

[۲] مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے یہ قطعہ نقل کیا ہے۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار	زیک جام اند در بزم سخن مست
و لے با بادہ بعضے حریفاں	خمارِ چشم ساقی نیز پیوست

(باقی بصفحۂ آئندہ)

اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزے دار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ ان کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے آتش کے اشعار چست ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور ان کا کیرکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اس میں مطلق نہیں ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔

شاگرد آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔ رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب مرزا، شوق اور آغا حجو شرف۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں	اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا
قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری	خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست
اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے	دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست
مشتاق درد عشق بھی جگر بھی ہے دل بھی ہے	کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ
کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں	در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس
رخسار زرد پہ مرے بہتے ہیں اشک خوں	یکجا دکھا رہے ہیں خزان و بہار رنگ
یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں	مے اُلفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں
پر کترتا ہے مرے صیاد تو کاٹ اس طرح	حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ
باغ میں آئے ہو ساتھ ان کے بھی پھر لو دو گام	کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو
ہنسنے والا نہیں ہے رونے پہ	ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا	زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے	زمین سے دب گئے دبتے جو آسماں سے تھے

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس "چیزے دگر" کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ "ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں" ۱۲

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ	قناعت بھی بہارِ بےخزاں ہے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے	ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی	دو قدم ہیں راہ طے ہے شوق منزل چاہیئے
افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی	سر پھوڑ کے مر جایئے اس کوہ کنی سے

رند نواب سید محمد خاں متخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق (ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے) اس واسطے بہو بیگم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھلاتے اور وفا تخلص کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو گلدستۂ عشق کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے اور دربار اودھ کی مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ اپنے استاد آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادۂ حج روانہ ہوئے مگر راستہ میں بمقام بمبئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں گذرتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے۔ غرضکہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور	میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ تیرا

ولہ

پھینک دیں گے ہم چیر کے پہلو اپنا	تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ولہ

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں	تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کرو

بنال بلبل اگر با منت سرِ یاریست	کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست	(حافظ)
اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم	تو عشقِ گل داری من عشقِ گل اندامے	(سعدی)

او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے	انگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آئے

ولہ

دو چار گام یاں سے ہے دولتسرائے دوست	ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھیو تو آکر کہاں تھکے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے طبیعت کو ہوگا قلق چند روز	گزرتی ہے جو کچھ گزر جائے گی ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

خلیل میر دوست علی متخلص بہ خلیل سید جہاں علی کے صاحبزادہ تھے اور بدولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے۔ بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق تھا۔ شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔

نسیم پنڈت دیاشنکر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور عین جوانی کی حالت میں ۱۲۶۰ھ میں بعمر ۳۴ سال انتقال کیا۔ فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بعہد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے ان کو شعر و سخن سے شوق تھا چنانچہ اکثر اساتذہ اردو و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف مثنوی گلزار نسیم مثنوی میر حسن کے جواب میں ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر استاد کے کہنے سے انہوں نے اس کو مختصر کر دیا اور اب یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ اور سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ہے اس وقت مصنف زندہ تھے اور اس کی اشاعت سے دفعتاً ان کی شہرت ہوگئی۔ اس کا ایجاز، روانی، مناسبت الفاظ، برجستگی محاورات نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنیع ضرور ہے اور اسی وجہ سے اس کی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ مثنوی سحر البیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جدا ہے۔ یہ مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں اس سے پنڈت دیاشنکر کا نام ہمیشہ کے لئے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں

صبا میر وزیر علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ وطن تھا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا

نشو و نما ہوا۔ ان کے چچا میر اشرف علی نے ان کو بیٹا بنایا تھا اور انھوں نے ہی ان کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور ملنسار اور بڑے یار باش آدمی تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور ان کی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار محسن الدولہ نواب کے یہاں سے ملتے تھے خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ ان کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہو گیا ہے جس کا نام غنچۂ آرزو ہے۔ ایک مثنوی "شکار نامۂ واجد علی شاہ" بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کے کلام میں تصنع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ کبھی کبھی کوئی تڑپتا ہوا شعر اپنے استاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں۔

آغا حجو شرف | میر سادات حسین خاں نام عرف آغا حجو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سمدھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولیعہد کے خسر تھے۔ غدر کے بعد اودھ کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج میں ولی عہد کے ہمراہ تھے۔ اتفاق سے ولی عہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا طرز کلام وہی ہے جو لکھنؤ اسکول کے شعرا کا ہے یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں دل چسپ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جہان میں حسن پرستوں کی جان لینے کو چمک چمک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ	نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوبرو کیا کیا چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
زبان جو ان کی شرف نشہ میں بہکتی ہے	مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا
پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا	قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی	پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا
رما کے دھونی جو بیٹھا ہوں مانگ پہ اسکی	اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے | تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں ایک مختصر فہرست ان تغیرات کی دی ہے جو ناسخ اور آتش اور نیز ان کے شاگردوں کے عہد میں نظم اردو میں وقوع میں آئے وہ تغیرات یہ ہیں۔ غیر مانوس اور موٹے موٹے فارسی اور عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی۔ اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دیے گئے تھے ان کا پھر داخل شعر کیا جانا صرف ان محاورات کا

---

[1] تصنیف ۱۲۶۳ھ۔ علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی ؎

جندا سنکر مقیم صبا رشک نے خوب نظم کی تاریخ	ایک ادنیٰ سا کارنامہ یہ ہے مثنوی یا شکار نامہ یہ ہے ۱۲۶۳ھ

استعمال کو بڑھائیں اور برمحل ہوں۔ معشوق کا خط و خال گل و بلبل سرو قمری وغیرہ کے رواج اور دور ازکار تشبیہات و استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی۔

باب ۹

دربارِ لکھنؤ اور اُس کے شعراء

واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلّی اُردو شاعری کا گہوارہ تھا۔ اسی طرح اس کے زوال کے بعد لکھنؤ اس کا مسکن و مامن بن گیا اس وجہ سے کہ دلّی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور میر و سودا و سوز وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرمانروایانِ اودھ کی داد و دہش اور جود و سخا کے افسانے سن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہان اودھ نے بادشاہانِ دہلی کے تتبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کیے تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرمانروایان ذیل جن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

آصف الدولہ آصف | نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعر و سخن کے بڑے قدردان و مربی تھے جن کی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب یحییٰ خاں نام مرزا امانی عرف آصف تخلص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور جانشین تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۸ھ مسند نشین ہوئے[1]۔ تاریخ جلوس یہ ہے ؎

گشت از پائے آصف الدولہ   رونق مسندِ وزارتِ ہند

(اس میں ہ کے تعمیہ سے جو الفاظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عدد ہیں ۱۱۸۸ھ نکلتے ہیں) جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں تعمیر کرائیں جو اب تک ان کی یادگار موجود ہیں ان کو فن تعمیر کا بہت شوق تھا ان کے عہد میں انگریزوں کی آمد اودھ میں زیادہ ہوئی اور ان کا

---

[1] عہد وزارت ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء تا ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء (مرتب)

رسوخ بڑھتا گیا۔ کئی انگریز اجارہ داری نوکری و تجارت کے سلسلہ سے اودھ میں آ گئے۔ ریذیڈنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے۔ راجہ بینی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے۔ مہاراجہ جھاؤ لال اور خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ شعر و شاعری اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدرداں تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی اور صفائی ہے اور تصنع اور تکلف جو ناسخ کے زمانہ میں وبال جان ہو گیا۔ ان کے یہاں نہیں ہے۔ ایک اردو دیوان ان سے یادگار ہے جس میں تقریباً ۲۰۰ صفحات میں غزلیں، ۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے۔ انہیں کے مبارک عہد میں ملک الشعراء میرزا رفیع سودا اور خدائے سخن میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے[۱] اور انہیں کی سرکار دولتمدار کے مداح اور وظیفہ خوار رہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جہاں تیغ اس کی عَلم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں — کسی کا جو نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خاں المتخلص بہ وزیر و وزیری

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی مسند وزارت پر بیٹھے مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول کر دیا۔ کہا یہ گیا کہ نواب آصف الدولہ کے صلب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی۔ معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں انہوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا۔ اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی۔ آخر کار جے پور میں جہاں کہ انہوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کئے گئے۔ پھر وہ سرکاری حکم سے قلعۂ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کئے جاتے ہیں۔

جوں سبزہ زمیں سے اُگتے ہی بیروں تلے ہم — اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سایے کے تلے ہم

[۱] یہ بیان درست نہیں، صرف میر دلی سے لکھنؤ آصف الدولہ کے زمانے میں آئے تھے سودا اور سوز شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد پہنچے تھے وہاں سے یہ لکھنؤ آئے قطعی سنین کے لئے دیکھئے۔ سودا اور سوز کے حواشی۔ (مرتب)

ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں — رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات بلے ہم

نواب سعادت علی خاں | نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے[1] ان کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہدنامہ کیا گیا جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ ان کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ سے نکل کر انگریزی علاقہ میں شامل کر دیا گیا چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا بادشاہ کو عیش و عشرت کے سوائے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی کے علوم و فنون کے بڑے قدرداں تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گو کہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ مصحفی اور انشا کے مشہور معرکے انہیں کے زمانہ کی یادگار ہیں[3] سید انشا، سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بیلی انگریزوں کی طرف سے ریذیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر | نواب سعادت علی خاں کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر مسندِ وزارت پر ۱۸۱۴ء[2] میں جلوہ افروز ہوئے اور پانچ برس بعد بعہدِ نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء میں ان کی تخت نشینی ہوئی تو اس قدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ زر و جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

	بگو ناسخ کہ ظلِ اللہ گردید	

غازی الدین حیدر اُردو شعر کہہ لیتے تھے مگر ان کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور مرثیہ کی صورت میں ہے اس قدر روکھا پھیکا اور بے مزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ان کے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار اس درجہ خراب ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں۔

نصیر الدین حیدر | غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر بیٹھے ان کا زمانہ سلطنت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک ہے مسند نشینی کی تاریخ ہے۔

	جاوداں سلطنت مبارک باشد	

جس سے بارہ سے تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمہ معصومین کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ غزل مشہور ہے۔

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے	کہ ساقی لئے ساغر مشک بو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری	جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے
جتاؤں میں کیا اپنا حال پریشاں	عیاں زلفِ دلدار سے مو بمو ہے

[1] عہد وزارت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء تا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء

[2] عہد وزارت ۱۸۱۴ء تا ۱۸۱۹ء بادشاہت ۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۷ء (مرتب)

[3] یہ معرکے آصف الدولہ کے عہد میں ۱۲۰۸ھ تا ۱۲۱۲ھ ہوئے (مرتب)

چلو قبر فرہاد پہ فاتحہ کو	مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے
شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر	یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا	نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوند عالم نگہباں تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۶ء لغایت ۱۸۴۲ء اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۷ء) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم و فنون کے مربی اور شعر و سخن کے قدردان تھے اور ان کے زمانہ میں بھی انعام اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے ان کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہٰذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختر[۱] یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے۔ بعد وفات امجد علی شاہ ان کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بعمرِ ۲۵ سال ۱۸۴۷ء میں سرائے آرائے سلطنت ہوئے؎ "مبارک ہو تاج شاہانہ" تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بیحد شوق تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی تعمیر قیصر باغ[۲] کا خیال پیدا ہوا۔ اس کو عمارت دا ایوان دلکشا۔ بارہ دری۔ نہر و پل سنگ مرمر و تصاویر سنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپیہ اس عمارت میں صرف ہوا۔ یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جس کے تکلفات اور شان و شوکت بڑھے لوگوں کی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں۔ سلطان عالم کو شروع میں چند روز انتظام مملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا مگر نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ مثنوی عزالدو ماہ پیکر کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں جو محفل شاہی کو اپنے پر اثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں غرضکہ اسی عیش و عشرت اور ناچ رنگ کی بدولت ملک میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمائش کرنا پڑی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا آخر کار ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاع سلطنت کا حکم دیا گیا اور ایک ہفتہ کے اندر یہ عظیم الشان ملک جس کی آمدنی دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہو گیا۔ سلطان عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیج دیئے گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ چلے گئے؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں	رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

[۱] ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۷ھ / ۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ (مرتب)

[۲] تخت نشینی ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ / ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء (مرتب)

جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند کئے جانے کے بعد محلہ مٹیا برج میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فن تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی انہوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پُرفضا باغات بنوانا شروع کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مٹیا بُرج لکھنؤ کا ایک مختصر نمونہ بن گیا سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا۔ اس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی جس کا نام "حزنِ اختر" ہے قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا مگر ہر بات میں نفاست اور جدت طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ ان کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ فنِ موسیقی اور علی الخصوص ناچنے اور بتانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اسی طرح شعر و سخن کے بھی بیحد دلدادہ تھے اور بڑے بڑے کامل استاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لئے تھے اگر سچ پوچھئے تو انھیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ اُردو کے بحیثیت ہندی میں بھی ان کا کلام موجود ہے اور ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں دادرے وغیرہ جس میں "جانِ عالم پیا" تخلص کرتے تھے اب تک لکھنؤ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں[1] ۱۸۸۷ء میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔

تصانیف ان کی متعدد تصانیف اس وقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جس میں قصائد غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ دیوان بہ تفصیل ذیل۔ شیوع فیض۔ قمر مضمون۔ سخن اشرف۔ گلدستۂ عاشقاں ماہ ملک۔ نظم ناموَر۔

(۲) حزنِ اختری (جس کا ذکر اوپر ہوا) خطاباتِ محلات اس میں ان محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دی گئی۔ یہ مثنوی اس وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے۔ بنی۔ ناجو۔ دلھن مثنوی در فن موسیقی۔ دریائے تعشق۔

(۳) مراثی۔ جن کی تین جلدیں ہیں۔ ایک موسوم بہ جلد مراثی جس میں ۲۵ مرثیہ یا دو ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں۔ دفترِ غم و بحرِ الم۔ اس میں بائیس مرثیہ ہیں۔ سرمایۂ ایمان اس میں ۲۳ مرثیہ ہیں

(۴) قصائد اُردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین النفس و العقل

(۶) صحیفۂ سلطانی۔ اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرآنی ہیں

---

[1] وفات ۲ محرم ۱۳۰۵ھ / ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء (مرتب)

(۷) نصائح اختری۔

(۸) عشق نامہ۔

(۹) رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت۔

(۱۰) دفتر پریشاں۔

(۱۱) مقتل معتبر۔

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن

(۱۳) صوت المبارک

(۱۴) ہیبت حیدری

(۱۵) جوہر عروض

(۱۶) ارشاد خاقانی۔ یہ آخری دو کتابیں (۱۵-۱۶) علم عروض میں ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی۔ اصلاح سخن میر مظفر علی اسیرؔ اور نواب فتح الدولہ برقؔ سے لیتے تھے۔ برقؔ کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۵۶ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر ان کا ان کے حسب حال ہوا۔

برقؔ جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اٹھے		جان دی آپ کے دروازے پہ مر کر اٹھے

اسیرؔ برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے۔ یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ اسیرؔ اور برقؔ کے اس عہد کے نامور شاعر۔ امانتؔ۔ قلقؔ۔ بحرؔ۔ سحرؔ۔ ذکیؔ۔ درخشاںؔ۔ قبولؔ۔ شفقؔ۔ بیخودؔ۔ ہنرؔ۔ عطاؔ۔ ہلالؔ۔ سرورؔ تھے۔ جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے۔ صاحبزادوں میں نواب ولی عہد بہادر کوکبؔ اور نواب برجیس قدر بہادر برجیسؔ تخلص کرتے تھے۔

طرز کلام | طرز کلام وہی ہے جو اس زمانہ میں لکھنؤ کے شعراء کا عام رنگ تھا۔ رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے۔ سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ ان کی مثنوی "حزن اختری" جس میں مصائب سفر کا بیان ہے، نہایت دلکش اور پرتاثیر نظم ہے۔ اس کی سلاست اور فصاحت اور عمدہ زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی دلچسپ ہیں جو انہوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی

---

[1] سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی لکھی ہوئی مختلف موضوعوں پر اردو و فارسی میں نثر و نظم کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر پہنچ گئی تھی۔ اور ان میں سے کوئی کم سا کتابیں رضوی صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ (لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ) (مرتب)

محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اعلیٰ محل یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفّٰی اور مسجّع دیباچہ کے ساتھ اکبر علی خاں توقیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط بترتیب سنہ جمع کئے گئے ہیں اور ۱۲۷۶ھ میں شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا درد انگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لئے جمع کئے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر تسکین ہو۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا — آہ دلِ ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا
کمر دھوکا۔ دہن عنقا۔ غزال آنکھیں۔ پری چہرہ — شکم ہیرا۔ بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سار ند میخانہ میں گر آئے — گرے ساغر۔ لُنڈھے شیشا۔ ہنسے ساقی۔ بہے دریا

یہی تشویش ہے شب و روز بنگالے میں — لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بارِ خدا — پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار میرا — یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حبِ وطن — تنگیِ گور سے بدتر ہے فضائے غربت
یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر — ختم ہے اخترِ بیکس پہ جفائے غربت

اسیر سید مظفر علی خاں متخلص بہ اسیر[۱] خلف سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں۔ مصحفی سے اصلاح سخن لیتے تھے[۲]۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا[۳]۔ اس کے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انہوں نے رفاقت منظور نہ کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوئے۔ جس کا ذکر جا بجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب

۱؎ پیدائش ۱۲۲۰ھ/۰۶-۱۸۰۵ء (مرتب)

۲؎ معلوم ہوتا ہے کہ اسیر ۱۲۳۶ھ/۲۱-۱۸۲۰ء کے بعد مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ کیونکہ ریاض الفصحا (تکمیل ۱۲۳۶ھ) میں مصحفی نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ (مرتب)

۳؎ اسیر عہد امجد علی شاہ میں میر منشی کچہری کے عہدے پر فائز رہے۔ (مرتب)

یوسف علی خاں والی رامپور۔ اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں نے ان کی اور ان کے کلام کی بڑی قدردانی کی چھ[1] مدت العمر اسی ریاست کے دعاگو رہے۔ اور چھ ماہ رام پور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق سنہ ۱۸۸۱ء میں بعمر ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے[2] بہت مشاق اور پرگو شاعر تھے ان کی تصانیف میں چھ دیوان اردو ہیں۔ جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی اور ایک مثنوی "درۃ التاج" اور رسالۂ علم عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں[3] علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے۔ زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو اس زمانہ کے اہل لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ ان کے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و افضل اور نیز شوق اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق
زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضمون چراغ سے
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست
زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

امانت سید آغا حسن مخلص میر آغا رضوی لکھنوی روضۂ مشہد مقدس کے کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو اس زمانہ کے مرثیہ گویوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی کی طرف کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انہوں نے بھی اصلاح لینا ترک کر دی۔ سنہ ۱۲۵۱ھ میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہو گئے مجبوراً بذریعہ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت سنہ ۱۲۶۰ھ تک رہی آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کربلا جا کر زبان خود بخود کھل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی[4] امانت کو معما اور چیستان کہنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی تصانیف سے دیوان

---

[1] امیر دربار رام پور میں ۱۵ مئی سنہ ۱۸۵۹ء کو ملازم ہوئے (مرتب)

[2] صحیح تاریخ انتقال یہ ہے۔ ۷ فروری سنہ ۱۸۸۲ء (مرتب)

[3] اسیر کے مجموعہ مراثی اور سلام کا ایک حصہ کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ کے بتحا [illegible] میں محفوظ ہے (ہماری زبان ۲۲ [illegible] ۱۹۴۹ء)

[4] روایت ہے کہ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں امانت مقدس زیارتوں کو دیکھنے عراق گئے ایک روز روضۂ امام حسین دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک اُن کی زبان کھل گئی مگر لکنت تمام عمر برقرار رہی۔ (لکھنؤ کا عوامی سٹیج صفحہ ۱) (مرتب)

خزائن الفصاحت، گلدستہ امانت اندر سبھا اور اکثر مرثیے شائع ہو چکے ہیں[1]۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اندر سبھا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے اُردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے لطافت اور فصاحت[2] جو اپنے اپنے رنگ میں شعرائے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے۔ ان کا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ کے سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں جس کے لفظ لفظ سے تصنع اور نمود ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا	شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو
فی سبیل اللہ پانی ان کو دو اے آبلو	کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے

برعکس اس کے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

آنسو رواں ہیں زلف سیہ کے خیال میں	موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں
عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں	زخم کی صورت ہے آنکھوں سے جاری اندنوں
فصل گل ہیں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو	ساقی مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو
کوچۂ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے	کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق[3] خواجہ ارشد علیخاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد بتاتے تھے جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور ہے۔ ان کے کلام میں محض لفظی تصنعات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال اور رکاکت بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے

---

[1] دیوان خزائن الفصاحت پہلی مرتبہ ۱۲۸۵ھ میں طبع ہوا

اندر سبھا پہلی مرتبہ ۱۲۷۱ھ میں تین مطبعوں سے شائع ہوا۔

۱۔ مطبع محمدی لکھنؤ

۲۔ مطبع مسیحائی کانپور

۳۔ مطبع جعفری لکھنؤ (مرتب)

[2] لطافت المتوفی ۲۱ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ/ ۲۰ جنوری ۱۸۸۴ء

فصاحت المتوفی ۲ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ/ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۴ء (مرتب)

[3] وفات ۳ نومبر ۱۸۶۹ء (اخبار دبدبۂ سکندری ۱۰ نومبر ۱۸۶۹ء بحوالہ معاصر نمبر ۲ ۔ مرتب)

ان کا کلام بہت مستند اور قابل قدر ہے مگر شعری حقیقی خوبیوں سے معرّا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی علم اُلفت نہایت دل چسپ اور قابل قدر کتاب ہے ان کے دیوان موسوم بہ منظر عشق کے شروع میں چند قصیدے واجد علی شاہ کی تحریر میں ہیں ایک مخمس بھی ان کی تصنیف سے ہے جس میں بادشاہ کی نظربندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حب وطن اور بادشاہ کی محبت کے خیال سے۔

ذکی | مہدی علی خاں تخلص بہ ذکی۔ شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں مراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جس کے صلہ میں انعام و اکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ دکن سے لوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے ان کو ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا بعد انتزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۱ھ انتقال کیا۔ علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ مشاق اور خوشگو شاعر تھے اور دوسرے درجہ کے شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں | سید علی خاں مخاطب بہ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ کا تخلص ہے۔ اسیری لکھنوی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش دربار س ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر | قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا آخر مرزا قتیل کے شاگرد ہوئے اور مصحفی جرأت اور انشاء وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی چند دن فرخ آباد میں قیام کیا تھا۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اس کے صلے میں بہت انعام و اکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاوہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں ۱۸۵۸ء[1] میں انتقال کیا۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔ "محامد حیدریہ" غازی الدین حیدر کی تعریف میں "گلدستۂ محبت" جس میں گورنر جنرل

[1] تذکرہ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں وفات پائی۔ ۱۲

لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے" مثنوی سراپا سوز"، "صبح صادق" جو اپنی سوانح عمری آپ ہی لکھی ہے۔ تذکرۂ آفتاب عالمتاب، جس میں پانچ ہزار فارسی شعراء کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔ دیوان فارسی، بہارِ بیخزاں، بہارِ اقبال، ہفت اختر" ایک دیوان ریختہ، یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونۂ کلام پیش کی جاتی ہے۔

جب پردہ رخ سے دُور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہد عصر سا تیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا

کہنے لگا زراہ تجحت مجھے بطنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجئے جو آپ مجھ کو نہ مورد عتاب کا

تقوٰی ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منھ سے منھ
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گرپی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف | مرثیہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے۔ اہل اسلام اس کے

بہت شائق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے کیونکہ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے اصطلاح میں مرثیہ انھیں نظموں کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیہ کے ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی ان میں ممدوح کی صفات حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اس کی موت پر اظہار افسوس کیا جاتا تھا اس قسم کے مرثیے بہت مختصر ہوتے اور ان کی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے مضامین داخل ہونے لگے۔ مثلاً چہرہ۔ ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی گھوڑے اور تلوار کی تعریف، سامان حرب و ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اُردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ سے معلوم ہوتی ہے مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہوگئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لئے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اُتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف، آورد اور مداحی پر قائم ہوتی تھی اس لئے اس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی اور وہ انواع سخن جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے دفعتاً پستی کی حالت میں آگئے۔ ہر چند کہ قدما کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے۔ مثلاً شاہنامہ میں مادر سہراب کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے سہراب کی موت پر' یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بینیہ ہوں۔ آج کل کے خیال کے مطابق یہ مشکل مرثیے کہے جا سکتے ہیں اس کے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اور نہ لوگوں کو ان کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محتشم کاشی گو کہ بیشتر مرثیہ نگار تھے مگر انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب آملی۔ غزالی۔ میلی۔ کلیم وغیرہ نے گو کہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے مگر ان کے مرثیے مشہور نہیں ہیں اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اردو مرثیہ کی ابتدا جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہ صرف شاعروں کے قدردان تھے۔

بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا ولی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں ان کو مرثیہ سمجھئے یا کچھ اور[1]۔ اس کے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت سائق تھے اور اس کو اپنا مذہبی فرض سمجھ کر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لئے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے۔ مثلاً میر امانی۔ میر عاصی۔ میر آل علی درخشاں سکندر، صبر، قادر۔ گمان۔ ندیم۔ وغیرہ اسی طرح میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ ان میں حقیقی جذبات اور اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے اس لئے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے اجداد میں تھے۔ سودا کے وقت عموماً مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اب تک مروج ہے۔ اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اس میں جدید تشبیہات و استعارات معرکہ کارزار کے مفصل حالات، شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کئے جو انیس و دبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہنچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگان انیس اور ان کی خدمات مرثیے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر امانی۔ اور میر ضاحک اور میر حسن نے مرثیے کہے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے جس میں سے تین یعنی خلیق اور خلق اور محسن شاعر تھے۔ خلق اپنے والد ہی شاگرد تھے۔ صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ خلیق بھی بجائے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ ذیل میں قلم بند کئے جاتے ہیں۔

خلیق[2]

میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیف مثنوی سحر البیان فرصت نہ تھی۔ لہٰذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا۔ تھوڑے دنوں میں یہ مشاق ہو گئے اور کلام اس قدر بامزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہیں روک لئے جائیں گے جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

---

[1] تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ولیؔ نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲۔

[2] پیدائش ۱۱۶۰ھ کے لگ بھگ، وفات ۱۲۶۰ھ (قاضی عبدالودود معاصر نمبر ۱ صفحہ ۱۹۰) (مرتب)

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو | صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا[1] تو عیال کا بوجھ سر پہ آ پڑا چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہٰذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میر خلیق ایک پُرگو شاعر تھے۔ ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے میاں دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت تھی اس لئے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علیحدہ کر کے اس میں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح (شاگرد ناسخ و دلگیر) حج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہ گیا تھا۔ لہٰذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کاوشیں کرتے تھے جس کا نتیجہ مرثیے کی تکمیل و ترقی کے واسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجائے چو مصرعہ کے اب مسدس کا رواج ہوا۔ اس کی ابتدا سودا سے ہوئی تھی اور خلیق نے اس کو پھیلایا۔ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے۔ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کہی جاتی تھی وہ نوحہ کہلاتی، اور اس کو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا۔ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تمہید پھر سراپا پھر میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیے محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رلانے کے واسطے ایک مقررہ طریقے پر کہے جاتے تھے اب اس میں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جن کی جانچ پڑتال بھی اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح اساتذۂ شعراء کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب کے اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور اس کی بوسیدہ ہڈیوں پہ اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا اور اب وہ شاعری کی ایک موقر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرقہائے اسلام یہاں تک کہ اہلِ ہنود بھی دلچسپی لیتے ہیں اور بہت ذوق شوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پہ بہت توجہ کی اور درد و اثر کو خیالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا اور یہی فرق ان کے اور میر ضمیر کے یہاں مابہ الامتیاز ہے انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ اس طرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا یعنی زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔ میر خلیق کا خاندان زبانِ اُردو کی صحت

---

[1] وفات سنہ ۱۲۰۱ھ (مرتب)

اور محاوروں کی صفائی کے لئے مشہور ہے۔ چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں اس وقت آئے جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب سے اور صدر المفتی میر عباس صاحب سے پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی سے حاصل کئے جو اس فن میں اس زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے۔ فن شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فن سپہ گری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ دکھانے میں بہت کارگر ثابت ہوئی حسن تناسب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان میں یا کسی دوسری شے میں اس کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کو اپنی عزت خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خودداری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ وضعدار بھی بہت بڑے تھے ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک وقت معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتیٰ کہ ان کے گھر والے بھی بغیر اطلاع ان کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ اُمرا سے بہت کھنچکر ملتے تھے یہاں تک کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ایک معتمد شاہی ان کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے تھے۔ آئین وضعداری کے سختی سے پابند تھے جس کو انھوں نے اپنے اور اپنے احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کر لیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا جس کو انھوں نے عمر بھر نباہا لوگ جس طرح ان کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح ان کی پابندی وضع کے بھی قدرداں اور مداح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک رئیس حیدر آباد نے میر صاحب کی جوتیاں اٹھا کر ان کی پالکی میں رکھ دیں اور اس پر ان کو بڑا فخر رہا تھا۔ یہ ان کے مزاج کی خودداری، قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا روپیہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا البتہ امرائے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مداح آل رسولؐ سمجھ کر پیش کرتے تھے اس کو قبول بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تا انتزاع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے۔ جب کبھی باہر جانے کا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا کرے گا اور ہماری زبان کا لطف کیا اٹھائے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک

مرتبہ ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوئے الہ آباد میں قیام کیا اور ان سب مقامات پر اپنے معرکۃ الآرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض اور داخل حسنات کیا جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہو جاتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پہروں کے بھی چپہ بھر زمین سننے والوں سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا جو قدردانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضۂ بخار ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا[1] اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوئے

میر انیس بحیثیت شاعر | میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعرا کا نہیں پیش کر سکتا۔ لہٰذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جبکہ فیض آباد میں قیام تھا۔ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزیں تخلص کرتے تھے شاید اس مناسبت سے کہ ان کے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی حزیں میں بہت ربط و ضبط[2] تھا۔ جب لکھنؤ آئے تو اُن کے والد اُن کو ناسخ کے پاس لے گئے ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کی شہرت اُن کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیق اور ضمیر میدان مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو دبیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

تصانیف | میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا مگر جس قدر چھپ چکا ہے۔ پانچ جلدوں میں ہے۔ باقی ان کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انہوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ جس طرح ان کا کلام لاجواب ہے اسی طرح ان کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا۔ ان کی آواز قد و قامت، صورت غرض ہر شے اس کام کے لئے موزوں واقع ہوتی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ تھا کہ بڑا

---

[1] کسی نے کیا خوب مادۂ تاریخ نکالا ہے جس میں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو سے مرزا دبیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے ع

غم انیس میں ہے ہے۔ دیا و دبیر کا غم
۱۲۹۱ ۱۲۹۲

[2] یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحک، میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی حزیں خان آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور ان سے سن میں بڑے تھے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحک نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو۔ ارتباط وغیرہ تفاوت سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے ۱۲۔

آئینہ سامنے رکھ کر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے۔ ادب اُردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اُردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شیکسپیئر اور خدائے سخن اور نظم اُردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

انیس کی خدمت زبان کے ساتھ

انیس نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اس کو خوب صاف کیا اور مانجا اور ان کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لئے مشہور عالم ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے اور اسی پر اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ لغات کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی اور الفاظ کی سجاوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے ان کی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی انہوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے۔ ان کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اس طرح کہ جیسے آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے۔ مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا۔ میر صاحب کا مرتبہ اُردو میں بہت خاص ہے۔ اس وجہ سے جو احسان انہوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے اور باوجود اصناف نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے اب تک تہی دست تھی۔ اس میں ہومر کی الیاڈ۔ ورجل کی اینیاڈ۔ ویاس کی مہابھارت والمیک کی رامائن یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی چیز موجود نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان اُردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لئے ایک مدت مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ انیس کے مشہور مراثی سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندر نامہ اور فردوسی کے شاہنامہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انہوں نے دکھلائے ہیں اس کا بھی جواب زبان اُردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرقع نگاری

انیس کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرثیہ

سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو ترتیب سے بے تکلف علیحدہ کئے جا سکتے ہیں۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جس میں صدہا خوبصورت خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اس کل کے تحت میں سب آتی ہیں۔ مثلاً صبح کا سماں، طلوع آفتاب، نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے، شام کا سہانا وقت، چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیانک منظر، باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا، سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیے کے ضروری جزو ہیں۔

اظہار جذبات | مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات خوشی و غم، غصہ و محبت، رشک و حسد، بیم و رجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر، جنس، حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے مثلاً اگر کسی بچے کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کئے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے ان کی اصل ڈراما نویسی کی کماحقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جا سکتا ہے اسی طرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجہ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی، حریف کا جواب، حملہ آوروں کے حملے، پہلوانوں کی لڑائیاں، سامان حرب و ضرب علم تقدم مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ اور تخیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مورخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ من و عن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوئے ان کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل میں ہے مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعرا اپنے ماقبل کے شعرا کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب نساخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں انھوں نے انیس و دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اس کے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا مگر سچ پوچھئے تو واقعیت بین بین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصل حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ ان میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ ان لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنھوں نے مرثیے پڑھے۔ کہیں کہیں پرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہو گئے مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجے سے گرے ہوئے ضرور ہیں مگر تعجب کی کیا بات ہے اس وجہ سے کہ انھوں

نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہو گئیں تو اس سے ان کی استادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز میر انیسؔ تمثیلوں۔ استعاروں اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جن کی اس زمانہ میں کثرت تھی۔ صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ ان سے ایک عجیب دلکش اثر پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں۔ ان کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنیٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت۔ نشست الفاظ اور زور یہ سب ان کے کلام میں ملے ہوئے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جس کو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں ایک ہی بات اور ایک مضمون کو اس سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیسؔ کا مرتبہ اُردو شعرا کی صف اولین میں نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب تصنّع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا۔ ان کی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اس کی داغ بیل انیسؔ نے ڈالی تھی۔ انیسؔ نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جس کا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جس کا دماغ معمولی شعر و شاعری کی عطر بیزی سے بعض وقت پریشاں ہو کر حقیقی شاعری کی نکہت کے لئے بیتاب ہوتا ہے ان کی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اس وقت تک ترقی کرتی جائے گی جب تک زبان اُردو ترقی کرے گی بلکہ اسی وقت انیسؔ کی واقعی قدر کی جائے گی۔

دبیر مرزا سلامت علی دبیرؔ دہلی میں ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کو عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا دبیرؔ ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بزرگ قدیم میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے اس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہو گیا تو پھر دہلی واپس آ گئے مگر دبیرؔ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اس وقت آئے جب ان کی عمر

تقریباً سات برس کی تھی۔ مرزا استعداد علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شائق تھے جس سے ان کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر گوئے سبقت لے گئے۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا۔ چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب میں اس وقت کے مشہور مرثیہ گویان لکھنؤ میں دبیرؔ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ ان کو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا۔ لکھا ہے کہ اکثر رؤسائے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی ان کی شاگرد ہو گئیں تھیں اور اب یہ زبان اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے تھے ان کی شہرت سے اور نیز اُستاد کی عزت و محبت کے برتاؤ سے بعض لوگ آتش رشک و حسد سے جلنے لگے اور اُستاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیرؔ نے نواب افتخار الدولہ[1] کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا۔ رنجش اور بددلی پیدا کرادی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملہ نے طول نہ کھینچا اور مصحفی و انشا کی طرح تھکا فضیحتی کی نوبت نہیں آئی مگر آخر کار معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے اُستاد کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع ان کو برا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اب میر ضمیر بوڑھے ہو گئے تھے مقابلہ آئندہ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ میں شروع ہوا۔ یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب آداب کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی چنانچہ بحکم واجد علی شاہ جو اس وقت مٹیابرج میں قیام گزین تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے ان کا علاج کیا۔ مثل میر انیسؔ کے یہ بھی غدر ۱۸۵۷ء تک گھر سے نہیں نکلے تھے مگر ۱۲۷۵ھ میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے اور ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں اس دار ناپائیدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیرؔ بحیثیت مرثیہ گو مرزا دبیرؔ مرثیہ گوئی کے اُستاد کامل تھے۔ انھوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ ان میں میر انیسؔ کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور شکوہ الفاظ اس پر طرہ ہے مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلیٰ تخیل نئی تشبیہات۔ اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک عالم فاضل کی جھلک برابر آتی ہے وہ آیات

[1] آب حیات میں لکھا ہے کہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی ۱۲۔

قرآن اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُر گو اور زود گو تھے۔ ان کی کثرتِ خیالات حیرت انگیز ہے مختصر یہ کہ حسین اور نادر تشبیہات سے اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پُرشکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے اپنی زود گوئی اور پُرگوئی سے، اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعرا کی صفِ اولین میں ان کو جگہ دی جائے۔

انیس اور دبیر کا مقابلہ ان دونوں کے مقابلے میں اہلِ لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہو گئے۔ ایک طرفداران انیسؔ دوسرے جانب داران دبیرؔ جو بہ اصطلاح اہلِ لکھنؤ انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حدِ اعتدال سے بڑھ کر سخیف اور مضحکہ خیز درجہ تک پہنچ جاتی تھی مگر ایک مورخ کا ایک یہ فرض نہیں ہے کہ جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور استادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا۔ دونوں ایک ہی صنفِ نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثی و رباعی و سلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبانِ اردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ اب فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیسؔ موروثی شاعر تھے شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پُشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں!

مگر مرزا دبیرؔ کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جُداجُدا ہے۔ انیسؔ کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر ہے۔ برخلاف اس کے مرزا دبیر کے یہاں جدتِ خیالات، بلند تخئیل، انوکھی تمثیلیں اور پُرشکوہ الفاظ زیورِ کلام ہیں۔ مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیسؔ کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیرؔ کا مایہ ناز ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہوں سے پاک و صاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کو عربی درسیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اس قدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات داخلِ فیشن

ہو گئی ہے کہ دبیرؔ کے کلام کو کم کر کے دکھایا جائے اور ان کا مرتبہ انیسؔ سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیرؔ بھی مثل انیسؔ کے مسلم الثبوت استاد تھے جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیرؔ مینائی اور اسیرؔ لکھنوی نے اعتراف کیا ہے ان کی شہرت خود ان کے زمانہ میں بھی بہت تھی جیسا کہ لفظ "استاد" سے ثابت ہے۔ جو ان کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے جہاں ایام عزا میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہدائے کربلا کی مجالس نہایت سیر چشمی اور تکلف سے کرتے ہیں۔ امیر سے غریب تک اس مہینہ کو متبرک سمجھ کر جملہ مراسم عزاداری اس میں انجام دیتے ہیں۔ اظہار غم کا سب سے مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے کوئی شخص یہاں تک کہ بڑے سے بڑا متشکک بھی علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے ہر شیعہ شخص اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیرؑ کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہہ دے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدردانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ ان کو بامذہب خیال کریں۔ درحالیکہ وہ سال بھر دنیادی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا، ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے گی مگر علما اور شعرا مرثیہ کی قدر ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے کرتے تھے وہ اس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے بہر طور جو کچھ وجہ بھی ہو وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے میر ضمیرؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ رزمیہ۔ سراپا۔ گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ مع تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا ترک جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے غرض کہ یہ اور اسی قسم کی بہت سی جدتوں کا سہرا میر ضمیرؔ کے سر ہے میر انیسؔ و دبیرؔ نے انھیں چیزوں کو ترقی کی معراج تک پہنچایا اور ان میں چار چاند لگائے حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہونچا دیا اور اسی زمانے سے مسدس جس میں عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں، پُرجوش نیچرل نظموں کے لئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا۔ "مدوجزر اسلام" حالیؔ کا مشہور مسدس اسی عنوان پر ہے۔ سرورؔ جہان آبادی نے بھی اس صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلۂ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھئے تو آزادؔ۔ حالیؔ اور سرورؔ وغیرہ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چیں اور رہین منت ہیں کیونکہ زمانہ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو مرثیہ میں

پائی جاتی ہیں، مثلاً تمہید، تسلسل بیان۔ اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست زبان، تشبیہات، تخئیل وغیرہ، جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں، سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے استاد اب سے بہت پیشتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی نمود اور اس کی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس کی ادب آموزی ایسے وقت میں جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تصنع میں نہایت ادنیٰ اور رکیک جذبات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفریں ہے۔ ہر چند کوئی مرثیہ بلحاظ فن گرا ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔ لہٰذا شاعر گو غزل میں کیسا ہی پست اور لاابالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا، شجاعت، عالی ہمتی، عفت۔ انصاف وغیرہ کی تعریفیں، جو ہم اس افسانۂ مصائب و غم میں برابر سنتے رہتے ہیں۔ ہماری درستی اخلاق کے لیے اور ہم میں شریف اور اعلیٰ جذبات پیدا کرنے کے لیے ازبس ضروری اور مفید ہیں لڑائیوں کے ہو بہو نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویر، مبارزوں کی پرجوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کفار کا قتل و قمع، کمزوروں کی اعانت و مدد یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اردو میں صنفِ "ایپک" (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جس کی اس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیس و دبیر کہہ کر چھوڑ گئے۔ ان سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابل اضافہ ہوا پھر اس زمانہ سے اس وقت تک کے استعمال نے ان کو اور صاف کر دیا؛ اور ما بجا الحق مرثیہ نے حدود میدان اردو کو وسیع اور زبان اردو کے سلاح خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس | اس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیر اور فصیح تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان سے پیشتر میاں مسکین[1] دہلوی کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سوائے اس کے کہ ان کا نام میر عبداللہ تھا)

---

[1] مسکین عہد محمد شاہ میں دلی میں موجود تھے اور مرثیہ نگار کی حیثیت سے معروف تھے۔ مرقع دلی میں درگاہ قلی خاں نے ان کا ذکر عزت و تمکین کے ساتھ کیا ہے۔

مسکین کے مراثی کا ایک مجموعہ سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں ہے۔ ۱۰ بند کا ایک مرثیہ "گل کرشٹ اور اس کا عہد" میں بھی ہے۔ مسکین مراثی کے دو مجموعے شاہان اودھ کے کتب خانہ میں بھی موجود تھے اور

(باقی بصفحۂ آئندہ)

افسردہ۔ سکندر۔ گدا وغیرہ ہیں جن کے مرثیے اب بھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

خاندان انیس | یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس خاندان میں پشتہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاءاللہ وہ سلسلہ جاری ہے۔ مشغل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر امامی (جو میر امامی موسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کے بعد سلسلہ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے۔
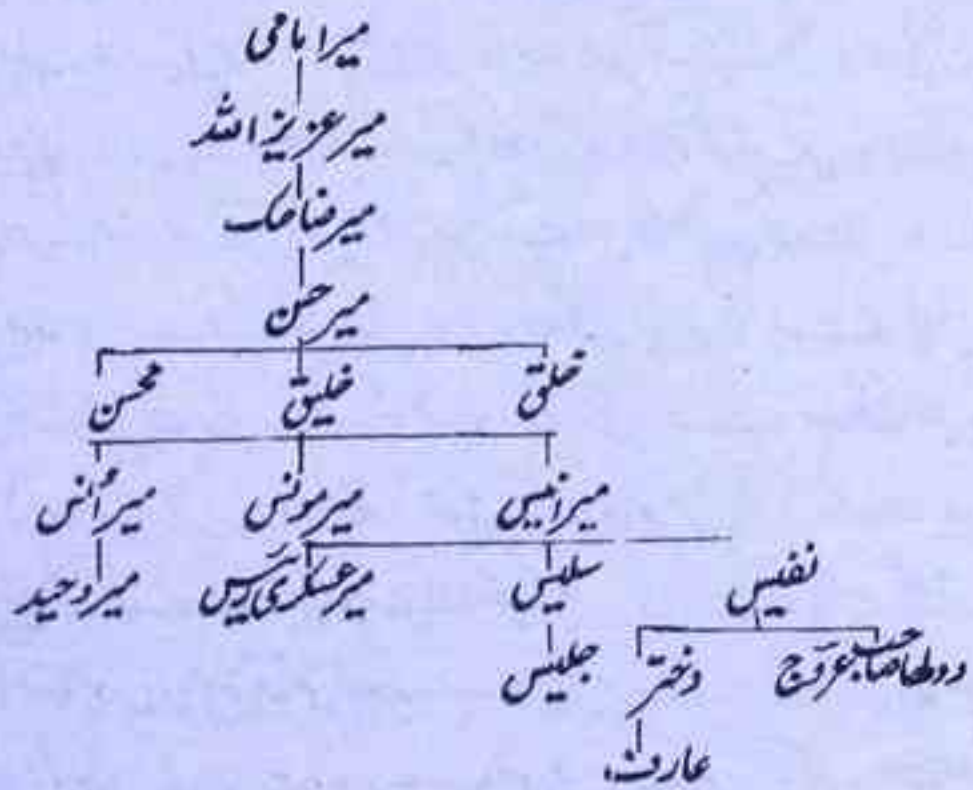
اس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

میر مونس | میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت موثر اور دلکش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں ان کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہرہ دیتے تھے۔ میر مونس کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

میر نفیس | میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سلیس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے۔ لائق باپ کے فرزند تھے اور انہیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی و سلام و رباعیات وغیرہ چھوڑ گئے۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں بعمر پچاسی سال انتقال کیا۔[1]

عارف | سید علی محمد عارف سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور انہیں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر

مختلف بیاضوں میں بھی درج تھے (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ صفحہ ۶۲۳ کلکتہ ۱۸۵۴ء مرتبہ اشپرنگر) (مرتب)

[1] ۵ مارچ ۱۹۰۱ء۔

محمد علی خاں والی ریاست محمود آباد ان کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپے ماہوار سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زباندان تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں ایک خاص رتبۂ امتیاز ان کو حاصل تھا ان کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ۱۳۳۲ھ میں بعمر ۸۰ سال انتقال کیا۔

جلیس | سید ابو محمد عرف للو صاحب جلیس میر سلیس کے صاحبزادے پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے ہونہار شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولھا صاحب عروج (میر نفیس کے صاحبزادے) اور فائق (عارف کے صاحبزادے) اور اقدیم (سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کو مستفیض اور محظوظ کرتے ہیں۔

سید میرزا انس کا خاندان | یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

سید میرزا اُنس | سید محمد میرزا انس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر اب تک ان کا کلام نہیں چھپا اور ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اس زمانہ کے بڑے بڑے شاعر مثل تلق، بحر، اسیر، میر کلو، عرش وغیرہ بلاناغہ ان کے مکان پر جمع ہوتے اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ نوابی میں سو روپیہ ماہوار ان کو خزانہ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُنس نے نواب منور الدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کرلی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں نواب کلب علی خاں والی رامپور نے اُنس کو طلب کیا اور اپنے استاد منشی امیر احمد صاحب مینائی کو ان کے لینے کے واسطے لکھنؤ بھیجا اُنس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں ۱۳۰۳ھ میں بعمر ۹۰ سال قضا کی چونکہ ان کا کلام چھپا نہیں لہٰذا اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی جاسکتی صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے ان کے پانچ بیٹے تھے۔ عشق۔ تعشق۔ صبر۔ صابر اور عاشق۔

عشق | حسین مرزا عشق (معروف بہ میر عشق) اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو انیس و دبیر کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل انہیں استادوں کے مرثیہ کے استاد مانے جاتے ہیں اور ان کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھئے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مؤدب جو اپنے رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

تعشق | سید میرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے استاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور

ہیں۔ ایک عرصۂ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے اور ان کا کلام جذبات، حسنِ بندش، نزاکت خیال اور تاثیر کے لئے مشہور ہے بعض لوگ تو ان کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور ان کا مرتبہ اپنے زمانے کے شعراء میں بہت بلند ہے۔ میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور انھیں کی صحبت سے برابر فیضیاب رہے ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۶۰ سال انتقال کیا۔

احمد میرزا صابر یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کی وجہ سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہو گیا۔ یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ ان کو بہت مانتے تھے اور ان کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کر دیا تھا جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی بیوی کے نام بھیجتے تھے ان کے جوابات اسی طریقہ کی نظم میں ان کی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۶۰ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

پیارے صاحب رشید سید مصطفےٰ میرزا معروف بہ پیارے صاحب المتخلص بہ رشید ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی۔ ان کی شادی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ عشق کے بعد اپنے دوسرے چچا تعشق سے مشورۂ سخن کیا اور سچ پوچھئے تو انھیں کا رنگ ان کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غالب ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے استاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے، مرثیے، غزلیں، سلام، رباعیاں بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست زبان۔ حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے مگر جدتِ خیال اور تاثیر کم ہے ان کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں۔ سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں۔ مرثیہ میں انھوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہاریہ اضافہ کیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہ آیا کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔ ان سے پیشتر بھی اکثر استادانِ فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے ان کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دے کر لکھا۔ ۱۸۹۳ء میں نواب رامپور نے رشید کو بلایا تھا۔ رشید پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں ان کی بڑی قدر اور خاطر و مدارات ہوئی۔ نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدرآباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے ان کا مرثیہ سُنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا۔ رشید کا انتقال بعمر ۴۳ سال ۱۳۳۶ھ ہجری میں ہوا۔ اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے

جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمید دیہ ان کے بھائی تھے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا، مؤدب، پروفیسر ناصری، جلیس مرحوم، اشہر (مولف حیات رشید) شدید، ناظم، فرہاد وغیرہ۔

پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے۔

خاندان دبیر — مرزا اوج

مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج[۱] کے متبع اور انہیں کے رنگ میں کہتے تھے ان کی بھی پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور ان سب مقامات سے ان کی حسب لیاقت خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا اوج بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباندان اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک رسالہ بھی انہوں نے اس فن میں لکھا ہے۔ خسرو دکن نے ان کو بھی سنا ہے۔

نعت النعت اس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کی مدح میں اشعار کہے جائیں بہت سے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔

۱؎ وفات ۱۹۱۷ء

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی اُن کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے لہٰذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بعہد محمد شاہ تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میر و سودا اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اس وجہ سے انشا جرأت اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گذرے۔ ان کا طرزِ کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانۂ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جا سکتے اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور ان کے اور اُن کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کا قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے۔ کیونکہ ان میں بنوٹ اور رنگینی جو طرزِ لکھنؤ کی خاص پہچان ہے۔ مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دَورِ جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اس وجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل ان کے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیرؔ کا نام ولی محمد اور ان کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیرؔ کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی چونکہ اپنے باپ کی بارہؔ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے لہٰذا باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیرؔ اپنی ماں اور نانی کو لیکر آگرہ چلے گئے جہاں محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمٰن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم تھیں۔ نظیرؔ فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیرؔ کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ انہوں نے حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ

معلمی کی نوکری کر لی تھی مگر تھوڑے ہی دنوں بعد آگرہ واپس آگئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبر سنی کی حالت میں، ۱۶۔ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال کیا۔ جیساکہ اُن کے ایک شاگرد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے[1]۔ لائل صاحب ۱۸۳۲ء اُن کا سنہ وفات بتلاتے ہیں مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں۔

نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے اُنھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اُن کو گانے سے، کسرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع، منکسر المزاج اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور بامذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصب اور خود بینی ان کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے اور سب اُن سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کلام میں ان کے فواحش ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہوں گے اس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو مستثنیٰ کر کے اُن میں بعض مرقعے اُس سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس وقت ملتے جلتے تھے۔ مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گذشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا ان کا کلام نہایت قابل قدر اور پر اثر ہے بہت پرگو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفعل جس قدر موجود ہے اس کی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہ ہوگی، اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظیر بحیثیت واعظ و ناصح اگر نظیر کے کلام میں سے اُن کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل اور معائب سے بالکل پاک ہے۔ اُن کی دس گیارہ ایسی دلچسپ

[1] وہ مصرع تاریخ یہ ہے ؏ مخمس بے سر و پا۔ بیت بے دل۔ فرد بے مرشد:

خ + م + ب + ت + ر + د

۶۰۰ ۴۰ ۲ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴ ۱۲۴۶ھ

اور موثر نظمیں ہیں[1] جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادھو لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا ہیچ ست و کار دنیا ہمہ ہیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معترف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تشبیہیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم "موت پر" اور "بنجارہ نامہ" مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے اور اُن کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دار فانی ہے اس کو چھوڑ دو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا اُن کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، ان کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ "الوحدۃ فی الکثرۃ" کے دل سے قائل اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا مرشد اور گرو سمجھتے تھے چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا تو ان کے جنازہ کے ساتھ ہزارہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اُن کو لے گئے۔ نظیر مثل گرو نانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال ورڈس ورتھ کا ہے جس کی سانٹ (غزل) "دنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں۔

نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً "ریچھ کا بچہ"، "گلہری کا بچہ"، "جنگ جانوراں"، "ہرن کا بچہ"، "بلبلوں کی لڑائی" وغیرہ اسی قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جذبات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے اسی طرح چھوٹے بچے اُن کی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تربوز ع کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دودھ کے جیٹورے" ع "کیا دن تھے وہ سبھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے" ہولی، دیوالی، نسبت

---

[1] مثلاً "زرگی جو محبت تجھے ترٹپائے گی بابا" یا "بٹ مار اجل کا آپہونچا ٹک اُس کو دیکھ ڈرو بابا" وغیرہ ۱۲

عید وغیرہ کو پڑھ کر باغ باغ ہوتے ہیں۔ نظیرؔ زندگی کے تمام لطفوں اور حظوں سے خوب بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیریں کرتے تھے۔ انہیں سیر تماشوں میں اُن کا پائے تہذیب کبھی پھسل جاتا ہے اور بے تکان وہ اُڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکالتے ہیں اور بقول شیکسپیئر پتھر سے وعظ سُنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے ہیں"۔ یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے دنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس مزے سے اور ایسے جوشِ مسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ بچوں کی طرح وہ خود اُن سب میں شریک ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کئے رہا نہیں جاتا۔ اُن کی معلومات غیر محدود، اُن کا خزانۂ لغات غیر مختتم، اور اُن کی صفائیٔ بیان دلکش ہے۔ ان کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصب اور ناروا داری نہ تھی بلکہ کٹر پن کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت خلط ملط رکھتے تھے اور اُن کے رسم و رواج، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کے تہوار اور ان کے معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہمکو اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ کبھی تمسخر نہیں کرتے اور نہ اُن کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں، اسی سے اُن کے کلام میں ایک مقامی رنگ ہے، جو اکثر ہمارے شعرائے اردو میں کمیاب بلکہ نایاب ہے البتہ کہیں کہیں سوداؔ، اور انشاؔ کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیرؔ ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ کیونکہ اُن کے خیالات، ان کی زبان، اُن کے مضامین سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ان کی خدمت زبان کے ساتھ

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعرا ادنیٰ اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے الفاظ مروّجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں اُن کو داخل کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں۔ نظیرؔ نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں جو اُن کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں۔ نظیرؔ کی مستعملہ لغات تین قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں:-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اردو شاعری کے مایۂ انبساط ہیں۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حسن شعر بڑھ جاتا ہے۔ اور خزانۂ زبان مالا مال ہو جاتا ہے۔

نظیرؔ پر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ اُن کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ جاتا ہے اور انہوں نے اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر (میلے ٹھیلے وغیرہ) جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور اُن کے بیان کے لئے اُن کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہٰذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور اُن کی بول چال کو خود انھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ اُن میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اُن کا سچا فوٹو من وعن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجمعوں کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے اُن کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نیچرل ہوتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی۔ حالیؔ نے شاید اسی کثرتِ الفاظ کے خیال سے نظیرؔ کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔ نظیرؔ ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود اُن میں شریک ہو کر اُن سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُن کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اُسی طرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک اُن کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں اُن سے سرزد ہوئی ہوں گی۔

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانۂ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری، جس کی ابتدا مولانا آزادؔ اور حالیؔ وغیرہ سے کہی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبرآبادی کہے جا سکتے ہیں۔ جس طرح انیسؔ اور دبیرؔ نے ناصلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بےمثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں اسی طرح نظیرؔ نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں، جن کی گنجائش شعر میں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں

کھینچ دی ہیں، جس سے ان کا کلام عوام الناس میں بہت مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے اُن کے کلام میں کہیں نہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلف، اور ان کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر مجرد نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اسی حالت میں کھینچتے ہیں جب اُن مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو انہوں نے منتخب کیا۔ ان کی نظمیں برخلاف معمولی اردو نظموں کے مسلسل ہوتی ہیں۔ البتہ اُن کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں ہے۔ غرضکہ اپنے سادہ بیان سے، اپنے بے تکلف مگر پُرزور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور یک رنگی کا نام نہیں، نظیرؔ اکبرآبادی ایک ایسے طرز کی بنا رڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سرِ نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلہ انشا کے ساتھ

نظیرؔ کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے، اس رنگ کی ترقی کا باعث اُن کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور اُن کے شادی و غم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا اُن کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ اُن کی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور ظلمہائے حوادث کو اپنے مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہد پن ہوتا ہے۔ نظیرؔ اور انشاؔ دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے استاد تھے مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے۔ انشاؔ کی ظرافت ایک ایسے درباری کی ظرافت ہے۔ جو پُرمذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کوشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بے عزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کر دیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی بامذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے۔ اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشاؔ کی ظرافت میں خوشامد اور پھبتی کی بو آتی ہے اور نظیرؔ ان عیوب سے پاک ہے۔ باوجود اس کے انشاؔ اور نظیرؔ میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور بعض غزلیں بطرز بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے

کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں، دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوف کا سُنہرا رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں۔ مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں انشاؔ مشاق ہیں اور بمقابلہ نظیرؔ کے ان کے یہاں متروکات کم ہیں۔ اور اُن کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے۔

نظیر بحیثیت مصوّر کے

چونکہ نظیرؔ کو فنِ موسیقی سے بہت شوق تھا اس لئے اُن کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مرقع نگار ہیں اُن کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شائق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی آواز سے اظہار مطلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں۔ شادی و مسرّت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں اُنہیں کے مناسب سُریلے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دُور از کار تشبیہات اُن کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائع بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔ اور آورد وغیرہ سے اُن کا کلام پاک ہے۔

اردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اُردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہے اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہلِ عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے اُردو شعرا نے اُس کو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سوداؔ اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی اپنی زبردست شخصیت اپنی عام واقفیت اور قدرت زبان کی وجہ سے ضرور قابلِ لحاظ ہیں۔ اُنہوں نے بے مثل ہجویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہو سکتے تھے مگر اُن میں ٹریجڈی لکھنے کا مادہ یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم محدود ہے۔ میرؔ کی حالت یہ ہے کہ سوز و گداز تو اُن کے یہاں بدرجۂ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصنافِ سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشاؔ کے یہاں تمسخر اور ظرافت کی بہتات ہے اور وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کی وجہ سے خود ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ مگر ان کے درباری تعلق نے اُن کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی ان میں بہت کم ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کو فطری شاعر تھے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے مگر اُن کا دائرہ عمل محدود ہے۔ یعنی وہ محض مرثیہ نگار تھے۔ اور یہ تخصیص اُن کے واسطے قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیشن پلے (یعنی تعزیہ داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مریکل عہد کے ڈراما اور مسٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے کیا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب ترین اور یہی انیسؔ و دبیرؔ کے موضوع ہیں۔ لیکن اُس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کئے ہوئے

ہے معمولی معمولی کیفیات وجذبات انسانی نظر انداز ہوتے رہے۔ نظیرؔ کو بھی مثل سوداؔ انشاؔ اور انیسؔ کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی، اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر شعرا سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان، بچّے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام دنیادار اور تارک الدنیا سب سے ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا۔ عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اُس کے یہاں ایسے مرقعے جیسے شکسپیر کے یہاں، ایموجن، ڈسڈیمونا، پورشیا، اور افیلیا، کے ہیں موجود نہیں ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں، اور اسی وجہ سے نظیرؔ کو معزز عورتوں سے ملنے اور اُن کے خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس کو صرف شاہدان بازاری کا تجربہ ہوا لہٰذا اُس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اُس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شیکسپیر کی طرح اُس کے خیالات میں عمق نہیں ہے۔ اور نہ شیکسپیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اس کی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جاسکتیں۔ ایک "لیلےٰ مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "مہادیو کا بیاہ" جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڈی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اُس کی نظمیں "ریچھ کا بچہ" اور "بلبلوں کی لڑائی" نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیرؔ میں سوداؔ کا زور، میرؔ کی بلند پروازی، انشاؔ کی ظرافت، انیسؔ و دبیرؔ کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیرؔ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔ جب غزل کی یک رنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اُکتا جاتا ہے تو نظیرؔ کے اس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اُس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کئے اور ادب اُردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیت اشیاء کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اُس کی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اُس کے کلام میں بعض جگہ متروکات و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر با اینہمہ وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اُس کے دل میں خوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت

اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیرؔ پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اُس کو شعرائے اُردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیرؔ دہلوی متوفی ۱۲۵۴ھ

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبرآبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اِس لئے ان کو دورِ متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ نصیرالدین نام نصیرؔ تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کلّو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے، باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بسر اوقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ شاعری کی طرف اُن کا رجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیرؔ کو سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں اُن کی قدر دانی خوب ہوتی تھی اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔ شاہ نصیرؔ نے سفر بہت کئے اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علی الخصوص لکھنؤ اور حیدرآباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعرا جمع ہوتے تھے۔ ایسے ہی مجمعوں میں اُن کے شاگرد ذوقؔ کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا

جب دلی میں تباہی آئی اور شعرا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ تو شاہ نصیر بھی ہر اول ڈھونڈھنے باہر نکلے، دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہونچے تو مصحفیؔ، انشاؔ، اور جرأتؔ کا زمانہ تھا۔ جن سے خوب خوب مقابلے رہے[1] دوسری مرتبہ ناسخؔ اور آتشؔ کا آوازۂ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ اور آتش کا آوازۂ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ سے بھی اُن سے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ حیدرآباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چندو لال جو شاداںؔ تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعرائے دہلی کے بڑے قدرداں تھے اُن کی داد و دہش کا شہرہ سُن کر یہ وہاں پہونچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوقؔ اور ناسخؔ کو بھی حیدرآباد بلا بھیجا تھا مگر اُنھوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیر نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لئے

---

[1] دیکھو "بدن سرخ تھا" "چمن سرخ تھا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کا غزل اُن کے حالات نیز آبحیات میں ۱۲ [2] تذکرہ گلِ رعنا میں لکھا ہے کہ آپ کی مرتبہ جیسی ان کی قدر ہونا چاہیئے تھی نہیں ہوئی ۱۲۔

اور اُن کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہوگیا تھا۔ بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں وہیں انتقال کیا۔[1]

تصانیف | شاہ نصیر ایک پُرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلۂ شعر میں منہمک رہے اس طویل مدت میں، ایسے ذہین و ذکی شخص نے جو اسقدر شاعری کا دلدادہ ہو کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہوگیا۔ اس لئے کہ اُن کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اُن کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جس میں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض اصحاب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکینؔ شاگرد مومنؔ نے کی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رامپور نے اپنے کتب خانہ کے لیے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت متین و مہذب مگر اُس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ سینکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں چھوڑے۔ حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے آخر آخر میں اپنے مایۂ ناز شاگرد ذوقؔ سے چشمک ہوگئی تھی[2] کیونکہ کثرت مشق نے ذوقؔ کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی اور وہ سوداؔ و میرؔ ایسے باکمالوں کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے تھے

ان کا مرتبہ شاعری میں | شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف وقافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ مثلاً

شب کو کیونکر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرّہ ہار گلے میں
جوں پروین و ہالۂ مہ تھا سر پر طرّہ ہار گلے میں

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

وقت نماز ہے ان کا قامت گاہ خدنگ و گاہ کمال
بنجاتے ہیں اہل عبادت گاہ خدنگ و گاہ کمال

۱؎ قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (ادبیات ذکر شاہ نصیر) ۱۲-۲؎ بعض روایات کی بنیاد پر تعین کیا گیا ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق کے شاگردانہ تعلقات کا زمانہ ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳-۰۴ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۴ء کے قریب یہ تعلقات ختم ہوگئے۔

(ذوق- سوانح اور انتقاد صفحہ ۴۲ - ڈاکٹر تنویر احمد علوی) (مرتب)

	ولہ	
خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی		روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ ان کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں[1] مثل ہمائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانہ کے استاد تھے اور صدہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

---

[1] مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے ان رنگتروں کی حسنِ تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمایئے۔ اسی وقت رباعی کہی اور سنائی ؎

اے نیّرِ برجِ آسمانِ اقبال — ان رنگتروں پر غور سے کیجئے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر — پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بندِ ہلال

(آبحیات ذکر شاہ نصیر)

باب ۱۲

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا از سرِ نو پھر عروج ہوا۔ صفحاتِ گذشتہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آ گیا تھا۔ لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی اُن کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جس کو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدوکاوش سے سینچا تھا۔ اب وہ نئے سرے سے پھیلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مدوجزر، ترقی و تنزل اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستان نے پھر نغمہ سرائی شروع کی اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنا لیا۔ غالبؔ، ظفرؔ، ذوقؔ مومنؔ وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالبؔ کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دنیا کے بہترین شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔ ذوقؔ و مومنؔ گو کہ غالبؔ کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفرؔ بھی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے شعر کے مشغلہ سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوقؔ و غالبؔ کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے شعرائے دہلی جدید طرزِ لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباں داں اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر اُن کی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسی وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حسن بڑھاتے تھے۔ مومنؔ اور غالبؔ کے بعد غلبۂ فارسی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوئی۔ جملوں کی ترکیبیں سہل ہو گئیں۔ شعروں میں صفائی اور روحانی پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے غالبؔ و مومنؔ کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے مثال کے لئے حالیؔ، سالکؔ، ظہیرؔ، انورؔ، اور مجروحؔ کے کلام کو دیکھنا چاہیئے۔

مومن ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے - ان کے دادا حکیم نامدار خاں جن کی اصل بجائے کشمیر سے تھی بسلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے - جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو ان کی پنشن مقرر ہوگئی[1] جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا - مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی - بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد اُن میں موجود تھی - حافظہ بہت زبردست پایا تھا - جو بات سُنتے تھے فوراً یاد ہوجاتی تھی - عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے - فن طب جو اُنکا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا - شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی اُنھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہونچایا تھا کہ اُن کے احکام (پیشین گوئیاں) سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ اُن کے بہت معتقد تھے اور اکثر آیندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے - شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی - اور دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے - مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انھوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا - آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے - عشقبازی کے لئے دلّی ایسا وسیع شہر پایا تھا - جہاں اُن کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے - جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہوگئے تھے - جو کلام ان کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے - مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی - ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی - اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے - دلّی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رامپور - سہسوان - جہانگیر آباد - اور سہارنپور کی سیر کی چنانچہ کہتے ہیں - ؎

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا - جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو ٹامس صاحب نے یہی جگہ بمشاہرہ اسّی

---

[1] یہ جاگیر موضع بلاہہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں تھی، ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں یہ جاگیر شاہی اقتدار سے نکل کر کمپنی کے قبضہ میں آگئی اور اس وقت سے خزانہ ریاست جھجر سے ہزار روپیہ سالانہ مومن کے والد و چچا وصول کرتے تھے

(مومن از فائق ص ۹) (مرتب)

روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر انہوں نے باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپور تھلہ بھی بمشاہرہ تین سو پچاس پہ نہ گئے۔ کیونکہ سُن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیرالدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ اُن کو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلی کی پُر لطف صحبتیں کہاں میسر ہوں گی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربار داری اور خوشامد سے اُن کو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی اُن کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اُن کا دیوان اُمراء کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے۔ سوائے اُس قصیدہ کے جس کا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری		کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا۔ جنھوں نے اُن کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اُس کے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور اُن کا مضحکہ اُڑاتے تھے تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے۔ مگر اُن کی طبع رسا نے اُس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی ہے

خاک برفرق دولت دنیا
من فشاندم خزانہ برسر خاک

اس میں "خزانہ" کے اعداد سر خاک یعنی (خ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۲ نکلتے ہیں ایک بیٹی کی ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ہے

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے		کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے نکالی ہے ہے

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے		فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادۂ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُن کے مشہور شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مولف تذکرۂ

شعرائے ہند نے اُس کو شایع کیا۔[1]

رنگ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے اُن کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُن کو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستاد کامل ہیں۔ اُن کی علمی لیاقت اور طباعی اُن کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالبؔ کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُن کو بھی وہی تبحر حاصل تھا۔ بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُن کی مثنویاں سر تیز نشتر ہیں۔ جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ان میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ہے اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں۔ مومنؔ کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ مثلاً چند شعر درج ہیں:-

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا	میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
بس شکستن خم زنجیر محتسب معقول	گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف	خون فرہاد بسر گردن فرہاد رہا
کیوں عشق ہوے دیکھ آئینہ کو آئینۂ زنگ غم نے توڑا	کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم کیونکر اُسے منھ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لئے کہ اُن کے معاصرین ان کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں مومنؔ کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:- نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ صاحب دیوان و تذکرہ گلشن بے خار۔ میر حسین تسکینؔ۔ میر غلام علی وحشتؔ۔ اصغر علی خاں نسیمؔ وغیرہ۔ مومنؔ کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے

[1] مومن کی مطبوعہ تصانیف ہیں اس کے علاوہ دیوان فارسی اور انشائے مومن (فارسی) بھی ہیں۔ مومن کی کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں کہ جن کا ذکر ملتا ہے مگر آج ان کی موجودگی کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان تصانیف میں جان عروض۔ شرح سدیدی و نفیس اور خواص پان کے نام لیے جاتے ہیں۔ (مرتب)

سے گر کر ہوا۔ انہوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔ دستِ و بازو بہ شکست۔ چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہی تاریخ اُن کے مرنے کی سمجھنا چاہیئے۔

شیفتہ ۱۲۲۱ھ
لغایت ۱۲۸۶ھ

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کئے تھے اور اس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفےٰ خاں صاحب نے خرید کیا جو اب تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء[1] میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی۔ پُر گو شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور ان کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے رجوع کی ہو شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما، علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا جس میں مولوی امام بخش صہبائی، عبداللہ خاں علوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ غالب۔ ذوق، شاہ نصیر، احسان، تسکین، حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے۔ مفتی صدر الدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہلِ کمال اس میں جمع ہو کر لطفِ سخن اُٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

غالب بفنِ گفتگو نازد بدین ارزش کہ او
نہ نوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ اُن کی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل
چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

نواب صاحب کو سفرِ حج کے بعد[2] سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان

---

[1] ۱۸۰۶ء درست نہیں، الکلب علی خاں فائق کی رائے وقیع معلوم ہوتی ہے کہ شیفتہ ۱۸۰۶ء کے آخری مہینوں میں پیدا ہوئے۔
(مقدمہ کلیات شیفتہ صفحہ ۱۶)

[2] شیفتہ سفرِ حج کے لئے ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ / فروری ۱۸۳۹ء کو روانہ ہوئے (مرتب)

ایک اُردو دیوان - ایک مجموعہ انشاے فارسی جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیب السالک الی احسن المسالک، جس کا فارسی نام رہ آورد ہے اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے اردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشن بے خار اُن کی یادگار رہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور رہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے[1]۔ اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے اُردو میں شیفتہ اپنے استاد مومن کے پیرو ہیں۔ اُن کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے اُن کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ اُن کے اُردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے اُن کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں نے اردو فارسی کلام مع ایک مفید دیباچہ اور حالات کے سنہ ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر شائع کیا۔

تسکین سنہ ۱۲۱۸ھ تا سنہ ۱۲۶۸ھ | میر حسین تسکین میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی تو رامپور آ رہے جہاں نواب یوسف علی خاں نے اُن کی بڑی قدردانی کی۔ چند روز رام پور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے سن میں سنہ ۱۲۶۸ھ میں رام پور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی رام پور میں نواب کلب علیخاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی[2] سنہ ۱۷۹۴ء لغایت سنہ ۱۸۶۴ء | مرزا اصغر علی خاں متخلص بہ نسیم نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے دلی میں سنہ ۱۲۱۴ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ء میں پیدا

---

[1] گلشن بے خار کا عہد تالیف ۱۲۴۸ھ/۳۳-۱۸۳۲ء تا ۱۲۵۰ھ/۳۵-۱۸۳۴ء
[2] سنہ وفات ۱۸۶۴ء درست نہیں، نسیم ۱۴- رمضان ۱۲۸۲ھ/۲۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو فوت ہوئے۔ (مرتب)

ہوئے[1] اور وہیں نشو ونما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرا کے ملنا چاہا مگر انہوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے، تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے مگر کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے غدر کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی، جو ان کو ناگوار خاطر ہوئی، اور وہ علیحدہ ہوگئے۔ ان کے بعد منشی طوطا رام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اسی وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی، یہ بڑے زود گو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر رکھتی کہ جو کچھ لکھتے اُس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جس کی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہوگیا۔ اُن کا دیوان اُن کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا[2]۔ مگر اُس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اُس کی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیمؔ کے شاگرد ہوئے، جن میں عبداللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرفؔ، منشی امیر اللہ تسلیمؔ مشہور رہیں۔

طرز کلام | نسیمؔ میں مومنؔ کا رنگ بہت پایا جاتا ہے اُن کا نہایت ہی لطیف طرز بیان اور نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومنؔ کا فیض تھا۔ نسیمؔ کو تازگی اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے اپنے اُستاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے تھے۔ اور نزاکت خیال اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی اُنہیں کے پیرو ہیں نسیمؔ کا مرتبہ شعرائے درجہ دوم میں بہت برتر ہے۔

ذوق ۱۲۰۴ھ لغایت ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۷۸۹ء لغایت ۱۸۵۴ء | شیخ ابراہیم ذوقؔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے[3] تھے جن کو نواب لطف علی خاں رئیس دہلی کی حرم سرائے کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور

۱۔ ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء نہیں بلکہ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء ہے۔ ۲۔ کلیات نسیم مرتبہ کلب علی خاں فائق ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی ہے۔ ۳۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب ذوق سوانح و انتقاد میں سنہ ولادت ۱۲۰۳ھ درست قرار دیا ہے۔ (مرتب)

فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھ کر مشہور ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے۔ اور جن کے پاس محلّے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوقؔ بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سن کر اُن کو ایک روحانی لذّت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُن کو بار بار پڑھا کرتے تھے اس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوقؔ کے ہم محلّہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اُس وقت دلّی میں بڑا شہرہ تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی ذوقؔ کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جا کر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار اُستاد کا خیال پیدا ہوا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی اُن کی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے کبھی مُنھ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ادھر ذوقؔ کو ان کے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا۔ غرض کہ انھیں وجوہ سے رشتۂ اُستادی شاگردی منقطع ہو گیا[1] ذوقؔ اپنے کلام کو بہ نظرِ اصلاح خود دیکھنے لگے اور اس کی درستی و چستی میں بڑی کدوکاوش کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام نے جلد شہرت حاصل کر لی اور اُن کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابو المظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیزی ہوتی تھی اور نو آموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اکثر پرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراقؔ، احسانؔ، شکیباؔ، قاسمؔ، عظیمؔ، منّتؔ وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے انھیں میں بتوسط میر کاظم حسین بیقرارؔ ذوقؔ کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیر دلّی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہد سلطنت ظفرؔ کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً اُن کو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوقؔ کے سپرد ہو گیا جس صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاعرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی ان کی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی۔ اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر ان کو اُستاد ماننے لگے۔ دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں متخلص

---

[1] اُستادی و شاگردی کا یہ رشتہ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء کے قریب منقطع ہوا۔ جس کا ذکر شاہ نصیر کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ (مرتب)

بمعروف (مرزا غالبؔ کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوقؔ کا شہرہ ہوا تو انہیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزاد) ذوقؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوق کی عمر تقریباً بیس[۱] سال تھی ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوقؔ کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کو اپنے کلام کی پختگی اور صفائی کا انتہائی خیال ہوا اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آئندہ ان کے کام آئی۔ کیونکہ ان کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاہش کرنا پڑتی تھی اور ان کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جرأت کبھی دردؔ کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنانا پڑتا تھا۔

شاہ نصیر سے معرکہ: جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علم استادی پھر بلند کیا۔ ادھر ہونہار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کدو کاوش نے اور بڑھا دیا تھا۔ مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیرؔ نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی ''آتش و آب و خاک باد''۔ وہ غزل دلی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اس کو میں استاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارز طلبی پر ذوقؔ نے مقابلہ کا بیڑا اٹھا لیا اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کئے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کرایا جس کے جواب میں ذوقؔ نے اکثر اسناد پیش کئے اور اس مقابلہ میں ذوقؔ ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے ان کی استادی مسلم ہو گئی۔ ان کے اعلیٰ قصائد[۲] کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو ''خاقانی ہند'' کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالمظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انہوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا

روکش ترے رخ سے ہو کیا نور سحر رنگ شفق　　　　ہے ذرہ پرتو انور سحر رنگ شفق

اس کے صلہ میں ان کی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے ساتھ رفتہ رفتہ سو تک

---

[۱] مصنف تذکرہ گل رعنا اس معاملے میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''آزاد نے آب حیات میں جس طرح سے ظفرؔ مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معروف کے) بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامن کمال سے وابستہ کیا ہے۔ باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت ۲۶ برس کی تھی اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے۔ مگر جوش عقیدت نے اس کا خیال نہیں رہا تذکرہ گل رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۴) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقہ سے آزادؔ کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ۱۲۔

[۲] مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔　　　جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　　آب و ایلولہ نشو و نما گلشن

اضافہ ہوا تھا اور عید بقر عید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو انہوں نے قصیدہ کہہ کر گزرانا[1]

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا ‏ ‏ ‏ مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

اس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت ‏ ‏ ‏ نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

ایک گانوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر ارسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔[2] ذوق اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لئے مشہور تھے۔ بڑے خداترس اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ شعر گوئی ان سب پر حاوی تھی اس میں ان کو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی ان کی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دنیاوی ترقی کے حوصلے ان کو مطلق نہ تھے۔ دلی سے ان کو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چندو لال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربی تھے ان کو حیدرآباد بلوا بھیجا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن ‏ ‏ ‏ کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب و زینت بلکہ آرام و آسائش تک کا سامان مہیا نہ تھا۔ اسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعر و سخن میں محو و مستغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعر و سخن کی مشق

[1] غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا یہ مطلع و مقطع ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی ‏ ‏ ‏ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب ‏ ‏ ‏ شاہ دیندار نے شفا پائی

[2] ظفر نے تاریخ کہی

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر ‏ ‏ ‏ بحکم خداوند جان داد ذوق

ظفر روئے اردو بہ ناخن زغم ‏ ‏ ‏ خراشید و فرمود استاد ذوق

۱۲۷۱ھ

میں صرف کئے ہوں اور سوائے شعر و سخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو۔ امید کی جا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہوں گے اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضایع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُن کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُن کی اور حافظ غلام رسول ویران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے[1]۔

ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضایع ہو گیا۔ انہوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جن میں سے اکثر ضایع ہو گئیں مگر چند دیوان موجود میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوقؔ کی خدمت زبان کے ساتھ ذوقؔ کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے الفاظ کا برمحل استعمال۔ فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زور تخیل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام ذوقؔ کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے اُن کے یہاں تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنایع بدایع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوئے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اُن کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے۔ اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے۔ ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ سست اشعار اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سوداؔ سے کیا جا سکتا ہے اور انھیں کے وہ متبع تھے بھی۔ مگر اُن کے یہاں

[1] مصنف خمخانۂ جاوید اس سعی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی ۱۲

اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد۔ اور جراًت و مصحفی۔ قصیدہ میں وہ کامل اُستاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے اکثر قصائد ضایع ہو گئے مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخئیل اور بلند پردازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں۔ اس صنف میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ اُن کی غزلیں تازگی مضامین خوبی محاورہ۔ سادگی اور صفائی کے لئے مشہور رہیں۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی، اور جراًت سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ کہنا بے جا نہیں۔ ان کی وہ غزلیں جو جراًت کے رنگ میں ہیں مگر جراًت کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔ ایسی صورت میں جب اُن کے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا یہ اعتراض بے جا بھی نہیں ہے۔ نازک خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی، اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اردو کے بہترین شعرا میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر۔ آزاد۔ ظہیر اور انور بہت نامور ہوئے ہیں۔ ان کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسماعیل، جو اُن کے فرزندان روحانی کی طرح زمانۂ غدر میں دُنیا سے اٹھ گئے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلی کے باشندے تھے، اُن کے والد ابو المظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں اُستاد مرصع رقم خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن سے بچپنے ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا مگر وہاں کے ابتر حالات سُن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے۔ وہاں چار برس رہے۔ اُس کے بعد دلی آئے اور محکمۂ جنگی میں ملازمت مل گئی اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ اُن کے مضامین کو مہاراجہ شیودھان سنگھ والی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو الور بلوا بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔

مجبور ہوکر پھر دلی آئے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش اُنیس (۱۹) سال رہے۔ والی ریاست کے مرنے پر اُن کا تعلق ریاست سے منقطع ہوگیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے اُن کے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے اُن کا وظیفہ مقرر کردیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ (۱۵) سولہ (۱۶) برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر حیدر آباد گئے۔ جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کردیا۔ (بیکاری) کے زمانہ میں جب پریشان حال ہوگئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اُن کی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستان سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے دیوان دوّم و سوّم کا حق تصنیف قاضی عبد الکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جس میں بقول حسرت موہانی تین سو (۳۰۰) غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انہوں نے کیا ہے ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا نباہی طرز مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے استاد مانے جاتے تھے ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انور ظہیر مذکورہ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۰ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں۔ جو غدر کے دس سال بعد دلی میں

ہوا کرتے تھے جن میں واؔغ ۔ حاؔلی ۔ ظہیؔر ۔ مجروؔح ۔ سالکؔ ۔ ارشؔد ۔ مشاؔق وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے ۔ ان کے دو دیوان ضائع ہو گئے مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق اور پریشاں مسودوں سے ایک دیوان جمع کرکے چھپوایا ہے ۔ انورؔ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوقؔ ۔ غالبؔ اور مومنؔ تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے ۔

غالب ۱۲۱۲ھ[1] لغایت ۱۲۸۵ھ / ۱۷۹۶ء لغایت ۱۸۶۹ء عیسوی

زبان اُردو کے بہت بڑے ماہر، آسمان شاعری کے سب سے درخشندہ تارے، اپنے زمانہ کے استاد کامل ۔ فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسؔد و غالبؔ ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے ۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک ، نظام جنگ ، بادشاہِ دہلی سے عطا ہوا تھا ۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پہ اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی فخر و ناز تھا ۔ جیسا کہ ان کے اکثر اُردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مثال کے لئے یہ چند شعر کافی ہیں ؎

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
ایبکیم از جماعت اتراک
فیض حق را ببینہ شاگردیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم
ہمہ بخویشتن ہمے گرییم

لاجرم در نسب فرہمندیم
بسترگانِ قوم پیوندیم !
در تمامی ز ماہ دہ چندیم
عقل کل را مہینہ فرزندیم
بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر روزگار مے خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے ، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے ۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی[2] ۔ مرزا کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی ، کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر

[1] ۸ رجب ۱۲۱۲ھ / ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء

[2] غالب کے دادا کا نام توقان بیگ خاں تھا وہ اپنے والد سے جھگڑ کر سمرقند سے پاک و ہند میں آگئے ۔ غالب کا اپنا بیان یہ ہے کہ ان کے دادا عہد شاہ عالم میں اس ملک میں آئے مگر مولانا غلام مہر اپنی تصنیف "غالب" میں اس بیان کو رد کرتے ہیں ۔ ان کی تحقیق کے مطابق وہ عہد محمد شاہ میں آئے ۔ مالک رام ذکر غالب میں مرزا کے بیان کو ترجیح دیتے ہیں ۔ توقان بیگ خاں پہلے لاہور میں میر منو کے ملازم ہوئے ۔ ان کی وفات کے بعد دلی پہنچے ۔ یہاں مرزا نجف خاں اور پھر انہی کی وساطت سے شاہ عالم کی ملازمت پائی ۔ (مرتب)

حیدرآباد گئے۔ جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت میں ملازم رہے کئی برس بعد گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش گڑھی کی لڑائی کے موقع پر ۱۲۱۲ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔
والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی[1]۔ ان کا انتقال بھی سنہ ۱۲۲۱ھ میں ہوگیا۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس تھی اس کے بعد ان کی خبر گیری ان کی ننھیال میں ہوتی رہی اور ان کے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق استاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی سے کچھ کتابیں پڑھی تھیں[2]۔ جب ان کی عمر چودہ برس ہوئی تو ہرمز نام ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا۔ ان کی ملاقات ہوگئی۔ ہرمز نے آخر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا یہ ان کے ساتھ تقریباً دو برس رہا اور چونکہ فارسی کی طرف ان کو قدرتی مناسبت تھی لہٰذا اس سے انہوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اس کے فیضان صحبت کا مرزا کو فخر تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہوگیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۱۶ھ میں آئے[3] جب ان کے چچا کی شادی نواب فخرالدولہ کے

---

[1] مرزا کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں انگریزی فوج میں چار سو سوار کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ان کی تنخواہ تھی۔ اُن کی جاگیر کا قصہ یہ ہے کہ مرزا نصراللہ بیگ اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے اس علاقہ پر حملہ کیا تو مرزا نے کسی مزاحمت کے بغیر شہر ان کے حوالے کر دیا۔ اسی خدمت کے عوض وہ رسالدار بنے۔ بعد میں انہوں نے بھرت پور کے قریب سونک اور سونسا پرگنوں پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہاں ریاست ہلکر کے سپاہی قابض تھے۔ لارڈ لیک کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے یہ پرگنے حین حیات جاگیر میں دے دیئے۔
{ ذکر غالب ص ۲۷ طبع دلی ۱۹۵۵ء } ۔ (مرتب)

[2] اس بات کا اب تک کوئی قطعی ثبوت نہیں مل سکا۔

[3] غالب نے نواب علاؤالدین احمد خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ سات برس کی عمر سے دلی میں آتے جاتے تھے اس طرح وہ ۱۲۱۹ھ / ۰۵-۱۸۰۴ء میں دلی پہلی بار آئے۔ (مرتب اردوئے معلی اصل طبع)

خاندان میں ہوئی تھی اور خود ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ، جو نواب فخرالدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۲۲۵ھ میں ہوئی جب کہ ان کا سن تیرہ[۱۳] برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اس وقت شاعری گونج رہی تھی۔ مشاعرے جگہ بہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی۔ ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا مگر رفتہ رفتہ اردو شاعری کی روزافزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے جب کسی شخص کا یہ شعر سنا

اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب		ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہوگئی۔ کیونکہ ان کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت برا جانتے تھے چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں "اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب" کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا[۱] لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انھیں اسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۳۰ء میں کلکتہ بھی گئے تھے[۲] بہ سلسلہ اپنی پنشن کے جو ان کے چچا کو جاگیر ضبط ہوجانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہوگئی تھی مگر باوجود متعدد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی، ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر[۳] سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچ سو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہوئے تھے مگر دو برس کے بعد جب انتزاع سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہوگئے۔ ۱۲۶۳ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہوگئے مگر قید میں ان کے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا[۴]۔ ۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لئے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی، امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامسن صاحب

---

[۱] نواب علاؤالدین احمد خاں نے محمد حسین آزاد کو ایک خط ۲۰ جون ۱۸۷۰ء کو لکھا تھا۔ جس میں آب حیات کے لئے غالب کے حالات زندگی فراہم کئے گئے تھے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی تبدیلی ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء میں عمل میں آئی (خط کا متن دیکھئے مقالہ آزاد کی حمایت میں صحیفہ[۲۱] ص۹۰) (مرتب)

[۲] غالب اگست ۱۸۲۶ء کو کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ کئی شہروں کی سیاحت کی۔ کلکتہ پہنچنے کی تاریخ ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء ہے۔ ستمبر ۱۸۲۹ء کو کلکتہ سے نکلے، اسی برس نومبر میں دلی آگئے۔ ۱۸۳۰ء میں وہ کلکتہ نہیں گئے۔ (مرتب)

[۳] غالب جب اودھ پہنچے تو معتمد الدولہ نائب السلطنت تھے۔ انھوں نے غالب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ غالب انہیں پیش کرنے کے لئے مختصر فارسی نثر صنعت تعطیل میں مگر ملاقات کے لئے شرط لگادی کہ آغا میر کھڑے ہوکر پذیرائی کریں اور مجھے نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے۔ آغا میر تیار نہ ہوئے اسلئے ملاقات نہ ہوئی اور وہ نثر پیش نہ کر سکے۔ (مرتب)

[۴] غالب جوئے کے الزام میں دو مرتبہ پکڑے گئے پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں۔ دوسری مرتبہ ۱۸۴۷ء میں اس بار چھ ماہ قید با مشقت کی سزا ہوئی

(باقی بصفحہ آئندہ)

ڑی گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا اس لئے انہوں نے اپنی کسر شان سمجھ ملازمت قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۴۹ء) میں بخطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ کے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا استاد شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلۂ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے۔ پنشن بند ہو گئی اور ان کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی۔ آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی اور یہ بے گناہ ثابت ہوئے تو ان کی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے استاد بھی تھے جو ان کو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بہ عمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے

عام حالات اور طبعی عادات

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدر دانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جس کو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ ان کی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی۔ محبت و ہمدردی ان کے خمیر میں پڑی تھی جیسا کہ ان کے خطوط اور اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی و گرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوئے مگر پھر بھی جس قدر ان کی آمدنی تھی وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلا تکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان ان کو ظاہر کر دیتے تھے مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو انہوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ ان کو اپنی خودداری

دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی مگر تین ماہ بعد ڈاکٹر راس سول سرجن دہلی کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے۔ (مرتب)

سنہ صحیح تاریخ یہ ہے ۲۲ شعبان ۱۲۶۶ھ / ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (ذکر غالب صفحہ ۹۱) (مرتب)

اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امرا سے وہ برابری سے ملتے اور اپنے علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب انھوں دلی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا کبھی کبھی ان کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہو جاتا تھا گر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ ان کے خانگی تعلقات خاص کر اپنی بیوی سے شگفتہ نہ تھے۔ مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل میلاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں تھیں مگر وہ سب بچپنے میں مرگئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاترالعقل تھے اور انہیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانے میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بچوں سے مرزا کو کمال محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں ان کی مالی حالت بھی درست نہ تھی ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو		اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

میرؔ کی غالبؔ بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میرؔ کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بےجا نہیں ہے بلکہ اس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ		میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں ان کی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے جس کی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی ان کی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ ان کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اس میں متانت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت تنفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا حتیٰ کہ

اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں "کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے" اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف وظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیئے جس میں ایسی باتیں مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر مرزا کا پایۂ شاعری بہت بلند ہے اور اس کو سب نے تسلیم کیا ہے وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور اُن کے معاصرین بھی اس بارے میں ان کی بڑی قدر کرتے تھے ان کو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ ان کے کلام کا قدر دان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیا ورید گر اینجا بود زباں دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ ان کی شہرت کا باعث ان کی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جس کی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے ؎

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال　　　مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیل ذائقہ کے لئے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے ان کو پڑھا تھا قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اس پر استغنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لے کر پڑھتے اور خود کبھی نہ مول لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جب کہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمائش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیئے تھے۔ عربی میں گو انہوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عروض کے استاد کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کماحقہٗ واقف تھے اور اس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے ان کو مطلق دلچسپی نہ تھی گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی ان کو کوئی لگاؤ نہ تھا[1] البتہ فارسی میں بہت سے نوحے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور ان کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جس کی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک مصوّر کی چابک دستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

---

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا یوں تو ان کے اُردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں ان کے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات مرزا اسیتا بیگ (باقی صفحہ ۲۱۸ پر)

تصانیف | حسب ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں[۱]:

(۱) عودِ ہندی (۲) اُردوئے معلّیٰ (۳) کلیات نظم فارسی
(۴) کلیات نثر فارسی (۵) دیوان اُردو (۶) لطائف غیبی
(۷) تیغِ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ
(۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو
(۱۳) سبد چین۔ "عود ہندی" اور "اردوئے معلّیٰ" اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔ "لطائف غیبی" مباحثے میں ہے۔ اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے "تیغ تیز" اور "نامہ غالب" بھی اسی مناظرے سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

"پنج آہنگ" میں فارسی انشاپردازی کے مختلف نمونے ہیں "کلیات نظم غالب" ان کے فارسی قصائد[۲] اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات، وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ "مہر نیمروز" تاریخ ہے۔ مرزا نے اس کو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اس کی پہلی جلد

زسال واقعۂ میرزا مپیتا بیگ ۔۔۔ کات را ست شمار ائمۂ امجاد
صحیفائے سماوی ببین از عشرات ۔۔۔ حد بقہائے بہشتی مشخص از آحاد
بحرمت دہ دو دہائی وچار کتاب ۔۔۔ کہ در نشیمنۂ از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں

جُستم از سال رحلتش اثرے ۔۔۔ گفت غالب کہ خود ز روئے شمار
از بروج سپہر جوئے کات ۔۔۔ عشرات از کواکب سیّار
گفتم آحاد گفت سُرمت باد ۔۔۔ از خدا وند واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲۔

[۱] ان کتابوں کی اولیں اشاعتیں۔ ۱۔ عود ہندی اکتوبر ۱۸۶۸ مطبع مجتبائی۔ ۲۔ اُردوئے معلّیٰ مارچ ۱۸۶۹ء اکمل المطابع۔ ۳۔ کلیات نظم فارسی ۱۸۴۵ء مطبع دار السلام دلی۔ ۴۔ کلیات نثر فارسی جنوری ۱۸۶۸ مطبع نولکشور۔ ۵۔ دیوان اردو۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء، سید المطابع دلی۔ ۶۔ لطائف غیبی ۱۸۶۵ء، اس کتاب پر بحیثیت مصنف میاں دادخاں سیاح کا نام درج ہے مگر حقیقت میں یہ غالب ہی کی تصنیف ہے۔ ۷۔ تیغ تیز ۱۸۶۷ء اکمل المطابع دلی۔ ۸۔ قاطع برہان ۱۸۶۲ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۹۔ پنج آہنگ اگست ۱۸۴۹ مطبع سلطانی دلی۔ ۱۰۔ نامہ غالب ۱۸۶۵ء مطبع محمدی دہلی۔ ۱۱۔ مہر نیمروز ۱۲۷۱ھ / ۵۵-۱۸۵۴ء فخر المطابع دہلی۔ ۱۲۔ مطبع مفید خلائق۔ (مرتب)

[۲] مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں۔

(باقی بصفحۂ آئندہ)

میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور " ماہ نیم ماہ " نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی " دستنبو " میں گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اس کے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ " سبد چین " میں چند قصائد اور قطعات فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے ان کے کلام پر کچھ اعتراض کئے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کئے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا ؎

آنکہ طے کردہ این مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے انہوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذہ اہل زبان پیش کئے اور کہا ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا   طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را   آں ظہوری جہان معنی را

مخالفین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور برافروختہ ہوئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی " باد مخالف " میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت " برہان قاطع " پر اعتراض کئے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا اور " قاطع برہان " نام رکھا اس کے ایک سال بعد اس کتاب کو جن میں ۲۸ قصیدے حسب ذیل تفصیل انگریز حکام کی شان میں ہیں ؎

نام ممدوح	تعداد	نام ممدوح	تعداد
کوئن وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ الن برا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈ منسٹن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میٹکاف	۱	مسٹر منٹگمری لفٹنٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں ۔۱۲

ترمیم کرکے اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے۔ کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "مؤید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "تیغ تیز" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامہ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بے موقع ہے مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے استاد کامل تھے اور ان کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسروؔ، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور — غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے جس سے ان کی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے یہ بات مزید پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ ان کا قول تھا ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اُردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے مگر با اینہمہ ان کی ذہانت و طباعی اور ان کی فطری شاعری کا پورا اثر ان کے اُردو کلام میں اسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح ان کے فارسی کلام میں ہے۔ مرزا کا اُردو دیوان تقریباً آٹھ سو ابیات سے زیادہ نہ ہوگا مگر اس کو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گرانقدر سرمایہ سمجھنا چاہیے۔ مرزا کی شاعری کا پہلا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تا عمر پچیس سال جب کہ انھوں نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور اس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام کو جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو انھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں ان کو بہت پسند تھیں۔ اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازک خیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطیٰ کے ان یورپی شعراء سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح "اسکولمن" کہتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازک خیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتے پہ یہ نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

"طرزِ نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں بعض اوقات ان کی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے۔ ایسے اشعار پر "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ ان کے مزاج کی افتاد بر واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے شاعری میں انہوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا اور فارسی کا ذوق ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلۂ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ ان کے معترف بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا مگر تھوڑی سی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی ترک کی بلکہ اس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔ ان کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ عجیب و غریب تشبیہیں ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں وہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو ان کے بعد کے کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ ان کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اردو کی آمیزش اس وجہ سے ہے کہ شعر اردو کہا جا سکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے گو ان کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان عیشؔ نے جل کر کہا کہ

قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے بھی ان کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آئندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے ان سے اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور ان کی افتادِ طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ ان کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں نئی نئی تخیلیں اور پرلطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اردو شعرا میں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ خیز تعالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ

کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخر کار یہ رنگ ترک کر کے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا اس میں زبان صاف ہو گئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتدبہ کمی ہے مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پرلطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دَور اور ان کے کمال فن کا لب لباب اور ارتقائے کمال کی آخری منزل ہے اس دَور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے ان میں ایجاز کے ساتھ سادگی۔ سلاست و روانی' نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجہ احسن موجود ہے اور انہیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صف اولین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کے خصوصیات
پہلی خصوصیت جدت پسندی

ہماری رائے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بنیاد۔ ان کی جدت طرازی پر قائم ہے جس میں جدت تخیل۔ جدت طرز ادا، جدت تشبیہات، جدت استعارات، جدت محاکات، جدت الفاظ غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات ایک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور سُبک تخیلی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معما کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حل ایک خاص لُطف پیدا کر دیتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرائے اُردو اور نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے ان کے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں بخلاف ان کے تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے ؎

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی ‖ ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

دوسری خصوصیت
نظر فریب طرز تحریر

اسی سے متعلق اور ملتی جلتی ان کے کلام میں نظر فریبی اور بات سے بات پیدا ہونا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منتشبہا

کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اس کے لوازم جمع کر لیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علیحدگی ہے جس کا شوق، بلکہ عشق ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا واقعہ جس کا اوپر ذکر ہوا اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرز تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، اُن کے خطوط، اُن کے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا		رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ان کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری سے عام دماغ لطف نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے۔ ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا	مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے اشعار ان کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں

وہ اپنے اشعار کے ذریعے سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے۔ کہیں ان کی ماندہ عظمت کا مرقع، کہیں ان کی حرماں نصیبی، کہیں ہجوم ناامیدی۔ کہیں جانکاہ مصائب، کہیں سعی بے حاصل، کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری۔ کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد۔ کہیں تعلقات دنیاوی سے دل بستگی اور اس کی خوشی اور اس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ ان کے لطیف اشعار، ان کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح پیرا میٹر ہیں۔

چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی	مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور ان کے اکثر اشعار حقایق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ رموز و حقائق تصوف

سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے، فرماتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم		ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور ان کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے۔ ان کی زندگی مذہبی رواداری آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسی طرح ان کا تخئیل عبادت بھی بہت بلند ہے کہتے ہیں ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود		قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اس میں نہریں جاری ہوں گی اور یہی سبب لطف حاصل ہوں گے جو دنیا میں ہوتے ہیں وہ متفق نہیں بلکہ اس کو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

ان کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدا سے جدا ہو جاتی ہے۔ نغمۂ زندگی کو ایک نالہ نے سمجھنا چاہیے جو نیستاں سے جدا ہونے پر نے بے اختیارانہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کس خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ عالم ظاہر مظہر روح حیات ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزّہ ہے غالبؔ کہتے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت جذبات نگاری

حقائق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے ان کے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں جو لازمۂ زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں، گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جس کے ساتھ دور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں، بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلی کی طرح تنگ مزاجی پائی جاتی ہے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو ان کے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے اور ان کے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر رنج و غم کی رفعت اور معصیت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر اس میں ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقے سے کیا ہے:۔

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

کلام میں ظرافت و شوخی مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اس کو ان کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں مگر ان کی ظرافت کبھی حدِ اعتدال سے بڑھ کر پھکڑ نہیں ہو جاتی اور متین سے متین آدمی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ان کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ، ان کی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے ان کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصور ہیں اور ان کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے ؎

نیند اُس کی ہے، دماغ اُسکا ہے راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ — یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

مرزا کو عجیب قوت ایجاز حاصل تھی۔ ان کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پُر تاثیر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر در پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر

اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد	یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[1]

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعراء سے

علو خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت وطباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق، مومن سے بڑھ کر ہیں۔ مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق ان سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس میں بھی ان سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہمعصر یا قریب العہد تھے ان کے کلام کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱) رابرٹ براؤننگ سے جو انگلستان کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سینٹسبری براؤننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز و حقائق کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقائق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں ان کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جا بجا پر تو موجود ہے۔ ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ براؤننگ کے کھڑے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مد مقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل ادراک، صوفی کی نگاہ۔ دوربیں، چابک دست مصور کا نازک ہاتھ۔ ان کی صنعت پُرکاری اور پُرکاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔ وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے سے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں	غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ان کا تصوف کوئی شغل دل بستگی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے ان کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہٰذا ان کی حسرت کی بھی داد دی جائے۔ یعنی اس کا ثمرہ نیک ملے۔ اس آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ

سورۃ النازعات سیپارہ ۳۰

غالب کے شاگرد غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں نیرّ و رخشاں تخلص کہ ان کے عزیز بھی تھے۔ میر مہدی مجروح، مرزا قربان علی بیگ سالک، خواجہ الطاف حسین حالی، مصنف یادگار غالب، منشی ہرگوپال تفتہ، نواب علاء الدین خاں علائی، زکی، عزیز، مشتاق وجوہر وغیرہ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں[1]۔

میر مہدی مجروح[2] متوفی سنہ ۱۹۰۲ء[3] میر مہدی مجروح خلف میر حسین نگار مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد دلّی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلی میں گونہ امن و امان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلی آگئے اور اپنے قدیم مشغلہ شعر و سخن سے دل چسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے بعد چند روز کے بہ تلاش معاش الور گئے جہاں مہاراجہ شیودھان سنگھ والی ریاست نے ان کی قدردانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رام پور کی قدردانی اور عنایت و مہربانی سے اسی ریاست میں چلے گئے اور بفراغت زندگی بسر کی۔ ۱۳۱۶ھ میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ اور شیریں ہے۔ چھوٹی بحروں میں ان کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدت ان کے کلام میں نہیں ہے مگر طرز ادا استادانہ ہے اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف ہیں۔ میر مجروح اُن لوگوں میں ہیں جن کو اُردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے اُردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نبایا۔ مرزا غالب کے اکثر دل چسپ خطوط عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ میں ان کے نام موجود ہیں

سالک متوفی سنہ ۱۸۹۳ء مرزا قربان علی بیگ، سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے حیدرآباد میں پیدا ہوئے[4] مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلی ہے۔ غرضکہ دلّی میں نشوونما پائی پہلے قربان تخلص

---

[1] مصنف کتاب بابو رگھوپتی سہائے صاحب اور مسٹر صلاح الدین خدا بخش اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

[2] پیدائش ۱۸۳۳ء تقریباً (مرتب)

[3] نواب احمد سعید خاں طالب نے قطعہ تاریخ وفات میں اغفرلی سے سال وفات بر آمد کیا ہے۔ ۱۰ صفر ۱۳۲۱ھ/ ۱۵ مئی ۱۹۰۳ (مرتب)

[4] سن پیدائش ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۴ء (مرتب)

کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے مگر جب ان کا انتقال ہوگیا تو غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ غدر کے زمانہ میں یہ دلی چھوڑ کر الور چلے گئے جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے اس کے بعد حیدر آباد گئے اور وہاں محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے۔ حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا۔ سالک کچھ عرصے تک اس کے مدیر رہے[1] سنہ ۱۲۹۷ھ میں حیدر آباد ہی میں انتقال کیا[2] "ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے مگر جدت سے خالی ہے۔ ان کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرثیہ بہت پُر زور اور درد انگیز ہے۔

ذکی متوفی ۱۹۰۳ء نواب سید محمد زکریا خاں رضوی متخلص بہ ذکی ایک عالی خاندان شخص تھے۔ دلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب سید محمد خاں اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ متخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور شاعر اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گو شعرا کا ہے[3] ذکی کی تعلیم دلی میں ہوئی اور ان کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فن طب، حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے جن سے ان سے کچھ قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے۔ ذکی کو شعر و سخن سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے جہاں کہیں جاتے تھے شعر و سخن کی محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور ان کے طرز کے متبع تھے خیال آفرینی اور جدت تخیل ان کے کلام کا جوہر ہے البتہ درد و اثر اس قدر کلام میں نہیں ہے۔ مثل ظہیر و انور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ، گورکھپور، الہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کرکے سنہ ۱۹۰۱ء میں بدایوں میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن پائی اور وہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا ان کا دیوان ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا اپنے زمانے میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے۔ بہت

---

[1] سال اجرا ۱۲ مئی ۱۸۷۳ء (تاریخ صحافت اردو جلد دوم کا پہلا حصہ ص ۵۳۵) (مرتب)

[2] سال وفات ۱۲۹۷ھ / ۱۵ دسمبر ۱۸۷۹ء - ۳ دسمبر ۱۸۸۰ء - امداد صابری بھی سنہ ۱۲۹۷ھ لکھتے ہیں (تاریخ صحافت اردو جلد دوم حصہ اول ص ۵۴۱) (مرتب)

[3] سرور کے اس تذکرے کا نام "عمدۂ منتخبہ" ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۲۱۵ھ تا ۱۲۱۹ھ ہے خواجہ احمد فاروقی نے اسے مرتب کرکے ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی تخلص
زیادہ مشہور تھے ۔

رخشاں[1] متوفی ۱۸۸۵ء | نواب ضیاالدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں و نیّر۔ نواب احمد بخش خاں رئیس
لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں کے نام منتقل کر دی
تھی جس کا انتظام نواب امین احمد خاں کرتے تھے۔ نیّر اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی۔ اور مرزا ان کو
اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیّر اپنے زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتے تھے
اور شعر و سخن کے بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت دلچسپی تھی چنانچہ
الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں ان کی جامعیت اور معلومات سے
بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں متخلص بہ ثاقب[2] نیّر کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی کے بھتیجے اور
غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شعر اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ ۱۸۶۹ء عین عالم شباب میں
بعمر انتیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں متخلص بہ طالب جن کی ولادت ۱۸۵۲ء میں ہوئی اپنے
بڑے بھائی ثاقب اور ان کے مرنے کے بعد میر مجروح و سالک و حالی سے مشورۂ سخن کرتے تھے کچھ
عرصے تک دلی کے آنریری مجسٹریٹ رہے پھر ۱۸۷۶ء میں پنجاب کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوگئے[3]
۱۸۸۵ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہوگئے تھے[4]

مرزا شجاع الدین احمد خاں متخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شادؔ
اور داغؔ کے شاگرد ہیں۔ ان کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی
اور یہ وہی مرزا باقر علی خاں ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔ تاباں اب حضور نظام کے پنشن خوار ہیں[5]
نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں داغ کے
ایک سربرآوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں[6]

---

[1] رخشاں۔ پیدائش اکتوبر ۱۸۲۱ء وفات جون ۱۸۸۵ء (مرتب)

[2] ثاقب پیدائش ۱۸۴۰ء (مرتب)

[3] طالب ۱۸۷۵ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ (تلامذہ غالب ص ۱۹۹) (مرتب)

[4] طالب ستمبر ۱۹۲۵ء کو فوت ہوئے۔ (مرتب)

[5] تاباں۔ وفات اپریل ۱۹۲۸ء (مرتب)

[6] وفات دسمبر ۱۹۴۵ء (مرتب)

آزردہ ۱۲۰۴ھ لغایت ۱۲۸۵ھ | مفتی صدر الدین خاں آزردہ خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور متبحر عالم تھے۔ اس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا۔ عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو تینوں زبانوں میں ان کو دستگاہ کامل تھی۔ ان کے علم و فضل کی اس قدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ سر سید مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ ان کو درس و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالبؔ۔ مومنؔ۔ ذوقؔ شیفتہؔ وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہو گئی۔ آزردہ تینوں زبانوں یعنی۔ عربی، فارسی، اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں اصلاح سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبر آبادی اور آخر میں میر ممنونؔ سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف و سلیس اور پر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کئے گئے۔ ان کا ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا۔ ان کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اس قدر نہیں ہے جتنی کہ ان کے علم و فضل کی ہے۔

باب ۱۳

دربار رام پور و حیدر آباد
امیرؔ و داغؔ کا زمانہ

بعد انتزاع سلطنت اودھ اور غدر ۱۸۵۷ء جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابو المظفر بہادر شاہ قید کرکے رنگون بھیجے گئے۔ لکھنؤ اور دلی، جو ایک عرصہ تک اردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندوستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مٹیا برج کلکتہ میں شعرا کا مجمع

وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا ان سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا برج میں ان کے ساتھ تھے سبعہ سیارہ کا خطاب دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرما گرمی تھی۔ مشاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے۔ اور مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔ ان سبعہ سیارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا بعض شعرا کے نام یہ ہیں: فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برقؔ۔ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارۂ جنگ متخلص بہ درخشاںؔ۔ مالک الدولہ وحید لت۔ گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہارؔ شاگرد رشکؔ۔ عیشؔ۔ مظفر علی مہرؔ جو غزل میں صباؔ کے اور مرثیہ میں مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے اور مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل متخلص بعالمؔ اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے

۱؎ ۱۸۵۶ء

کہ یہ دونوں بیویاں واجد علی شاہ کی بھتیں اُستاد تھے۔ اسی پُرلطف مجمع میں داغ اور نظم طباطبائی بھی پہونچ گئے تھے۔ ان صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اردو کا بنگال میں بہت چرچا ہوگیا تھا۔ وہاں کے مقامی شعرا میں اس زمانہ میں مولوی عبدالغفور نساخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے۔ چنانچہ تذکرۂ سخن شعراء، دفتر بے مثال، قطعۂ منتخب، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل۔ اشعار نساخ، گنج تواریخ، قند پارسی، ارمغان، باغ فکر وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ دبیر و انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ اور مفید ضرور ہے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں اسخ تھے۔

شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑکر نکلتے ہیں

پہلا سفر شعرائے دہلی کا اپنے وطن مالوف سے جس کا اشارہ صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے۔ چند اسباب پر مبنی ہے اور وہ یہ ہیں۔ یعنی افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی ان کے ہاتھ سے شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش معاش کی دقتیں۔ شعراء کی بے قدری اور بیکاری یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر شعراء اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لئے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد مرشد آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شوریدہ بختوں کو اپنی آغوش محبت میں بے تکلف جگہ دی۔ فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے۔ مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رؤساء وہاں کم تھے لہذا شعرائے دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب فیض آباد بدل کر لکھنؤ دارالسلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

فرخ آباد

فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رِند جو نواب احمد خاں بنگش[1] کے ایک معزز رکن دربار تھے۔ خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے۔ شعر و سخن میں انہوں نے میر سوز سے اور جب مرزا سودا دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو اُن سے بھی اصلاح لی تھی۔ سودا نے ان کی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسر اقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہوگیا۔

عظیم آباد

مہاراجہ شتاب رائے جو اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔ شاعروں کے قدردان

---

[1] نواب احمد خاں بنگش (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں فوت ہوئے۔ عہد بنگش) ان کی وفات کے بعد مہربان خاں رند کو زوال کا منہ دیکھنا پڑا، اور وہ فرخ آباد سے لکھنؤ چلے گئے، ان حالات میں وہ شاعر جو ان کی سرپرستی میں تھے۔ فرخ آباد سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ (مرتب)

اور خود بھی شاعر یکتا تھے۔ اُن کے بیٹے جوراجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیاء معاصر سوداؔ کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علی خاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور اُن کی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرائے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کی قدردانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرتؔ معاصر میرؔ و سوداؔ مرشد آباد گئے اور آخر الذکر وہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے۔ یہ اس زمانہ کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔

ٹانڈہ ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رام پور کے قریب واقع ہے، نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیرؔ کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رام پور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعراء نواز تھے۔ انہوں نے پہلے میر سوزؔ اور سوداؔ کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاندپوری کو جو خواجہ میر دردؔ و سوداؔ کے شاگرد تھے طلب کیا اور اُن کو وہ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اور انہیں کے شاگرد بھی تھے۔ مصحفی۔ فدوی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلہ خوار رہ چکے ہیں نواب صاحب کا انتقال بمقام رام پور ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔[1]

حیدرآباد پہلی مرتبہ شعراء اُس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دور و دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پنڈاریوں کی غارت گری کی وجہ سے پر خطر تھا۔ مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہنچ ہی گئے۔ چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد پہنچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی ان کے ایک شاگرد رائے گلاب چند ہمدمؔ نے "استاد از جہاں رفت" تاریخ کہی شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدرآباد گئے تھے۔

فیض آباد و لکھنؤ انتخاب فیض آباد کے وجوہ:۔

(۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعراء کی قدر یہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) امۃ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی

---

[1] یہ دربار ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۷۲ء میں سکرتال کی شکست کے بعد اجڑ گیا۔ (مرتب)

ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں ان کا وطن اصلی دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلّی والوں سے کمال محبّت اور ہمدردی تھی اور ان کے ساتھ اعلےٰ قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴)، نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اس وجہ سے لکھنؤ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبّت نصیب ہو گیا تھا۔ کچھ شعراء پر موقوف نہیں۔ دہلی کے تجار، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرضکہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت موجود تھے۔ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آدھی دہلی ادھر کھنچ کر آ گئی تھی۔ برخلاف اس کے ریاستہائے نظام ٹیپو سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلّی سے بہت دور تھے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور اس کو اپنا مستقل دارالحکومت بنا لیا۔ تو یہ ساری محفل وہاں سے اٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یا اُس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ یعنی مرزا سوداؔ، میر تقیؔ، میر سوزؔ، مرزا محمد تقی خاں ترقیؔ شاگرد میر سوز، طالب علی خاں عیشیؔ شاگرد قتیل، جعفر علی حسرتؔ، بقاءؔ اللہ خاں بقاؔ، میر حسنؔ، میر ولی اللہ محبؔ شاگرد سودا۔ میر حیدر علی حیرانؔ شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ[1]، میر ضاحکؔ میرزا فاخر مکینؔ، میر غلام حسین برشتہؔ شاگرد میر۔ ضیاءؔ، فغاںؔ، قائمؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، جراٴتؔ، رنگینؔ قتیلؔ، قاضی محمد صادق خاں اخترؔ، (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعراء بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعر و سخن کو گرماتے رہے نیز مرزا جواں بخت ولیعہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رہ کر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ میں رہنے تھے اُن کی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عنادل خوش الحان سخن کے دلکش ترانوں اور پر لطف نوا سنجیوں سے معمور اور مست ہو رہا ہے۔

شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا

طرز لکھنؤ کو نقصان پہنچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت اودھ کو سمجھنا چاہیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جس نے ہماری اُردو شاعری کو سخت نقصان پہنچایا۔ غدر ۵۷ء اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں

---

[1] سرب سکھ دیوانہ صحیح ہے (مرتب)

ظاہر ہوئی اس وجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا۔ قلعۂ معلیٰ کے رہنے والے جو اب تک شعرائے دہلی کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے۔ شعر و سخن کا کیا خاک خیال آتا۔ جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انہیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اکثروں نے رام پور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر وہاں کے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مربی تھے۔ کچھ لوگ حیدر آباد پہونچے۔ کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً الور۔ جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک بھوپال۔ منگرول (کاٹھیا واڑ)، مالیر کوٹلہ اور بہاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہو گئے کچھ ان ریاستوں میں رہ کر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے۔ مختصر یہ کہ رام پور اور حیدر آباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے۔ جنہوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعراء کا کچھ حال ہم اسی باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ الور نے بھی جہاں کے حکمران مہاراجہ شیودھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر۔ تصویر۔ نشتر شاگردان ذوق اور میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخر الذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ ارشد گورگانی مالیر کوٹلہ اور بہاولپور میں رہے۔ ٹونک منگرول اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور اپنے پدر بزرگوار نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۸۶۶ء میں مسند آرائے حکومت ہوئے یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ ان کے دربار میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور نواب سلیمان خاں متخلص بہ اسد زیادہ مشہور ہیں اسد میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں۔ مثلاً اصغر علی خاں آبرو۔ حبیب اللہ ضبط۔ عبدالرحیم خاں شرت۔ خواجہ سید کرامت علی خلش داغ کے شاگرد تھے انہوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوعہ دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور ۱۹۰۹ء عیسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی

شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

منگرول کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اس دُور و دراز مقام میں بھی اردو شاعری کا خوب چرچا ہوا۔ جس کی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدردانی کہی جا سکتی ہے ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلّی کے اُس وقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا۔ چنانچہ داغ۔ تسلیم۔ جلال اور شمشاد۔ جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے۔ اس قدردان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دُوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کی وجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے جو اُن کو اُن کے مکان پر برابر بھیج دی جاتی تھی

بھوپال فرماں روائے ریاست ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم[1] صاحبہ بالقابہا اپنی ریاست کیا بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ مسلم یونیورسٹی اور اسی طرح کی دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انہوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخدلی سے حصّہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے اُن کو عنایت کئے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس اُن کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے روپیہ سے قائم ہوئے۔ جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنر پروری کی یادگار رہیں گے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں[2] بہت سے قابل ابنائے وطن کو جو ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہونچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصّہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کر دیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اردو میں شیریںؔ اور بعد کو تاجورؔ اور فارسی میں شاہجہاںؔ تخلص کرتی تھیں[3]۔ انہوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب سے کر لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے۔ مفتی آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے۔ شعراء اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے اردو میں توفیقؔ اور فارسی اور

---

[1] نواب سلطان جہاں بیگم عہد ۱۹۰۱ - ۱۹۲۷ - وفات ۱۹۳۰ء [2] نواب سلطان جہاں بیگم کی تصانیف کی تعداد ۴۲ تک پہنچی ہے۔ یہ کتب مذہب، اخلاق، خانہ داری، معیشت معاشرت، باغبانی، حفظانِ صحت تاریخ و سیر۔ اور نصائح کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کتب کی تفصیل کے لئے دیکھئے اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ ص ۳۵۳ [3] شاہجہاں بیگم کے دو دیوان ہیں۔ "دیوان شیریںؔ" اور "تاج الکلام" ان کے علاوہ ایک طویل مثنوی "صدق البیان" بھی ہے۔ (مرتب)

عربی میں نواب[1] تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت[2] تخلص کرتے تھے اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوش گو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رام پور و حیدر آباد نے شعراء کے اجتماع اور قدر دانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے لہٰذا اُن کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رام پور ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رام پور میں بہ مقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن، سنج اور شعراء کے قدر دان تھے اور شعراء کی محنت و جگر کاوی کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے تیسرے یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُن سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر اُن کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔ ان کا دربار اسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود ان کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اوّل تو رام پور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رام پور کو یاد کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علی خاں نواب یوسف علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم دوست، ہنر پرور اور شعراء کے مربّی رئیس تھے خود بھی شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے صاحب دیوان تھے ابتدا میں حکیم مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے ان کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے۔ دلّی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے ان کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علماء و شعراء اُن کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۳ھ نواب کلب علی خاں کے عہد میں جو ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں

---

[1] نواب صدیق حسن خاں ان کا مجموعہ کلام گل رعنا کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں فارسی اردو کلام شامل ہے۔ [2] ان کا تخلص دولت نہیں، دولہ تھا۔ (مرتب) تے عہد حکومت ۱۸۵۵ء تا ۱۸۶۵ء

اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشین ہوئے اردو شاعری نے رام پور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریڈرک اعظم بادشاہ جرمنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مربی اور قدر دان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعراء کی قدر افزائی کرتے تھے ان کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی دانشمندی قدر دانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی اس ریاست میں اس وقت کے بہتر سے بہتر حکماء، کامل نثار، شعراء خوشنویس یہاں تک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکابدار وغیرہ سب موجود تھے۔ علماء کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیر آبادی علامہ عبدالحق مہندس، مولانا ارشاد حسین۔ سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ، حکما اور اطبا کے طبقہ میں حکیم محمد ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حکیم عبدالعلی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے۔ شعراء کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر۔ امیر۔ داغ جلال تسلیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج حیا۔ جان صاحب۔ آغا جو شرف شاگرد آتش۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیاء خواجہ محمد بشیر۔ منصور۔ رعنا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ اور سینکڑوں قابل اور لائق شخص پڑے ہوئے تھے۔ جن کی پرورش اور قدر دانی ریاست کرتی تھی۔ مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو مصاحب منزل کے نام سے مشہور تھا مگر باوجود ان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے۔ سوائے مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبدالحق اور منشی امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی علاوہ اس کے کسی کو مفت اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے مقرر تھے مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام و اکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عبدالغفار عبید اور

---

[۱] رام پور میں یہ شعراء مندرجہ ذیل سین میں آئے۔

مظفر علی اسیر ۱۵ مئی ۱۸۵۹ء۔ امداد علی بحر ۱۲۸۹ھ۔ ۱۸۷۲۔ امیر مینائی اپریل ۱۸۵۹ء۔ داغ آخر ۱۸۵۵ء کو آئے ۳ اپریل ۱۸۶۶ء کو ملازم ہوئے تسلیم نومبر ۱۸۵۵ء۔ دوبارہ ۷۶-۱۸۷۳ء۔ جلال ۱۲۷۲ھ۔ ۱۸۵۶ء منیر ۱۲۸۷ھ۔ ۱۸۷۰ء۔ قلق اگست ۱۸۷۵ء۔ حیا ۱۸۵۵ء۔ عروج ۱۲۸۸ھ۔ ۱۸۶۹ء۔ شاغل آخر ۱۸۵۵ء (نگار مارچ ۱۹۵۳ء) (مرتب)

اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی اُن کی خبر گیری خاص طور پر فرماتے۔ قرض داروں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے ان کو رہین منت کرتے تھے۔

نواب کلب علی خاں نے درسیات معقول و منقول مولانا فضل حق خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ پہلے انہوں نے اُردو فارسی نثر لکھنے کی مزاولت کی۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں۔ منجملہ جن کے بُلبُل نغمہ سنج۔ ترانۂ غم۔ قندیل حرم۔ اور شگوفہ خسروی زیادہ مشہور ہیں۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔ اُردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے اور اُنہیں مشورۂ سخن کرتے تھے اور چار دیوان ان کی یادگار اور ان کی اعلٰے قابلیت کے نمونے ہیں۔ نشید خسروانی۔ دستنبو، خاقانی۔ درۃ الانتخاب۔ اور توقیع سخن، نواب صاحب نوآب تخلص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا۔ اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے اُن کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے۔ جن میں بحر۔ تسلیم۔ جلال۔ امیر اور منیر وغیرہ، جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام، متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔

اس اجتماع شعراء کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا نواب نواب یوسف علیخاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ اُردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ اب تک منعطف نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز اُن کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے اُستاد کی اُستادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے بد سے بدتر ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے کلام میں اُس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے۔ مگر خوبیاں مفقود تھیں۔ اس طرز کے برتنے والے رامپور میں بحر۔ منیر۔ تلق اور اسیر تھے۔ برخلاف اس کے طرز دلّی کے پیرو داغ و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر انہوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا جس میں جرأت کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔ اُن میں اور لکھنؤ والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُن کے اشعار بہت مقبول ہوئے ہر شخص اُن کے رنگ کا دلدادہ تھا۔ تسلیم گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل دلّی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے نسیم کے طرز کی کیفیت ہم اُن کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں اُن کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا وہ اس کو ہمیشہ بُرا سمجھتے رہے اور جہاں

کہیں رہے اپنے اُستاد اور اُستاد الاستاد یعنی تسنیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے۔ اس وجہ سے اُن کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑسکا اور میر حسین تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے مختصر یہ کہ یہ دونوں سکول یعنی لکھنؤ اور دلی۔ آپس میں لڑتے، جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بے جا، لفاظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہوگیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اُس کو شدید نقصان پہونچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایۂ ناز تھیں رخصت ہوگئیں۔ اب لوگ شاعری کے صحیح جذبات اور اُن کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنؤ کے طرز قدیم کے شیدائوں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے اُن کا رنگ نہیں جم سکتا۔ مجبوراً اُن کو طرز دہلی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہورہی تھی، جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہٰذا اُن کے معاصرین کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پبلک کی پسند کا اتباع کرتے ہوئے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مدمقابل تھے اُن کو بھی اس رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان یعنی "صنم خانۂ عشق" داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں، اسی طرح اُنھوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاگردان امیر علی الخصوص ریاض۔ جلیل اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ جلال، رشک اور برق کے شاگرد تھے اور اُن کی نشو ونما بالکل لکھنؤ کے طرز پر ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا۔ چنانچہ ان کا ایک دیوان بالکل اُسی رنگ کا ہے اور اُس میں اُنھوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے۔ البتہ ایک بڑی حد تک اُس کی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اُس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہواری رسالے اور اُس کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرمانروائے رامپور | موجودہ فرمانروائے رامپور یعنی ہز ہائینس نواب سید حامد علی خان

صاحب بہادر مجمع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلاف کرام کے نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربی اور سرپرست ہیں ان کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے باکمالوں کا رامپور میں مجمع رہتا ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ ان کے جود وسخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درس گاہیں اور مفید تحریکیں ان کے فیوض نامتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی ۱۲۴۴ھ لغایت ۱۳۱۸ھ

منشی امیر احمد مینائی امیرؔ تخلص خلف مولوی کرم محمد ۱۸۲۸ء میں بہ عہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا کے جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے، خاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے۔ جفر و نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طباع محنتی اور جفاکش تھے۔ اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں جس طرح اپنی وضعداری اور سادگی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی اُن سے ممتاز تھے۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیرؔ سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی۔ شاگردانِ آتشؔ و ناسخؔ کے مناقشے، روز مرہ کے مشاعرے جس میں شہر کے اساتذہ مثل صباؔ و خلیلؔ و رندؔ و سحرؔ وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، مراثی کے زور و شور اور انیسؔ و دبیرؔ کے معرکے غرضکہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منچلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق سخن پہونچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا۔ اور اُن کو بُلا کر اُن کا کلام سُنا گیا اور حسب الحکم سلطانی دو کتابیں "ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان" انہوں نے تصنیف کیں جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اُسی وقت سے اُن کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا۔ جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاق اودھ اور غدر کی وجہ سے شعرائے دربار کے تمام حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ بعد غدر امیرؔ نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا

تھا۔ مگر جب عہدۂ صدر امینی کے واسطے صاحب جج کو درخواست دینے کے متعلق اُن سے کہا گیا، تو اُن کو یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تھوڑے روز کی بے کاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور نے اُن کو طلب کیا جو شعرائے لکھنؤ و دہلی کے اُس وقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا جس میں اُردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام ہندوستان کے نامی و گرامی شعرا اور باکمالوں کو بُلا کر اپنے دامن دولت کے سائے میں لے لیا تھا غرضکہ یہ زمانہ یعنی امیر کے قیام رامپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی میں ان کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی۔ اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ غرض کہ ۴۴ برس رام پور میں نہایت عزت و آبرو سے بسر کر کے جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا۔ بالآخر حیدر آباد کو روانہ ہوئے وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں جب نظام حیدر آباد کلکتہ سے واپس آرہے تھے، تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے امیر نے ایک قصیدہ اُن کی تعریف میں کہہ کر بمقام بنارس اُن کی حضور میں پیش کیا تھا حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیر سے حیدر آباد آنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ عازم حیدر آباد ہوئے۔ یہاں تھوڑے دن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوئے اور تہتر برس دس مہینے کی عمر میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ علالت کے زمانہ میں داغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اُن کی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ منشی صاحب کی اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری
رشکِ دمِ عیسیٰ ہے دمِ سرد مرا
درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

داغ نے وفات کی یہ تاریخ کہی

ذاسوخت اُردو"۔ "شکایات رنجش"۔ "صفیر آتشباز"۔ "حسد اغیار"۔ "غبار طبع"۔ اس مسدس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے (۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مؤلفۂ سنہ ۱۲۸۹ھ نعتیہ دیوان ہے (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے۔ جو نواب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں لکھا تھا۔ جیساکہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان آفرینش نثر میں مولود شریف ہے۔ (۱۴) مراۃ الغیب۔ اُردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے۔ (۱۵) صنم خانۂ عشق مطبوعہ سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۶) جوہر انتخاب (۱۷) گوہر انتخاب۔ مؤلفۂ سنہ ۱۳۰۱ھ یہ دونوں میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔ (۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔ (۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے۔ جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں اُن کا صحیح طریقۂ استعمال مع اسناد کے بتایا ہے۔ (۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت اُردو محاورات و الفاظ کی جس کو امیر اللغات کا نقش اوّل کہنا چاہیئے۔ (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور نیز اُن کی بے حد کدوکاوش اور محنت و جانکاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ تیسری بھی تیار تھی۔ مگر شائع نہ ہو سکی۔ ابتداءً آٹھ جلدوں میں اس کے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اس کے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریذیڈنٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی۔ منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے۔ (۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر میں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے۔ اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا اُن کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیرکٹر پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو اُن کی سوانح عمری کا بہت عمدہ مواد اُن سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز اُن میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے "رسالۂ اسرار نظم" اور

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ
مصطفےٰ آباد سے آیا دکن
(رامپور ۱۲)
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں
مبتلائے حدتِ صفرا و تپ
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ

جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیر
موردِ آزار و اسہال و زخیر
درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاعری میں خاص تلمیذ امیر

ہے دعا بھی داغؔ کی تاریخ بھی،
قصرِ عالی پائے جنت میں امیرؔ

تصانیف امیرؔ بہت پُرگو شاعر تھے اُن کی بعض نثر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان موسوم بہ "غیرت بہارستان"[۱] سُنا جاتا ہے کہ زمانۂ غدر میں تلف ہو گئے۔ پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی۔ جس میں اُن کی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ موجودہ تصانیف میں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔ اُن کے دو دیوان عاشقانہ۔ یعنی "مراۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" اور ایک نعتیہ اشعار میں موسوم بہ "محامد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات" نہایت قابل قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ اُن کی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:-

(۱) ارشاد السلطان۔ (۲) ہدایت السلطان (۳) غیرت بہارستان اس میں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد در مدح واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہوگیا۔

(۴) نور تجلی۔ (۵) ابر کرم۔ یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں

(۶) ذکر شاہ انبیا بصورت مسدس مولود شریف ہے۔

(۷) صبح ازل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔

(۸) شام ابد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔

(۹) لیلۃ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۲۸۴ھ ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار"

---

[۱] غیرت بہارستان ادارۂ فروغ اردو لاہور نے شائع کردی ہے۔ (مرتب)

"زادالامیر" اور "مناجات" وغیرہ کو اُن کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیئے۔

شاگرد | منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ ناظم۔ نواب صفدر جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیرآبادی۔ وسیم۔ حیران۔ محسن کاکوروی۔ عابد۔ رضا۔ دل، قرار۔ ثاقب۔ اصغر۔ مضطر۔ سرشار۔ حفیظ جونپوری۔ آہ۔ اختر۔ قمر۔ ان میں ریاض جلیل مضطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں

امیر کی شاعری | امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دنیا میں ان کی شہرت انہیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ ان کا پہلا مطبوعہ دیوان مرآۃ الغیب کسی قدر ناہموار ہے۔ کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھدّا اور بے مزہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشّاقی اور پختگی معلوم ہوتی ہے، ملی جُلی ہیں اُن کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی جا و بے جا رعایت لفظی ابتذال رکیک اور بدنما تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگیا کرتی۔ اور کنگھی چوٹی وغیرہ۔ غرضکہ اس میں کوئی چیز نئی اور نجیل نہیں ہے بلکہ وہی پُرانے فرسودہ مضامین ہیں جو اُلٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" اُن کے بڑے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلےٰ تخئیل سلامت و روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ اُنکے نعتیہ اشعار گوکہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اعلیٰ تخئیل۔ فصاحت و بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں غرضکہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی مخمس۔ مسدس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت و بلاغت، روانی وسلاست، توازن الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے حشو و زوائد اور صنائع بدائع لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال، بلند پردازی۔ شیرینی۔ زور اور قادرالکلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔ تصوّف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے اس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی مِلک خاص نہیں ہوتے۔ بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اخلاق وعادات | منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسّم تہذیب تھے۔ شرم وحیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی۔ راستباز، ہمدردی سے بھرے ہوئے، نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اور نہ کسی کی ہجو لکھی۔ سچے پاکباز۔ صوفی مشرب

دیتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور رندؔ کی صفائی مل جُلی معلوم ہوتی ہے۔ اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اُس پر طرّہ۔ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ سینکڑوں پیرو اور ناقل ان کے پیدا ہوگئے یہاں تک کہ ان کے بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر اُن ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض ذتت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے۔ داغؔ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور ان کے اشعار مہیج اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے کہ ان کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک و صاف اور بہت بلند ہیں۔ ان کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی زر اندود کلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے یہاں اصلیت (اوریجنلٹی) اور متانت بہت کم ہے۔ فلسفہ ان کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ خیال کی شرح و بسط ہے۔ فلسفہ حیات اور فلسفۂ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اُس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی حسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ ان کے معشوق اکثر معشوق بازاری ہیں جو اپنے حسن اور ناز و انداز کو سر راہ بے کر بیٹھتے ہیں۔ جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری کے خریدا اور بیچا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذب کانوں کے سننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جاسکتے ہیں۔ جہاں رندان قدح خوار جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جمگھٹے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متاثر نہیں ہوتے اور نہ اُن کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغؔ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُن میں میرؔ کا ایسا درد و اثر ہے نہ غالبؔ کی سی معنی آفرینی و نازک خیالی ان کی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جن کو سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں ان میں جدّت اور ندرت مطلق نہیں۔ ان کی مثنوی (فریاد داغؔ) میں تو ایک معشوق بازاری کے عشق کا حال ہے جس میں کوئی بلند "آئیڈیل" مطلق نہیں۔

مگر با ایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنا چاہیئے کہ انہوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کئے اور سیدھے سادھے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کئے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی ان کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحریں سُریلے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں چُست اور برجستہ

احکام قرآنی کے پورے عامل تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم وفضل اور کمالات شاعری کی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع اس قدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے بھی مسابقت کی کوشش نہیں کی بلکہ تمام اپنے ہمعصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ادبی مسائل کا جو اُن سے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے۔ اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔ قمر۔ آرزو۔ ضمیر۔ اختر۔ جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُس کا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔ منشی صاحب ایک بہت قابل اور اطباع شاعر تھے اور اُن کے اکثر اشعار زبان زد خلائق ہیں۔ اُن کا مرتبہ شعرائے اردو میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ | چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں ۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے کا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

لے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے اب اس پیراہن کو چھوڑ

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص
ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص

ترکش میں تیر میاں میں شمشیر بے قرار
دیکھو تو بے قراری نخچیر کے خواص

کہتا ہے شعر سُن کے کوئی واہ کوئی آہ
کچھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

ایک دل ہم دم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

ملا جب وہ کھُلا تب یہ مُعمّا
کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جدا ہے دخترِ رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیم جاں کرکے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے
ہاتھ اُٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں جفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں
وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختیِ جاں سے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے
وہ بھی عاشق کی التجا نہ سنے

باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا
ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے

خودی سے بیخودی میں آ جو شوقِ حق پرستی ہے
جسے تو مستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

بڑھا لے آہ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جانتا ہمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بت بولا
جا کے لے لیجئے کعبہ میں خدا رکھا ہے

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سَو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک وقت کو پا کر کہ ہے یہ وہ معشوق
کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی

داغ دہلوی ۱۸۳۱ء
تا بت ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں، نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۲ھ میں ہوا جب کہ داغ تقریباً چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خان تھا والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ پہنچے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا داغ کی منچلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہو گئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی۔ چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین صاحب سے پڑھتے تھے خوشنویسی شہسواری۔ بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا اور یہ فنون انہوں نے باقاعدہ استادوں سے حاصل کئے تھے شعر کا شوق ان کو جبلی تھا اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار شاعر ہو گئے ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے وفات پائی۔ مربی باپ کا مرنا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ نے ان کے رہے سہے حواس اور کھو دیئے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی قدر ہنگامہ فرد ہوا تو مع اہل

---

[1] نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ RAMBLES AND RECOLLECTIONS BY W. H. SLEEMAN CHAPTER IX (مرتب)

[2] داغ کی ماں چھوٹی بیگم نے نواب شمس الدین کے بعد ۱۸۴۰ء میں آغا تراب علی سے نکاح کیا۔ آغا تراب علی کا انتقال ہوا تو ۱۸۴۴ء میں چھوٹی بیگم کا نکاح مرزا فخرو ولی عہد سلطنت سے ہوا۔ (مرتب)

[3] مولوی غیاث الدین سے داغ نے تعلیم رام پور میں پائی جہاں وہ اپنی خالہ عمدہ خانم کے ساتھ ۱۸۴۴ء-۱۸۴۴ء کے دوران مقیم رہے [4] مرزا فخرو، مغل شہزادے تھے ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ قلعہ معلی کے مخصوص انداز میں تربیت پائی۔ دارا بخت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں بڑی مشکل سے ولی عہد بنے۔ زینت محل جو بہادر شاہ ظفر کی چہیتی بیگم تھیں اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانا چاہتی تھیں ایک غیر مصدقہ روایت ہے کہ انہوں نے مرزا فخرو کو زہر دیکر مروا ڈالا۔ (مرتب)

خاندان کے رام پور آئے جہاں نواب یوسف علی خاں بہادر جو ان کو پیشتر سے جانتے تھے اس وقت سر پر آرائے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغۂ اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی[1] اس خدمت کو خدمت کو انہوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اس وقت سے اُن کو گھوڑوں سے اور شہسواری سے دلچسپی ہوگئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں بہادر کی ملازمت میں رام پور میں گزارے۔ جہاں یہ نہایت عزت و آبرو، عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اس قدر آرام تھا کہ اس کو آرام پور کہتے تھے۔

نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت[2] سے بھی مشرف ہوئے تھے انہوں نے دلی، لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر ہوئی اور ان کے واسطے مشاعرے منعقد کئے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی۔ اپنے قیام کلکتہ کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کی بے ہنگام موت سے ان کی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھر گیا ان کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہنچا تھا۔ رام پور چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہ دلی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے نکلے اور راستے میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے۔ راستے میں لاہور، امرتسر کشن کوٹ، آگرہ، علی گڑھ، متھرا، جے پور اور ریاست سنگرول واقع کاٹھیاوار میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے دن قیام کرتے ہوئے گئے تھے۔ اور ان سب مقامات میں بیسیوں آدمی اُن کے شاگرد ہوتے۔ پہلی مرتبہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے بتوسط کرودھاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی۔ مگر چونکہ کوئی صورت حسب مراد اس وقت نہیں نکلی۔ لہٰذا دلی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۰۸ھ میں سر آسمان جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدرآباد گئے اور اب کی مرتبہ قسمت نے یاوری کی۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے اور بیش قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک"

---

[1] یہ خدمت ۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء میں ان کے سپرد ہوئی۔ (مرتب)

[2] ۱۲۸۹ھ میں حج کے لئے گئے۔

کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدرآباد میں نہایت کامیابی اور خوشی و خرمی سے گزرنے لگی۔ ان کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے۔ مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے، جو بیش بہا صلے اور انعام و اکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ حیدرآباد میں داغ کو دنیاوی ثروت کا جس قدر عروج حاصل ہوا، ہمارے خیال میں کسی اردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کئے۔ ان میں ایک ڈاکٹر مائل حیدرآبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہو گئے داغ تقریباً اٹھارہ برس حیدرآباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لے کر تمام امرا و روسا ان کی عزت کرتے تھے ان کی وجہ سے بازار شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا، سیکڑوں شاگرد ان کے حیدرآباد میں ہو گئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہر دل عزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے آخری زمانۂ قیام حیدرآباد میں امیر مینائی بھی رام پور سے آگئے تھے اور اُن ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو۔ انتقال کر گئے۔ داغ بعارضۂ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

عام عادات و اخلاق نواب مرزا خان داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور بشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خود داری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دُور رہتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اپنے معاصر شعرا مثلاً جلال، امیر، تسلیم، ظہیر وغیرہ سے اُن کے تعلقات بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی بڑی وجہ دربار نظامت میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے۔ ان کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے تبعین کثرت سے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت ان کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا جس کے کارکن بعض ان کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف چار دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ۔ یادگار داغ[1] آخر الذکر یعنی یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ[2] بھی لکھی ہے۔ ان کے علاوہ چند قصائد حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں، ایک پُرجوش شہر آشوب دلّی کی تباہی پر، اور چند قطعات و رباعیات بھی اُن سے یادگار ہیں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" دونوں رامپور میں چھپے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ کی ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں ان کی بے انتہا مشاقی اور نیز بڑی محنت و جاں فشانی معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں ان میں بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو ان کا خاص انداز ہے۔ خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہے جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے۔ بلکہ ذاتی تجربہ کا آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جس میں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر برخلاف ان کے مہتاب داغ اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہو کر ضیائے ماہتاب کے

---

[1] ان دواوین کی اولین اشاعتوں کے سنین یہ ہیں:۔

(۱) گلزار داغ ۱۲۹۶ھ / تاج المطابع رام پور
(۲) آفتاب داغ ۱۳۰۲ھ / مطبع انوار الاخبار لکھنو
(۳) مہتاب داغ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ مطبع عزیز دکن
(۴) یادگار داغ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ اسٹیم پریس لاہور

مرتب

[2] فریاد داغ ۱۳۰۰ھ / ۸۳-۱۸۸۲ء (مرتب)

مانند نہایت خوشگوار ہو گئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہو کر ان کی جگہ کہولت کی پختہ کاری اور سکون واطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی منّی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور جو داچھور کا میلۂ بے نظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی وعمدگی اُن کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں ان کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے ان میں کسی طرح کے بلند مضامین اور اعلیٰ تخیل نہیں ہیں غزل گوئی کا رنگ ان پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔ تشبیہ واستعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی رباعیات کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی بجائے ادب واخلاق وغیرہ سکھانے کے ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں۔ البتہ تاریخیں بہت اچھی اور اُستادانہ کہی ہیں۔

طرز کلام داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) ان کی شہرت عام (۲) ان کا طرز خاص (۳) وہ خدمات جو انھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں۔ داغ میٹھی، سریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو انہوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی۔ اسی سے ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی۔ ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست۔ شعر کی ظاہری زیب وزینت یعنی صنائع بدائع کی کثرت اور دور از کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو وزوائد سے بھی ان کا کلام پاک ہے اشعار بالکل تلے پنے زور دار اور موثر ہوتے ہیں۔ کلام میں زندگی اور چونچلا پایا جاتا ہے ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے جس قدر موضوع ہیں ان سب پر حاوی ہوتا ہے کہیں شوخ حاضر جوابی۔ کہیں ظریفانہ بذلہ سنجی، کہیں کسی واعظ پر چوٹ کی ہے، کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسوٹی ہے۔ کسی جگہ معاملہ بندی میں نیاز عاشقانہ اور ناز معشوقانہ کے بے مثل مرقعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرماں نصیبیوں کا ذکر ہے۔ کسی موقع پر رقیبوں کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے غرضکہ اشعار کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اس لئے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام

اور نہایت فصیح اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ غرض کہ ان ہی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کو اکثر مشہور و معروف لوگوں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے حالی لکھتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں ۔۔۔ نہ سُنے گا کوئی بُلبُل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پُرزور مرثیہ اُن کی نسبت لکھا ہے ان کے حریف و معاصر امیر مینائی کا صحیح معنوں میں کوئی مدمقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد | شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں۔ یہاں لکھے جاتے ہیں:۔ اعلیٰحضرت حضور نظام حیدرآباد خلد آشیاں یعنی نواب میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ سائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ احسن مارہروی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرتپوری۔ جگر مرادآبادی۔ آغا شاعر دہلوی وغیرہم۔

امیر و داغ کا مقابلہ | یہ مقابلہ بھی اُسی قبیل سے سمجھنا چاہئیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ اُن کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلّم الثبوت اُستاد ملنے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانے کے بہت بڑے غزال تھے اور اکثر ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشاءاللہ بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے۔ دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدۂ انام ہے۔ جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شاعر محظوظ ہو سکتے ہیں اسی طرح اس کو پڑھ کر یا دوسرے سے سُن کر ایک عامی بھی اُس سے

لہ آصف م ۱۳۲۹ھ

اقبال م ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء۔ سائل دہلوی م دسمبر ۱۹۴۵ء
بیخود دہلوی م ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ احسن مارہروی م ۱۹۴۰ء
نسیم بھرتپوری م ۱۹۰۹ء
جگر مرادآبادی م ۱۹۶۱ء (مرتب)

لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے کام لیتے ہیں اور جن کو داغؔ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیرؔ ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعریہ کو بھی پورا کرتا ہے۔ مگر اصل یہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آتے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتاد طبیعت کو اس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغؔ ایک بڑے زندہ دل رند مشرب شخص تھے ان کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا۔ پھر اُن کی نشو و نما دلّی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے منشی صاحب ایک مولوی منش تقدس مآب بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامن سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا دوستانہ رکھتے تھے امیرؔ اُن کے اُستاد اور برقؔ، صباؔ، سحرؔ، قلقؔ وغیرہ ان کے یار تھے۔ پس اُن لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت ان کی برابر رہی۔ یہاں تک کہ قیام رام پور اور داغؔ وغیرہ کی صحبت نے ان کا پرانا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا۔ منشی صاحب کا اوائل عمر کا جس قدر کلام ہے۔ وہ ناسخؔ اور شاگردان ناسخؔ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ ان کا دیوان "مراۃ الغیب" اس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ اس میں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدی اور بے مزہ تشبیہیں، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایت لفظی کی بھی بھرمار ہے، دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی استادی اور قدرت کلام کا پتہ دیتا ہے۔ مگر پھر بھی ناہمواری مندرجہ بالا سے مملو ہے۔ داغؔ کا رنگ اگرچہ دلّی میں قائم ہوا۔ مگر انہوں نے اس میں کچھ جدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنا لیا۔ یعنی جرأتؔ کی معاملہ بندی کو آتشؔ کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمو دیا اور اسی سے وہ چیز پیدا ہو گئی۔ جو داغؔ کا طرز خاص کہلاتا ہے۔ یعنی روزمرّہ اور زبان، محاورات کا برمحل استعمال لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دل نشینی، ان کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصّہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصّہ بہت سطحی ہے۔ ان کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز ان کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب نے داغؔ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مٹ جانے کے خیال سے انہیں کا رنگ اختیار کیا اور ہر چند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیلی رنگ کی وجہ سے اُن کے مابعد کے کلام میں پیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہو گئی مگر پھر بھی وہ داغؔ تک نہ پہنچ سکے

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ ان سے کم رہے۔ اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" "گلزار داغ" سے، اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہر حال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرز قدیم کو چھوڑ کر طرزِ جدید میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی۔

اگر ایک بلند نقطۂ نظر سے ان دونوں اُستادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حقیقی شعریت اور آتش الہامی جو قدیم استادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے۔ مگر با اینہمہ باعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی کے امیرؔ کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔ عروض اور ضروریات شعری کے اعتبار سے امیرؔ بہت بڑے اُستاد تھے ان کے کلام میں اس قسم کے سُقم شاذونادر ہی ملیں گے اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنف خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گو کہ اُن کے معتقدین اس بارہ میں بھی ان کی افضلیت کے قائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو ایک طرزِ خاص کے موجد تھے اور یہی ان کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت تو داغ سے یقیناً بہت بڑھی رکھتے تھے "امیر اللغات" اور اُن کے وہ خطوط جن میں انہوں نے اکثر نہایت پیچیدہ نکات ادبیہ حل کئے ہیں۔ ان کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عادل قصیدہ میں وہ سوداؔ اور ذوقؔ کے ہم پلہ کہے جاسکتے ہیں۔ البتہ ظہیرؔ دہلوی شاگرد ذوق اس صنف میں ان کے قریب قریب ہیں۔ ان دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ ان کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ جب سے کہ وہ حیدرآباد گئے اور وہاں ثروت و عیش ان کو نصیب ہوا۔ شاعرانہ جگر کاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رُجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اس قدر مقبول اور مشہور ہے کہ اس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعل عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لطف اٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
ڈر گئے نام شفا سُن کے زبسے خواہشِ مرگ
جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا
وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے

خانۂ عشق بے چراغ ہوا
منہ ذرا سا نکل آیا تمہارے بیماروں کا
کہتا تھا آج خاک میں کوئی مِلا ہوا
جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگے داورِ محشر سے ہے اُمید مجھے
لُطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا نہ تھا
خاطر سے یا لحاظ سے مَیں مان تو گیا
دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
وعدے پہ مرے اُن کے قیامت کی ہے تکرار
کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
کیسا جواب حضرت دل دیکھئے ذرا
لُطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
اُٹھ گئی یوں وفا زمانے سے
بظاہر رسما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے
جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مرجاؤ
رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
مریضِ عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو
گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم

کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا
عینِ حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
کیا کیا لبِ خاموش پہ قربان ہے اثر آج
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زبان کے ہیں
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
ترے کوچے میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی ہوتے ہیں
جو غش آتا ہے مجھ پہ تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے
کہ زندہ کوئی بھی تیمار دار باقی ہے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ	ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

جلالؔ لکھنوی[1]
۱۲۵۰ھ تا ۱۳۲۵ھ

حکیم سید ضامن علی جلالؔ حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی و عربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشہ طبابت کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق اُن کو شعر و سخن کا شوق بچپنے ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اس قدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلالؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں کچھ پختگی آ گئی تو انہیں کے توسط سے ان کے اُستاد رشکؔ کے شاگرد ہو گئے۔ رشکؔ اس زمانے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخؔ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور اُستاد اس قدر ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے ان کے پاس آتیں وہ ان کو بہ نظرِ اصلاح رشکؔ کے حوالے کرتے۔ جب رشکؔ سفرِ عراق پر روانہ ہونے لگے تو انہوں نے نوجوان جلالؔ کو نواب فتح الدولہ برقؔ کے سپرد کیا۔ جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا۔ روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت مثل بحرؔ، سحرؔ، اسیرؔ، امیرؔ، قلقؔ وغیرہ کے شریک ہوتے تھے۔ جلالؔ بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے کلام کو سنتے اور خود اپنی غزلیں سُناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ان صحبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور شعراء کو بجائے شعر کی تخییل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا اسی زمانہ میں اور انہیں افکار کی بدولت جلالؔ نے ایک دواخانہ شہرِ لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نند رائے کے مکان میں کھول لیا تھا جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے۔ مگر اس شغل میں بھی وہ اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اس کی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی قدردانی نے اُن کو رامپور گھسیٹ بلایا جہاں اُن کے والد داستان گویوں میں ملازم تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب نوابؔ کا انتقال ہوا اور والی ریاست نواب کلبِ علی خاں ہوئے تو انہوں نے حکیم صاحب کو بمشاہرہ ۱۰۰ روپیہ ماہوار ملازم رکھ لیا۔ حکیم صاحب اپنی تُنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی ان کو رام پور سے ترکِ تعلق

---

[1] ولادت ۱۲۵۰ھ / ۳۵-۱۸۳۴ء (مرتب)

نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رام پور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے جہاں اُن کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کے ان چاروں استادوں کی غزلیں جو اکثر ہم طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ ان سے تقابل کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف ریجنسی کے قائم ہونے سے یہ پُر لطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعرا سب تتر بتر ہو گئے حسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگرول واقع کاٹھیاوار کے رئیس با اختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدردانی اور شعرا کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے۔ حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کر لیا۔ مگر وہاں بوجہ دوری اور ناموافقت آب و ہوا وہ عرصہ تک نہ رہ سکے، چند ہی دن میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ میں واپس آگئے جہاں نواب صاحب موصوف ان کو پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار اور مبلغ سو ۱۰۰ روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ ان کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعر و شاعری اور اصلاح کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ بعمر چھہتر ۷۶ سال بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف حسب ذیل موجود ہیں:۔

(۱) چار دیوان۔

(۲) "سرمایۂ زبان اُردو" جو محاورات و اصطلاحات زبان اردو کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

(۳) "افادۂ تاریخ" فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) "منتخب القواعد" اس میں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے

(۵) و (۶) دو لغات زبان اُردو کے موسوم بہ "تنقیح اللغات" و "گلشن فیض"

(۷) "مفید الشعراء" ایک رسالہ درباب تحقیق تذکیر و تانیث۔

(۸) "رسالہ دستور الفصحا" جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

فہرست مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے استاد رشک کے انہوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کئے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا۔ اُس کو انہوں نے درجۂ تکمیل کو پہونچایا ہر چند کہ ان کی یہ تصانیف ایک

ابتدائی صورت میں ہیں اور ان کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلالؔ کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ ان کو بچپن سے حجت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی وہ اساتذۂ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے بے تکلف اُن کی غلطیاں اُن کے منہ پر کہہ دیتے تھے اور یہ عادت ان کی آخر عمر تک باقی رہی اسی کی وجہ سے ان سے اور ان کے معاصرین سے معرکتہ الآرا مناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

مزاج کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ جلالؔ ایک مغرور و متکبر اور ہمچومن دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرورِ سخن ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعراء تک سے ملنے میں ان کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ تسلیمؔ کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوقؔ نیموی نے دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلالؔ کی خوب خبر لی گئی اور ان کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور ان پر صدہا اعتراض وارد کئے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلالؔ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیاتِ کلام جلالؔ کو طرزِ لکھنؤ کا آخری متبع سمجھنا چاہیئے وہ قدیم اساتذۂ لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دلآویزی اور خصوصیت اور مابہ الامتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوئے اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے۔ جذبات یا انعکاس کا اُس میں کہیں پتہ نہیں۔ خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہی معمولی معمولی باتیں ہیں اور بعض اشعار تو اُن کی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے ہوئے ہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب و زینت کے مضامین جو قدیم طرزِ لکھنؤ کا مایہ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔ جلالؔ اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ کا بادشاہ سمجھتے تھے بہت پُرگو تھے اور شاید یہ پُرگوئی ہی بدمزگی کلام کا باعث ہو۔ مشہور ہے کہ بیس ۲۰ پچیس ۲۵ غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف ان کا روز مرّہ کا معمول تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے گلدستے ان کی اور ان کے شاگردوں کی غزلوں سے

بھرے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں ان کا پایہ بلند ہے۔

شاگرد | ان کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں۔ یعنی خود ان کے بیٹے کمالؔ جو ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہو گیا۔ میر ذاکر حسین یاسؔ اور اُن کے صاحبزادے آرزوؔ۔ احسانؔ شاہجہان پوری اور سردار اودھم سنگھ۔

آرزو[1] | سید انور حسین صاحب لکھنوی آرزوؔ تخلص خلف سید ذاکر حسین یاسؔ مثل اپنے والد کے جلالؔ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں۔ اور کمالؔ کے انتقال کے بعد جلالؔ کے جانشین بھی سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے امیدؔ تخلص کرتے تھے اب آرزوؔ کرتے ہیں فن عروض میں ان کو پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں مرثیے بھی کہے ہیں اور اب ڈراما نویسی کا شوق ہے۔ گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں۔ مگر طرز دلی والوں کا ہے۔ آرزوؔ کا کلام اُن کے اُستاد جلالؔ کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ جبکہ انہوں نے اپنے طرز کو دلی کے رنگ میں سمو دیا تھا۔ ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے۔ موجودہ شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

احسان | احسان علی خاں نام احسانؔ تخلص قاسم علی خاں کے صاحبزادہ ہیں ۱۲۷۶ھ میں بمقام اوڈھ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے اس کے بعد ان کے والدین شاہجہان پور چلے گئے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی سولہ برس کی عمر سے ان کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں تائبؔ کو دکھاتے تھے ۱۸۸۰ء میں جلالؔ کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں محکمۂ بندوبست گورکھپور میں سرکاری ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصری اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہان پور میں کام شروع کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "گلدستہ ارمغاں" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۸۹۳ء میں ان کا پہلا دیوان "خمکدۂ خیال" چھپا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور وہاں سے حیدر آباد گئے تھے۔ احسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلالؔ کے مشہور شاگردوں میں ہیں[2]۔

۱؎ ولادت ۱۸۷۲ء۔ وفات ۱۹۵۱ء ۲؎ وفات ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء (مرتب)

تسلیم سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء

قصر شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے سنہ ۱۸۲۰ء میں بمقام منگلسی جو نواح فیض آباد میں ایک گاؤں ہے پیدا ہوئے ان کے والد مولوی عبد الصمد پہلے بدو سرائے میں جو دریا آباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آ گئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیغۂ فوج میں بمشاہرۂ تیس (۳۰) روپیہ ماہوار ملازمت کر لی۔ تسلیم بھی بچپنے میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور ان کی علیحدگی کے بعد اُن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی و عربی کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ رام پوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی[1] کے ایک استاد تھے اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں بمشاہرۂ بیس (۲۰) روپیہ ماہوار ملازم تھے۔ شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور طرز دہلی کے تتبع پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی	مجھ کو طرز شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب ان کی پلٹن توڑ دی گئی۔ تو یہ بیکار ہو گئے۔ انہوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خان قبول شاگرد ناسخ کی وساطت سے پیش کی بادشاہ نے دیکھا اور اس پر یہ حکم لکھا ؎

بشنو اے خوشنویس و اے خوش گو	ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد	بست و دہ روپیہ مقرر شد

چنانچہ ان کا تیس (۳۰) روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے بعد انتزاع سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک نہ کوئی معقول ملازمت ملی اور نہ مقبول شعراء کے حلقے میں داخل ہو سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدۂ مدحیہ نواب کلب علی خان کے حضور میں جو اس وقت ولیعہد ریاست تھے۔ پیش کرنے کا

---

[1] راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۲۔ مترجم۔

موقع ملا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوئے اعزا سے ملے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نولکشور کے مشہور مطبع میں جس کو قائم ہوئے اس وقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا معمولی ہیں ملازم ہو گئے جہاں اُن کے استاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کو دکھاتے تھے۔ جب ۱۸۷۵ء میں نواب کلب علی خاں سریر آرائے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے اور اب کی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھادی گئی اور عہدہ نظارت و پیشکاری سے ترقی کر کے وہاں کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ نواب صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور ٹونک ہوتے ہوتے منگرول پہنچے جہاں کچھ دنوں قیام کر کے نواب عالی شان نواب سید حامد علی خاں بہادر والی رام پور کے طلب فرمانے سے پھر رام پور آگئے اس مرتبہ نواب صاحب نے از راہ قدر دانی چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن مقرر کر دیئے جو ان کو آخر وقت تک ملتے رہے۔ تسلیم نے اکانوے برس اس دنیائے ناپائدار کی سیر کر کے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف | کہا جاتا ہے کہ ان کا پہلا دیوان زمانہ غدر میں ضائع ہو گیا۔ مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں :-

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اس میں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور ان کی دو مثنویاں بھی ہیں (۲) نظم دل افروز" مطبوعہ رامپور (۳) "دفتر خیال" ایضاً چوتھا دیوان ناتمام سنا جاتا ہے کہ ان کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے ان کے علاوہ مثنویاں حسب ذیل ہیں :-

(۱) نالۂ تسلیم (۲) شام غریباں

(۳) صبح خنداں (۴) دل و جاں

(۵) نغمۂ بلبل (۶) شوکت شاہجہانی

(۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور

ان کے علاوہ انہوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفر نامہ یورپ منظوم لکھا ہے جسمیں تقریباً بتیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زوردار ہے۔ تمام اصناف سخن میں مثنوی سب سے اچھی ہے اور اس میں وہ اپنے ہمعصروں پر گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے ہیں۔ غزلیں اکثر پُر معنی اور پُر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" ہماری رائے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔ مگر پُرگوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی کلام کو پھیکا اور بے مزہ بنا دیا ہے۔ تسلیم تین باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور مثنوی کے لئے دوسرے مومن کے متبع کے واسطے۔ تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی کے وہ استاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبت و افلاس میں بسر کیا یہاں تک کہ بعض اوقات نقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اکثر اوقات ان کے احباب اور اُن کے شاگرد ان کی اعانت کرتے تھے۔ ان کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی داستان تھی جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مفلسی اور پریشان حالی نے ان کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑا پن اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا بلکہ برعکس اس کے وہ نہایت ملنسار اور متواضع واقع ہوئے تھے اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پر ان کو رشک و حسد کبھی نہیں ہوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

اُن کے شاگرد بہ کثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی۔ عرش گیاوی۔ حاجی محمد اسمٰعیل خان صبر معروف بہ بلبل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصۂ نثر میں لکھیں گے۔

چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دست جنوں	اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا
نالہ کھینچا ہے، دل ہے خفا، شوق ہے اُداس	تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
آبرو گر چاہتا ہے۔ کنج خلوت کر قبول	قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہو گیا
عمر بھر رشک عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال	وہ ملا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا

قطرۂ خوں بھی نہیں دل میں مرے	ہائے تو ہو گی زبان تیر کیا

کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دل امید وار کا

تسلیم کس کے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو
کیا اعتبار وعدۂ بے اعتبار کا

دل مرا تھا، گر گیا، گم ہو گیا، جاتا رہا
غم تمہیں کا ہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا

ڈھونڈھتا ہے روز و شب لیکر چراغ مہر و ماہ
کیا ترا اے آسمان پر جفا جاتا رہا

مرقد میں سفیدی جو کفن کی نظر آئی
سمجھا ہیں پس مرگ مرے ساتھ گڑی دھوپ

اور ہیں جن کو ہے شاگردی پہ اے تسلیم ناز
میں تسلیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

واعظ خدا شناس نہ ہوگا تمام عمر
اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں

پسنا ستم چرخ سے اُن منہ سے نہ کرنا
یہ بات مرے دل میں ہے یا برگ حنا میں

ڈراتا کیوں ہے اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حق نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احسان میں

گردش بخت بہت دیکھ چکے اے تسلیم
چل کے میخانہ میں اب گردش ساغر دیکھو

کرتے ہیں سجدے اس لئے دیر و حرم میں ہم
کیا جانئے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

طفل سے جو بت شوخ ہو آفت کا بنا ہو
وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو

کعبے کا ارادہ کئے نکلے تو ہیں گھر سے
آجائے وہ بت سامنے اس دم تو مزا ہو

عرش | ضمیر الدین عرش۔ صوبہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی بندہ علی وکیل گیا کے صاحبزادہ ہیں۔ ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انہوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم بہ "فکر عرش" داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شائع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم بہ "نظم نو نگار" تسلیم کے رنگ میں اور انہیں کا اصلاح کردہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے دو مختصر رسالے زبان اور فن عروض پر اور ایک تاریخ آگرہ و دہلی موسوم بہ "بارگاہ سلطانی" بھی ان کی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار پنچ کی اڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دربار حیدر آباد

حیدر آباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اوّل جس طرح شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے اسی طرح اُن کے مذاق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوئے حیدرآباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعراء اور اہل کمال کا ملجا و ماوا رہا ہے۔ فرمانروایان سلطنت اور امرائے دولت کا آوازۂ سخاوت اور شہرۂ فیاضی سُن سُن کر شعراء، علماء۔ فقہاء۔ محدثین شمالی ہند اور نیز دُور و دراز اقطار و امصار مثلاً ایران۔ عربستان۔ بخارا۔ سمرقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ یہ باکمال لوگ افکار دنیاوی سے فارغ ہو کر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زیب و زینت سمجھے جاتے تھے خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر پھر بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہو چکی تھی وہ کبھی بُجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اُس زمانہ کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے۔ مگر زمانۂ حال میں اُردو کا چرچا زیادہ ہو گیا ہے جس کی تفصیل آئندہ سطور میں کی گئی ہے۔

نظام الملک آصفجاہ اول ۱۶۷۱ء تا ۱۷۴۸ء

بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اوّل کا نام میر قمر الدین خان تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور دو دیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔ "شاکر" تخلص کرتے اور مرزا عبد القادر بیدلؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اردو میں بھی کہا ہو مگر ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء عیسوی

ہز ہائینس مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸ر اگست ۱۸۶۶ء مطابق ۶ر ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ر فروری ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحاب ذیل کے سپرد ہوئی۔ مولوی محمد زمان خان شہید، مولوی مسیح الزماں خاں۔ مولوی انوار اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین خوشنویس مرزا نصر اللہ خاں۔ مسٹر کلارک۔ سرور جنگ۔ افسر جنگ اور مٹو خاں وغیرہ۔ آپ کو زبان عربی و فارسی، اُردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا۔ علوم مروجہ کے علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے۔ نشانہ بے مثل لگاتے تھے آپ کے علم و فن اور شعر و سخن

کی قدر دانی کی وجہ سے تمام علمار و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے عہد کا مجمع دارالسلطنت حیدرآباد میں ہو گیا تھا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مولانا کرامت علی۔ مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام۔ مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی۔ مولوی وحید الزماں خان۔ مولوی مہدی علی۔ مولوی مشتاق حسین۔ مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی مولوی نذیر احمد۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سینکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلی اور نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں اور حیدرآباد میں ہن برسنے کا شہرہ سن سن کر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدر دانی کی بیّن مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت و اشاعت ہے۔ جس کے واسطے اعلیٰحضرت نے نہ صرف زر کثیر مصنف کو عنایت کیا بلکہ اس کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کے واسطے مقرر کر دیا تھا اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدر دانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں۔ مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی سوانحعمری نواب سر سالار جنگ بہادر تاریخ دکن وغیرہ۔ اسی در دولت سے مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا حالی۔ مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی۔ قدر بلگرامی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولوی عبدالحلیم شرر پروفیسر شہباز اور بیسیوں ایسے کاملان فن برابر فیضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے مشاغل علمیہ میں مصروف رہے۔ اُستاد شاہ بلبل ہندوستان نواب مرزا خاں داغ کی شہرت و ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ آخر میں ان کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئے تھے۔ علاوہ ان بیش بہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً فوقتاً اُن کو ملتے رہتے تھے۔

ہر چند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ اُن کی عمر نے وفا نہیں کی مگر ان کے صاحبزادے اختر مینائی اور ان کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن[1] جلیل اب تک درباری شاعر ہیں اور جلیل کو تو موجودہ حکمران کی اُستادی کا فخر حاصل ہے

میر محبوب علی خاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے اُستاد داغ کے متبع تھے دو دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حُسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی

---

[1] جلیل مانک پوری وفات ۱۹۴۶ء (مرتب)

بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے ۔ نہایت سلیس فصیح اور با محاورہ چُٹ پٹا کلام ہوتا تھا اور حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے ۔

موجودہ فرمانروائے دکن | ہز اگزالٹڈ ہائنس اعلیٰ حضرت سر عثمان علی خاں[1] بہادر بجمیع القابہ شعر و سخن میں اپنے پدرِ بزرگوار کے متبع ہیں ۔ آپ بھی نہ صرف قدردان و مربّی فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادۂ سخن ہیں آپ نے بھی اپنے دربار دُربار میں ایک مجمع شعرا ادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے ۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اس کو بے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دار الترجمہ کا قیام جس سے بہت سی بیش بہا غیر زبانوں کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہو گئیں ۔ آپ کے عہد زرّین کی ایسی یادگاریں ہیں ۔ جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔ آپ عثمانؔ تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے ۔ آپ حضرت جلیل سے استفادۂ سخن کرتے ہیں ۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے ۔ ہز اگزالٹڈ ہائنس زبان فارسی اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں ۔ اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں ۔

مہاراجہ چندو لال شاداںؔ ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء | امرا و رؤسائے ریاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعرا اور اہل کمال کے جو مرتبہ مہاراجہ چندو لال کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا شاداںؔ تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکارِ ریاست یعنی وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے ۔ مہاراجہ بہادر قوم کے کھتری تھے ۔ علاوہ خود اہل کمال ہونے کے اہل کمال کے بڑے مربّی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جو دو سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدرآباد میں مشہور ہیں اپنے زمانہ میں اس قدر مشہور تھے کہ ریاست حیدرآباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدرآباد چندو لال کا حیدرآباد کہلاتا تھا ۔ ان کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعرا اور اہل کمال وہاں جمع ہو گئے تھے اور جو مشاعرے خود انہیں کے محل سرا

---

[1] ۱۹۴۸ء میں حکومت ہندوستان نے حیدرآباد پر زبردستی قبضہ کر کے نظام کا پچاس لاکھ روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا ۔ اس کارروائی کے ساتھ ہی دکن کی مخصوص روایات کا خاتمہ ہو گیا ۔ سر عثمان علی خاں نے ۱۹۶۷ء کو انتقال کیا ۔ (مرتب)

میں ہر رات کو ہوتے تھے ان میں یہ صاحبان فن جمع ہو کر اپنا اپنا کمال دکھاتے۔ انہیں مشاعروں میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہو کر واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کئے گئے۔ مگر حب وطن اور راہ کی تعب نے اُس طرف جانے سے ان کو باز رکھا۔ مہاراجہ موصوف اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے چنانچہ دو دیوان اُردو اور ایک دیوان فارسی ان کی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدرآباد میں جمع تھے جن کی ماہانہ تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی ایک کتاب موسوم بہ "عشرتکدۂ آفاق" بھی ان کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گردھاری پرشاد باقی ۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۰ء

راجہ گردھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ بنسی دھر قوم کے سکسینہ کالیستھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی مشاہیر حیدرآباد سے ہیں اور ان کو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعرا کا شوق تھا۔ انہوں نے نواب مرزا خاں داغ کی جب وہ حیدرآباد گئے ہیں بڑی قدر اور مدد کی۔ اکثر کتابیں ان کی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں:۔ بھگوت گیتا کا ترجمۂ فارسی منظوم۔ کیشونامہ۔ کلیات باقی۔ قصائد باقی۔ پریس نامہ۔ کنز التاریخ۔ بقائے باقی سیاق باقی۔ پیرایۂ عروض۔ آئینۂ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی رباعیات نہایت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمس الدین فیض کے شاگرد تھے

مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شاد سنہ ولادت ۱۸۶۴ء

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم حیدرآباد زمانۂ حال کے بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالر ہیں۔ سلسلہ خاندانی ایک نہایت قدیم اور معزز دلی کے خاندان سے ملتا ہے۔ جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے کسی کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا۔ ان کے دادا مہاراجہ نریندر پرشاد اُس کونسل آف ریجنسی کے ایک رکن تھے جو جنت آشیاں میر محبوب علی خان کے زمانۂ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ مہاراجہ چندو لال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے ان کو زبان عربی و فارسی میں بڑے قابل اُستادوں سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی اس کے علاوہ انہوں

نے انگریزی اور تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہونچائی۔ مہاراجہ صاحب موصوف عربی و فارسی و اُردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی نہایت دلکش ہوتا ہے۔ شاؔد تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علی خاں کے شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ان کو "شاگرد خاص آصفجاہ" کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اردو جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسئی ادارت پر بھی چند روز آپ متمکن رہے[۱]۔ "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شائع ہونے کے لئے عطا فرماتے تھے۔ مہاراجہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا کلام مسائل تصوف سے لبریز ہے۔ ان کے دیوان اردو و فارسی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک دیوان معروف بہ "خمکدۂ رحمت" میں صرف نعتیہ اشعار ہیں اس ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہو کر آپ مذہب کو کس بلند نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کس قدر قائل ہیں۔ خاندانی روایات بذل و عطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چندو لال کے نقش پر چلنے کے لئے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۹۰ تصانیف آپ کی موجود ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ بزم خیال (۳ جلدوں میں) رباعیات شاد، ہدیۂ شاد۔ فریاد شاد۔ مطلع خورشید[۲]۔ ایمان شاد۔ خمارہ شاد۔ نغمہ شاد۔ ارمغان وزارت مخزن القوافی۔ مثنوی۔ آئینہ وجود۔ مثنوی سر وجود۔ وغیرہ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی و عربی اشعار کا اردو شعر میں ترجمہ یا تضمیں بہت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔ کلام میں حُسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی عہدہ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب "راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر" جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "یمین السلطنۃ" کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں کے سی۔ آئی۔ ای۔ اور ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا۔ ۱۹۱۲ء میں عہدہ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدان

---

[۱] دبدبۂ آصفی کے مدیر رتن ناتھ سرشار تھے، ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ/ اگست ۱۸۹۷ء کو جاری ہوا۔ شاد اس رسالہ کے سرپرست تھے۔ (مرتب)

[۲] مطلع خورشید، شاد کا ایک ناول ہے، جس پہ رتن ناتھ سرشار نے نظر ثانی کا کام کیا۔ (دبدبۂ آصفی ذوالقعدہ ۱۳۱۶ھ) (مرتب)

وزارت آپ کو سپرد ہوا ہے۔[1]

انجمن ترقی اُردو | یہ مشہور و معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ[13] چودہ[14] برس سے قائم ہے جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہردلعزیز آنریری سیکرٹری مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے۔ سیکرٹری صاحب موصوف کی ان تھک کوششوں اور چند لائق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت اور سب سے بڑھ کے اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ انجمن زبان اردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت کام انجام دے رہی ہے۔ زبان انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہوگئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ۔ تمدن۔ ایبٹ کی سوانحمری۔ نپولین بوناپارٹ پلوٹارک کی سوانحمریاں حکمائے یونان وغیرہ کی۔ لیکی کی تاریخ اخلاق۔ ان کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاق اقتصادیات تاریخ کی۔ خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شائع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اُردو کی اکثر پرانی کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ اردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اس کو باقاعدہ اور سہل القراۃ بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر براون کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سُنا ہے کہ ترجمہ ہوگئیں اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی کی بیش بہا تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہوگیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعوں اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔ آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اُردو ترجمہ کا حکم ہوگیا ہے اور اس کام کے لئے تقریباً بیس پچیس آدمی متقرر ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائے گی۔ تو یقیناً مفید چیز ثابت ہوگی۔ سُنا گیا ہے کہ انجمن اردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو اُن کے پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہئیں تاکہ جو کام

---

[1] وفات ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء (مرتب)

شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ "اردو" جو زیر ادارت سکریٹری صاحب موصوف نکلتا ہے..... ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے اور اس میں زبان اور ادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیر ادارت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاری کیا ہے۔ جس میں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں یہ بھی مثل "اردو" کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہوں گی۔[1]

عثمانیہ یونیورسٹی "عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی و ادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصۂ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہز اگزا لٹڈ ہائنس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہ ہائے علوم کی تعلیم زبان اردو میں ہوتی ہے۔ انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبجکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلباء اس زبان سے بھی نا آشنا اور انگریزی بولنے والی دنیا کے حالات و خیالات سے بے خبر نہ رہیں۔ اب تک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے۔ جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلباء کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کر لی ہے اور اس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی

---

[1] تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو دلی سے کراچی منتقل ہو گئی، اور یہاں تحقیقی کام کی اشاعت کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۸ء تک انجمن اندرونی خلفشار کے باعث صحیح کام نہ کر سکی۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے پر حکومت نے انجمن کی تنظیم نو کے لئے تمام اختیارات مولوی عبدالحق کے سپرد کر دیئے جس سے حالات بہتر ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا۔ آج کل انجمن کے صدر اختر حسین ہیں۔ اب انجمن تندہی سے اپنی اشاعتی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس کے دو رسالے "قومی زبان" اور "اردو" مشفق خواجہ کی ادارت میں قابل قدر علمی و ادبی مقالے شائع کر رہے ہیں۔ قومی زبان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پاک و ہند کے رسائل کا اشاریہ ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہ ہائے الٰہیات (تھیالوجی)، علوم و فنون (سائنس و آرٹس)، اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ[1] | عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنے کی غرض سے "دارالتصنیف و الترجمہ" قائم ہے۔ جو یونیورسٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اس کی قابل قدر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہو گئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں اس میں آٹھ قابل مترجم زیر نگرانی ایک افسر اعلیٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنّف ہیں، کام کرتے ہیں۔ دارالترجمہ کی خدمات قابل تحسین و آفریں ہیں۔ خاص کر جب ہم ان دقتوں کا خیال کرتے ہیں۔ جو علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہران فن کی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ و اصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شائع ہو گئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہز اگزالٹڈ ہائنس نے اس کی عمر میں دس برس کی اور توسیع کر دی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں علاوہ مکمل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف و تراجم داخل ہیں: تاریخ (جس میں مشرقی اور مغربی اور قدیم و جدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے) فلسفہ۔ اقتصادیات۔ ریاضی (خالص اور مخلوط دونوں)، طبیعیات۔ کیمیا اور قانون۔ جب فن تعلیم و انجینیری اور طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی جائیں گی۔ جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے۔ مصنفہ اور مترجم کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں۔ مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبان اردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے[2]

---

[1] قیام ۱۹۱۷ء

[2] ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدرآباد کے بعد دارالترجمہ کی حیثیت ختم کر دی گئی۔ (مرتب)

باب ۷

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرزِ جدید کے پیشرو | اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانہ مابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہونے والی تھی ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا۔ جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے اور شاعری میں اصطلاح کا رُخ دکھا دیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرزِ جدید کا تخم یقیناً موجود تھا۔ جس کی آبیاری بعد کے آنے والے نے کی اور انہیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظرِ قدرت واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا حسن و خوبی اظہار، نصائح آموزی، کیفیات قلبیہ کا اظہار الفاظ میں سلاست و روانی، تشبیہ و استعارے کا حد سے متجاوز نہ ہونا یہ سب باتیں جو زمانہ حال کی شاعری کی جان ہیں پرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں اس آنے والے انقلاب کی خبر دے دی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروغ و تمہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول

چیز سمجھ کے اختیار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو بگڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو طرزِ قدیم کے دلدادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اس نے ان کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش و خراش کی اس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حسن ظاہر کو دیکھتے تھے۔ اس وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور نیچرل کلام ان کو پسند نہیں آیا۔ ان پرانے خیالات کو محو کرنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جس کی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

انقلاب کا اثر انقلاب زمانہ اردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا دلی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعرا کے سرپرست اٹھ گئے اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جن کی نسبت زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ انکے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمرا کے شعرا کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رامپور و حیدرآباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصہ دراز تک ان کے پاؤں نہ جم سکے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے اُمرا کو صرف دولت کے اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کے مالی نفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے تھے۔ جن کی دنیا میں نثر کی صاف اور سادی صبح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے۔ اب وہ پرانے رنگ کے تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک مقبول ہے۔ دہلی کی تباہی انتزاع ملک اودھ اغدر ۱۸۵۷ء اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی میں مبتلا ہو گئے ہندوستانی ریاستیں گو ان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتار زمانہ کے موافق ان کو بھی اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضرور تھی۔ اس وجہ سے وہ ریاستیں جو شعرا کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جس کا اثر شعرا کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر انگریزی تعلیم سے بھی اُردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور ان کو بڑی تقویت پہنچی۔ انگریزی تعلیم نے زبان اُردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ رینا سانس[1] نے سولھویں صدی میں اور رومانس را فسانہ نگاری کے شوق نے اٹھارویں صدی میں کیا تھا۔ ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جس میں نظم، نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے۔ بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اُردو زبان کے اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبانِ انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اس جدید رنگ سے ان تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے۔ جو خود انگریزوں کے ایما سے کرائے گئے تھے مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور انہوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں زمانہ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ بدل ڈالیں اور اس میں ایک جدت کی چاشنی پیدا کریں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعۃً نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے رہنماؤں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب و احترام اور نیز اُن کے رنگ کی مدح سرائی اور قدر دانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مولانا حالی کی یادگار غالب" اور آزاد کا مطبوعہ "دیوان ذوق" ہمارے اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت فگن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے۔ اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اس میں جدید رنگ بھی شامل ہو کر اس سے پرانے رنگ کا تصنع اور تکلف جاتا رہے۔ فضول مبالغے دور از کار تشبیہیں، بے مزہ لفاظی، ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور ان کی اصلاح کی بنیاد انہیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

---

[1] نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنون لطیفہ بلکہ جمیع مُروجہ علوم و فنون کا قرون وسطیٰ کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز اختیار کرنا۔ ۱۲

جدید رنگ کی خصوصیات

جوں جوں جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اسی قدر وہ مقبول ہوا اور اس کے معروف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے بالکل نا آشنا تھی اس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبجکٹ اور مضامین تلاش کئے گئے۔ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ اور بے مناسب پایا گیا۔ مسدس اور مثنوی کا دور دورہ ہوا کیونکہ ان اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مسلسل کیا جا سکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے ایسے مضامین جن کی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کئے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ کی گئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور ان پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا۔ مثلاً برکھا رت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کے خوش نما مناظر اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں۔ نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پولیٹیکل نظمیں، اشعار بصورت سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پرانے فرسودہ مضامین زلف و کاکل کنگھی چوٹی مسی کاجل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے۔ اب جذبات انسانی، اور کیفیات قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کا نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کیا جانا داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

اصناف سخن میں جدتیں

ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اردو میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبان اردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک ورس (نثر مرجز) کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کہنہ مشق استادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی مولانا

شرر[1] مرحوم، آزاد کاکوروی وغیرہ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں مگر ان کو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدت کی ہے کہ ہندی دوہروں کی پیروی اردو نظم میں شروع کر دی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بھلا دیئے گئے تھے ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیہ کے واسطے مخصوص ہو گئی تھی۔ مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب مد و جزر اسلام "المعروف بہ مسدس حالی لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنف خاص کا بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اس قدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نیچرل بیانیہ، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے تاریخی نظمیں، سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے اس کی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلہ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لطف اور ترنم بڑھ جاتا ہے۔ مسدس کے علاوہ اور اصناف نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسب اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے نفس شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئی ہیں اور اب سادگی صفائی اور واقعیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ موجودہ کی نظمیں بہت موثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات انگریزی طرز تعلیم نے اس افسردگی کو دور کر دیا جو آخر میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری پر چھا گئی تھی۔ اس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ نثر کی ترقی اور جدید فن تنقید اور ڈرامانویسی کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرہ الفاظ نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مضمون نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامان زینت فراہم ہوتے نئے نئے خیال ہاتھ آتے اور ان خیالات کے اظہار کے لئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اس کی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہو گئی

---

[1] شرر کی یہ نظمیں علگداز میں شائع ہوئیں۔ (مرتب)

کر معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کر سکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا۔ کہ ان کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا مطمع نظر محدود ہو گیا تھا۔ اور ان کی ذہانت و طباعی زنگ خوردہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اس کی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہو گئی اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں، اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں ان کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اس نے ان میں اتنا تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے کہ زمانہ حال کی تصانیف ان زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اسی کی وجہ سے پیدا ہو گئیں۔ مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپرواہی۔ ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت دفع ہو جائیں گی۔

جدید ادب اردو کے تین طرز

پہلا طبقہ

پہلا طرز ان لوگوں کا ہے جو پس پشت دیکھنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانہ موجودہ کے گذشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جس میں کچھ فلسفہ کچھ تصوّف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انہیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ رہتا تو البتہ معذور تھے مگر بغیر کسی تعلق کے یہ تو قدما کے محض نقال کہے جا سکتے ہیں یا لفظی کے شعبدہ باز۔ پرانے مضامین کے ساتھ پرانی بحریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی ان کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر انگریزی شاعر پوپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

" وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کے باپ بھی شعر کہتے ہیں اور اپنی

ذہانت سے اپنی ناخلفی کا اظہار کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقال کہے جا سکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آج کل کے رسالے اور گلدستے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیروی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرض کہ طرز قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیرو زمانہ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور فی الحقیقت اگر زمانہ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے شاعری کا لنگڑا حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ یہ طبقہ اول کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے اپنے ملک کی پرانی روایات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے۔ مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا ہے کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے ان لوگوں کے دماغوں کو بگاڑ دیا اور انہیں اتنا مدہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پرانے زمانے سے اور پرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا ان کی بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ان کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالات ملکی کے مناسب ہے یا نہیں اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کئے گئے ہیں ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدہ عوام ہیں۔ مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم

اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں۔ جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرز تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو انگریز جورنلیس کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی ناقص اور نامکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے یہ حال عام طور پر ان کرایہ کے ٹٹو ناول نویسوں کا ہے جن کی لغو اور مضر تصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے۔ نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے۔ پرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نامکمل ہو۔ رنگ فوق الیھٹرک ہو۔ اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ بدنمائی کو خوب صورتی پر، بھدے پن کو حسن تناسب پر اور شور و غل کو نغمے پر ہرگز ترجیح نہ دیں۔

تیسرا طبقہ یہ ان اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گو زمانہ موجودہ میں ہیں مگر زمانہ گذشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں یہ روایات قدیمہ کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سے ان میں اوریجنلٹی یعنی اصلیت ہے۔ ان کی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق جلیسن کی تھی جو ایک سنہری بھیڑی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب و شاعری کی سیر کرتے ہیں۔ ان کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیئے جو ایک ملک میں مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ ڈالتا ہے بلکہ یہ راس المال شاعری کے صناع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور اس سے نئی نئی خوب صورت چیزیں بناتے ہیں یہ اپنے شعروں سے اپنے اور نیز اپنی قوم کے دل و دماغ کے واسطے غذائے روحانی تیار کرتے ہیں۔ یہ زمانہ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانہ آئندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا اور نثاروں کو داخل سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً حالی، آزاد، شرر، سرشار

سرور، مولوی محمد اسمٰعیل، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں قلمبند کئے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کر لیا ہے اور انہیں پر آئندہ ترقی کی امیدوں کا دارومدار ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے۔ جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے۔ اور بزمانہ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ اور کچھ گاؤں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر کر دیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوتے تھے۔ اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت ان کے سپرد ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ ان کے والدہ کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی۔ لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت کا بار ان کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد انہوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میر ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی۔ اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبرگیراں خوش حال ہیں بے پوچھے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں دلی چلے گئے یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے۔ سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے اس وقت ان کو صرف و نحو۔ منطق۔ عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزا کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی۔ مگر غدر ۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس

آئے۔ اب کی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں غرض کہ تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد ان سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہو گئی اور نیز ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا[1] نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھایا اور ان سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں، جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ ان کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفاضہ سخن کرتے تھے ؎

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں !		شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میرؔ کا	

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت، وہاں کی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا ہے از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالبؔ کے پاس بہ نظر اصلاح دلی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلّم کے تقریباً آٹھ برس رہے اس کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لئے لاہور آئے[2] جو اس وقت دلّی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں ان کو گورنمنٹ بکڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں ان کو سررشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اسی کام میں انگریزی ادب سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی لہٰذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشا پردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہو گئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہوں گے

---

[1] حالی شیفتہ سے ۱۸۶۳ء میں وابستہ ہوتے۔ (مرتب)

[2] حالی ۱۸۷۲ء میں لاہور پہنچے تھے۔ (مرتب)

کر وہاں سے دلی واپس آنا پڑا جہاں ان کو انگلو عربک سکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی۔ لاہور میں جیفیس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچر رہ چکے تھے مگر وہ جگہ ان کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلی میں سرسید مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی جن کی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدس حالی" لکھا ۱۸۸۷ء میں جب کہ وہ عربی کالج میں معلم تھے سر آسماں جاہ علی گڑھ آئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُن کا تعارف کرا دیا اور انہوں نے ازراہ قدردانی و مردم شناسی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے ان کا مقرر کرا دیا۔ بعد کو جب کہ مولانا حالی علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے ۱۹۰۴ء میں خطاب شمس العلما بجلدوے ان کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستتر برس کی طویل العلماء عمر میں ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دار ناپائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے بالکل علیحدہ تھے۔ اُن کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ کے وہ پورے عامل تھے۔

حالی کی شاعری اور اس پر غالب اور شیفتہ کا اثر

حالی کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی۔ جب کہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور انہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکات شعر یہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی ان سے بہت خوش تھے اور ان کی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے دلی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کے رنگ میں

پختگی آئی نواب صاحب کی صحبت ان کی شعر گوئی کی محرک ہوئی تھی اور یہیں انہوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا اب ان کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے کسی چیز کا من وعن بیان سیدھے سادے الفاظ میں جس میں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو۔ اب ان کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور انہیں کا رنگ ان پر غالب تھا۔ ہرچند کہ شیفتہ کا اثر اور رنگ ان کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آئے۔ مگر یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو انہوں نے قلمبند کیا ہے اس سے ان کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں ان کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔ یہ زمانہ ان کی علمی زندگی کے رخ بدل جانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اس جدید رنگ کی ابتدا بخوبی نظر آتی ہے اور اس کی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے ان کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں ایک ادبی انجمن قائم تھی جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اس کے سرپرست تھے اس انجمن[1] کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے۔ یعنی نہ تو کوئی مصرعہ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کی جاتی لوگ اپنے اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے۔ جو انجمن کی طرف سے پہلے

---

[1] اس ادبی انجمن کا نام "انجمن پنجاب" تھا جو ۱۸۶۵ء میں علمی ادبی اور سماجی کاموں کے لئے لاہور میں قائم ہوئی انجمن پنجاب کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس کے جلسوں سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے کا پہلا جلسہ ۱۹۔ اپریل ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ جس میں آزاد اور مسٹر ہالرائیڈ نے جدید شاعری کے آغاز اور اس کی بنیادوں پر لیکچر دیئے۔ (مرتب)

سے مقرر ہو جاتا تھا۔ انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالی گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اس کے ابتدائی سرکار میں ضرور تھے اور اس کے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی چار نظمیں" برکھارت، نشاط امید مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔

سرسید کا اثر غالب اور شیفتہ کا اثر ان کی شاعری پر سطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا چاہیئے کہ سید مرحوم نے ان کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے چونکانے اور ان کی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ جب انہوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھو۔ مسدس حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبول عام ہو گئی ان کا رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بہت سے تابع پیدا ہو گئے مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جس کے وہ فی الواقع مستحق تھے اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوتے۔ مسدس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خاں صاحب کا مرثیہ جس میں مسلمانوں کی زمانہ گذشتہ کی عظمت اور زمانہ موجودہ کی پستی کا نہایت موثر الفاظ سے نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے ان کی شہرت ایک ریفارمر اور خطیب کی ہو گئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پر زور اور موثر الفاظ کے ذریعہ سے ابھارتے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہو سکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ ان کے مخاطب ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل ہند تھے ان کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" کی صورت میں ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ اُن کی نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائیں گی۔

(۱) مثنویاں۔ مناظرہ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھارت۔ نشاط اُمید۔ حب وطن (۲) مسدس حالی (۳) تذکرۂ ہند (۴) "کلیات حالی" جس میں اُن کا دیوان مع مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا ہے (۵) مناجات بیوہ، اور چپ کی داد

(۶) مراثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعۂ نظم حالی جس میں اُردو کی متفرق نظمیں ہیں (۸) مجموعہ نظم فارسی جس میں فارسی کا کلام ہے۔

مثنویاں ان کی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مستغرق مبالغے اور صنائع بدائع سے خالی ہے ان میں اخلاقی تعلیم نہایت موثر اور دلفریب انداز سے دی گئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جس میں ہر فریق کی اچھائی اور برائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کی گئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ مثنوی برکھارت بھی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثنوی ہے اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دلفریبی سے بیان کیا گیا ہے مثلاً بارش کے فائدے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرش زمردیں کا بچھ جانا بلکل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور امنگ کا پیدا ہونا وغیرہ۔ اس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت نیچرل ہے فضول مبالغے اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے اس میں مطلق نہیں۔ یہ اس رنگ کی ابتدائی تصنیف ہے جس میں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا البتہ اگر پرانے شعرا کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظمیں بہ لحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں لوگوں کے اب یہ دل نشین ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مسدس حالی مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے یہ ایک بنا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقاء ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیئے یہ ایک نیا تازہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں

کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا اس میں اسلام کے گزشتہ عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے ان کے بلند خیالات اور ادلوالعزمیاں اور بر خلاف اس کے زمانہ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے جوان بچے سب کے دل پسند ہے اس نے کاروان مسلم کے لئے بانگ جرس کا کام کیا کہ اٹھیں اور آمادہ کار ہوں طبع ہوتے ہی اس کی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانہ حال کی کوئی اردو کی کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی، اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانہ گذشتہ کی اور برائیاں زمانہ موجودہ کی۔ اس میں شاعر نے زمانہ جاہلیت کی حالت جزیرہ نمائے عرب کی تمام متمدن دنیا سے انقطاعی صورت عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا ان کا تعصب اور ناداری۔ ان کا طغیان و بت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھایا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات، اعلائے کلمہ حق۔ توسیع علوم۔ استیصال ظلم و تعصب۔ اصلاح اخلاق اور ان تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں۔ اور جن کی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے اس میں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو اس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دنیا میں کی ہیں۔ پھر مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر دور دراز مقامات پر مثلاً سپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہنچ گئے۔

ہمالہ کو ہیں واقفات ان کے ازبر نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

سرسید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں :

" یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے ہماری شاعری کی جان اور شاعری کا ایمان ہے اور پھر اس قدر موثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ یہ سچ ہے جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے "

شکوۂ ہند

شکوۂ ہند[1] اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدس مدوجزر اسلام کے طرز میں ہیں یعنی ان میں بھی وہی بیان اسلام کی قدیم شان و شوکت اور موجودہ پستی و نکبت کا ہے جواب ہندوستان میں رونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزیداری سادگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بودا پن، چالاکی و مستعدی کے بدلے سستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی

مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ موثر اور قابل قدر نظمیں ہیں۔ اول الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پُر زور مرثیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا وسیع رنج و غم مشکل بہ نظم ہو گیا ہے وہ سچے جذبات جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تعبیر ہے سادگی یعنی شائبہ اغراق و مبالغہ سے اس کا معرا ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے اس کا نشان

---

[1] اس کا جواب بیان یزدانی نے " رخصت عروس " کے نام سے لکھا ہے جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اس نے ہم کو خراب کیا۔ اسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲

امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدس اور شکوہ کا رنگ ہے۔ اس میں دلی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقے سے کیا ہے

مناجات بیوہ | یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک مسدس اور شکوہ سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے اس کی بحر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح علم عروض میں صورت اثنا ترس" کہلاتی ہے فعلن فعلن فعلن فعلن ہو شل معاملات کی اصطلاح کی ہو اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال میں ودیا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے "مناجات بیوہ" میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت میں اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر بے اس کر دل پھٹ جاتا ہے اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا ہے اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف انداز ہوتے۔ اس کی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چپ کی داد | اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز ان کے اعلیٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ یہ حیدر آباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جس کے صدر مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے۔ پڑھ کر سنائی تھی۔ یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اس میں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو ان کا خاص شیوہ ہے ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مصنف مرتفع ہیں۔

دیوان حالی | اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ جس میں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کی گئی ہے۔ دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات، قصائد۔ ترکیب بند تاریخیں سب کچھ ہیں۔ قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں۔ غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ بیہا اور مغلق و پیچیدہ خیالات

سے خالی ہیں۔ طرزِ جدید کی غزلوں میں پرانا رنگ بدل کر زمانۂ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں۔ بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں۔ ان میں مفید اور کارآمد باتیں موثر اور زوردار الفاظ میں قدماء کے طرز پر بیان کی گئی ہیں جو بہت مقبول ہیں۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی ای وارڈ نے کر دیا ہے قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقہ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اس کو سنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری اس میں نفس شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ آئیڈیل یعنی منتہائے مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گو کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں۔ لہٰذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیئے وہ غزل میں مروّجہ بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اس کو اس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جس میں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں ہیں۔[۱]

دائرۂ غزل کو وسیع ہونا چاہیئے اور اس میں نہ صرف عاشقانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین

---

[۱] افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھ دیا کہ شیخ و زاہد جو پھبتیاں کسنے اور انکو بنانے کا اردو شاعری میں عام رواج ہو گیا ہے اس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیئے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت واعظ اور زاہد کے تار ڑنے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہوں۔ بلکہ ان کے علاوہ اس میں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں۔ درستی زبان بھی بہت ضروری ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنائع بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہیئے اور نہ شعر کی خوبی کا دارومدار ان پر رکھا جائے۔ سنگلاخ زمینیں اور مشکل ردیف قافیے جن کے مصحفیؔ اور شاہ نصیرؔ وغیرہ دلدادہ تھے ان سے احتراز کرنا چاہیئے

بقیہ : حاشیہ

اور ان پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے ورنہ بالکل بیکار ہے اور اس کو ترک کر دینا چاہیئے پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی انہیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع اس جماعت سے کسی قسم کی مخالفت ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہ ہو تو یہ طنز و تشنیع ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے مقصود اصلی ان معائب کا اظہار ہو جو اس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ریا مکر۔ سالوس۔ خشونت و درشتی بدخلقی وغیرہ نہ یہ کہ ان کی ذات پر بلاوجہ حملہ کیا جائے یا ان کی پستی میں اپنی بلندی ثابت کی جائے مولانا حالیؔ نے اس مجوزہ نظریہ کے ثبوت میں ذوقؔ کے دو شعر پیش کئے ہیں ؎

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو ۔۔۔ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقۂ زہاد و عباد میں اکثر پائی جاتی ہے کہ ان کو تو ذرا ذرا سی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بے خبر ہیں لہٰذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے ؎

ذوقؔ زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر ۔۔۔ وسمہ آب بنگ سے مہندی نے گلرنگ ہے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے۔ سوائے اس کے کہ بے چارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اس کو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔

اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس مبحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ کون سا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کس کی ممانعت ہے۔

حتی الامکان ردیف بھی اڑا دی جائے[1]

ادبیات حالی | حالی کا مرتبہ ادب اُردو میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے ان ہی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں موثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنی مادر ہند پر نظمیں لکھیں طرز قدیم پر کہ جس میں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں حمزہ غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔ ہموار ی خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے

شیخ صاحب برائیاں مے کی	اور جو کوئی چیت کی آ جائے (ریاض)
اک ٹیپ دی تھی حضرت ابدکو اے ریاض	اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں ″
کسی مے کش کو دیں گے تختہ انگور کی خدمت	جناب شیخ ٹھیکہ لے چکے ہیں باغ رضواں کا (راسخ)
مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب	پیش ایں قوم لبشور رابزمزم نہ رسد (غالب)
دیکھنا ناسخ سر شیخ معمم کی طرف	کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر (ناسخ)
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ	پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)
کب کسی در پر جبہہ سائی کی	شیخ صاحب نماز کیا جانیں (داغ)

[1] اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ غزل گوئی میں جہاں تک ممکن ہو آسانی مدنظر رکھی جائے۔ انکے الفاظ یہ ہیں کہ شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے ۱۲۔

پاک کیا۔ سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کئے۔ آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ نیچر کی پیروی۔ مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی جذبات اور درد و اثر۔ ان کی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔ صنائع بدائع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضول نقلی اور بے جا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

نقائص حالی

وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے متمیز ہو۔ کبھی ان کا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ایک ریفارمر اور نیچرلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی ان کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی ان کا کلام لاجواب ہے اور ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گا۔ کہ انہوں نے اردو شاعری کو ایک بڑی حد تک ان مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا جو اس میں سرایت کئے ہوئے تھیں اور ان میں ایک نئی روح پھونکی مختصراً یہ کہ ہر چند وہ شعرائے اُردو کی صف اولین میں شامل نہ بھی کئے جائیں مگر ادب اُردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کئے جائیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اُردو کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور شاعر، نامی گرامی نقاد، فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے استاد کامل اور فلالوجی (علم اللسان) کے بھی بڑے ماہر تھے ان کی خدمات اور احسانات زبان اُردو پر بے حد ہیں، اُردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جا سکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے ان کے کچھ مختصر حالات آئندہ حصۂ نثر میں بھی بیان کئے جائیں جس سے اُن کا

حقیقی تعلق ہے۔ یہاں ان کی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے

آزاد کی شاعری

آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے اُن کی نثر بھی اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے ان کے والد چونکہ استاد ذوق کے دوست تھے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے اٹھتے تھے لہٰذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ استاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ انہیں کی معیت میں دلّی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ اُستاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حسن عقیدت تھی اور انہیں کے فیض صحبت اور حسن تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دل میں جذبہ شاعری پیدا ہو گیا۔ دلّی کی آخری عظمت داشان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پردازنے ان مجمعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ اِدھر اُدھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے چونکہ لاہور دلّی سے قریب تھا اس وجہ سے دلّی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے اُن ہی لوگوں میں محمد حسین آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال پنڈت من پھول میر منشی، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ حسن اتفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے انہیں کے ایماء سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جسکے جلسے اسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیئے جائیں۔ نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعہ طرح دینے کا مروج ہے وہ موقوف کیا جائے۔ اور بجائے اس کے شعراء خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار اور آمادہ کر دیا اور اگر یہ جدید رنگ عنقریب مقبول عام ہو جائے گا۔ اور حقیقی شاعری کیلئے

اس کی ضروریات بتائیں۔ اور وہ خرابیاں بھی دکھا دیں جو بفعلِ پرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۸۷۴ء میں جو اڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے پڑھا تھا اس میں اردو شاعری کے عیوب تکرار مضامین غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، ان کا تصنع اور خلافِ فطرت رنگ۔ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بوضاحت بیان کر دیئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہیئے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانہ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کرو۔ سادگی اظہار اصلیت اور درد و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیف منظوم

آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اس پر خود عمل بھی کیا انہوں نے اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں اوپر بیان ہو چکا ہے کہ استاد ذوق کی صحبت نے ان کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ استاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دلّی کے مشاعروں میں سنانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد ان کو ریاست جنیدھ میں ایک جگہ مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے اس زمانہ کا کچھ کلام ان کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے ۱۸۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء میں اس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا اسی میں انہوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جس میں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے پرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی امنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے کبھی کبھی وہ اردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے مثلاً ان کی نظم اولو العزمی کے لئے کوئی سد راہ نہیں۔ انگریزی

شاعر ٹینی سن کی نظم "ایکسیلسیئر" کے انداز پر ہے مگر اس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی شرافت حقیقی معرفت الٰہی۔ سلام علیک جیسے جا ہو سمجھ لو۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارک باد جشن جوبلی۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعہ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم و جدید رنگ

قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اسی پرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعہ نظم آزاد کے آخر میں ان کے پرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ زوردار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو ان کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) مثنوی شب قدر۔ یہ ان کا شاہکار ہے اور اس میں مختلف لوگوں کے اشغال شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کئے ہیں۔ طالب علم مہاجن اور چور کی کیفیت علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہے۔

طالب علم

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
کل صبح امتحان ہے سو اسکے خیال میں

مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے

کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پر محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی

آدھی بچی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیے ہوئے
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

چور

اے رات تیرے پردہ دامن کی اوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر

ذروِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں!
اور ہاتھ ڈالا اس کے سرِ اک این واں میں ہے
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائے گا۔

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر

بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
اڑتا مگر ہے کھوئے ہوئے پر خیال کے
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرّہ ذرّہ پہ افسون نئے نئے
سہ جاتے ہیں وہی مگر مضمون نئے نئے

مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چھپ رہا ہے
مطلب اڑاتا شعر سے مضمون غزل کے ہے
یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے
لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریف اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضمون لیا ہے جنکا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی ہے کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کر جاتا حاسد دشمن بدبیں پہ چوٹ ہے
کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
کرتا ہے اس کو خرخنج عدو کے علاج میں
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے۔

۲۔ مثنوی حب وطن اس میں انہوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جس میں یہ دکھلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔

۴) مثنوی ابر کرم اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے یہ حالی کی برکھا رت کے طرز پر ہے۔

۵) صبح امید۔ اس میں نہایت موثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبار عالم مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام کرتی ہے اور کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہے۔

آزاد و حالی کا فرق آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے ان کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک صاف نہیں۔ حالی سر سید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوئے اور تنزل اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پرجوش کلام کی لے میں الاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ان کی انتادہ طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے انہوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کرکے اپنے میلان طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا۔ جدید رنگ سے بدلا اور ایثار نفس سے کام لے کر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے مختصر مجموعۂ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ ان کی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف ان پر شعریت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ میرٹھ وطن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں سر رشتۂ تعلیم کی ملازمت اختیار کی تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کرکے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے۔ جہاں بارہ برس تک قیام کرکے ۱۸۹۹ء میں بپنشن اپنے وطن مالوف یعنی میرٹھ واپس آئے اور یہیں قیام اختیار کرکے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی ان کی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب "خاں صاحب" بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اس دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔

آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی وہ اردو ریڈریں اور پرائمریں تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصۂ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور ان کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اس معاملہ میں مولوی صاحب موصوف

نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبۂ پنجاب کے واسطے کیا تھا۔ بلکہ ایک معنی میں ان سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں سلامت زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو ان کا جواب سررشتہ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔

مولوی صاحب شاعر اور نثار دونوں تھے۔ ان کا خاص رنگ ان دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جس کے وہ استاد کامل تھے۔ شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرضکہ ہر قسم کی نظمیں ان کی کہی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالیؔ کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا اور اس میں ان کی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طباعی اور قادر الکلامی ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے۔ اُن کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانۂ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں اردو میں بلینک ورس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا نثر مرجز میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے۔ علاوہ غزلیات کے جس میں صرفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں۔ انہوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصے کہانی کے طرز پر مثل "ایساپس فیبلس" کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ قلعۂ آگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے اس میں انہوں نے مسلمانوں کی ابتدائے ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ ان کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں۔ چنانچہ ان کے مسودات محفوظ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہوں گے آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانحعمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قران السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام

کو روک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا۔ مگر وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُرور جہان آبادی منشی دُرگا سہائے سُرور کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین سمجھنا چاہیئے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ ان کا عمل "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر تھا۔ یعنی پرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عمدہ اور قابل قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا درد و اثر اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حب الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانۂ حال کی معمولی بے لطف باتوں اور زمانۂ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے کلام پاک ہے۔ شستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی ملی ہوئی ہے۔

سُرور کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا بلکہ ان کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ اُن کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا۔ سُرور بھی نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ عُسرت و مصیبت ان کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیما نہ کر سکی۔ وہ مذہبی تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ ان کو نمائش اور ظاہرداری کا شوق تھا بلکہ ان کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی ان میں دنیا کا مکر و فریب مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب ان میں تھے وہ بھی ہنر معلوم ہوتے تھے۔ سب سے بڑا عیب ان میں مے نوشی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح ان کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کمبخت عادت کی بدولت ان کی ہونہار اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ صرف بہ عمر ۳۷ سال ۱۹۱۰ء میں انہوں نے انتقال کیا۔

اُن کی شاعری کے خصوصیات (۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات

نگاری اور درد و اثر ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مثل استاد الشعرا میر تقی میر کے سُرور کے مزاج میں بھی حزن و یاس اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میر کے ان کا کلام بھی جذبات نگاری کا ایک مرقع ہوتا تھا۔ اُن کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دیوارِ کہن،

(۲) حسرت شباب،

(۳) اندوہ غربت،

(۴) مرغان قفس،

(۵) یاد طفلی،

(۶) بلبل کا فسانہ،

(۷) حسرت دیدار،

(۸) ماتم آرزو وغیرہ۔

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے۔ اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ایک خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے بلکہ ان کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجا ہے۔ ان کے مخاطب اُن کے ہم مذہب نہیں، بلکہ ہندوستان کی پوری پبلک ہے۔ اس قسم کی اُن کی نظمیں یہ ہیں:۔

(۱) خاک وطن۔

(۲) عروس حب وطن۔

(۳) حسرت وطن

(۴) یاد وطن۔

مادر ہند وغیرہ

یہ مادر ہند بابو بنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ان تمام نظموں میں حب وطن کا سچا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں۔ ان کے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً:۔

فسانہ گل و بلبل۔

شمع و پروانہ وغیرہ۔

(۳) اس کے بعد ان کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے۔ ان میں بھی صحیح جذبات،

صداقت، فصاحت، بے تکلفی اور روانی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔

پدمنی
پدمنی کی چتا۔
سیتاجی کی گریۂ وزاری۔
مہاراجہ دسرتھ کی بے قراری۔
جمنا۔
گنگا پریاگ کا سنگم۔
ستی۔
نورجہاں کا مزار۔
حسرت دیدار اور
نلدمنتی وغیرہ۔

اس قسم کی نظمیں ہیں، جو سب اعلیٰ خیالات اور درد و اثر سے مملو ہیں۔ ان سب میں "گنگا" اور "جمنا" خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں۔ جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ "جمنا" میں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں۔

(۴) سُرور کی چوتھی خصوصیت جو ان کو ان کے ہمعصروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ انہوں نے اردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہو گیا۔ علی الخصوص مذہبی نظموں میں انہوں نے پُرانے ٹھیٹ ہندی اور بھاشا کے لفظ بہت اُستادی سے صرف کئے ہیں جن سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح رامائن اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُرزور لکھے ہیں۔ ان تمام اسی قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے سرور کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا۔ مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے انہوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کئے ہیں وہ ہرچند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ تقریباً بیس سے کم نہ ہوں گی۔ بعض میں انہوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے۔

مرغابی۔ ترانۂ خواب۔

بچہ اور ہلال۔ کارزار ہستی۔

امید و طفلی۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔

یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دلکش ہیں۔ ایسی ہی نیچرل نظموں میں ان کی "بیربہوٹی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

سرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی وعظ و نصیحت کی روکھی پھیکی باتوں سے کم نہ ہونے پائے۔ وہ شاعری کو وعظ پر مقدم جانتے تھے۔ زن خوشخو۔ بے ثباتی دنیا۔ ادائے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

سرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے۔ اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ انہوں نے مثنوی۔ غزل۔ رباعی قطعہ۔ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرضیکہ سب اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر مسدس ان کو بہت مجوب تھا اور اس میں وہ بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔

مختصراً ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ جذبات نگاری۔ درد و اثر۔ اعلیٰ تخییل نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا من و عن اظہار۔ تنوع خیالات اور ان کا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ میں اور وسیع النظری

ان کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہوا ہے ایک وہ جو زمانہ پریس کانپور سے ان نظموں کا نکلا جو بہ اوقات مختلف رسالۂ زمانہ میں خمخانۂ سرور کے نام سے چھپیں۔ دوسرا جام سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ ان کا اکثر کلام ضائع ہو گیا مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے ان کا کلام ہتھیا لیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے ان کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوئے ان سے صاف طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے ان سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور ان کو اپنے نام سے شائع کرا دیا تھا اس سے یہ حقیقت کھل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعرا کی صف اول میں اپنا شمار کرانا چاہتے ہیں۔ دوسروں سے کچھ دے لے کے کہلوا لیتے ہیں اور پھر اس کلام کو اپنے اسم گرامی کے

ساتھ بے تکلف شائع کر دیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے انہوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اس طرز خاص میں ان کی نقل بالکل محال ہے۔ ان کا کلام ممتنع التقلید اور ناقابل رسائی ہے ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بے مثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے۔ نثر کے خطوط بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان سب کے ساتھ ادب سوسائٹی، اور حکومت کے زبردست نقاد اور ماہر سیاسیات تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو یکتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام۔ ۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔ ان کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کرکے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کی مثل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہوگئے۔ ۱۸۸۸ء میں سبارڈنیٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوا۔ اس کے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کرکے ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

اخلاق و عادات طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جو ان سے ملنے آتے تھے۔ اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارا۔ تہذیب، صداقت ہمدردی اور مہمان نوازی ان کے خاص جوہر تھے۔ بعض باتیں جو ان کے کلام میں "پالیسی" یعنی مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کی جاسکتی ہیں۔ وہ ان کے ان خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی۔ عزیز لکھنوی۔ منشی دیا نرائن نگم وغیرہ کے نام ہیں۔ ان کی راست بازی اور صداقت شعاری پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جن کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وہ صرف اس لئے کہ وہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ مذہباً وہ سنی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں ہر چند کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے۔ مگر مذہبی نارواداری اور عصبیت سے کوسوں دور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہوگئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے ان پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخر الذکر کی وفات پر ایک دردناک

قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں کہ آتی تھی بہار
اب تجھے پاکر میں اے بادِ بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اٹھ گیا
اب میں اے فردا تری امیدواری کیا کروں

اکبر کی شاعری اکبر فطری شاعر تھے۔ بچپنے سے اُن کو شعر کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کا ابتدائے عمر کا کلام ان کی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات ان کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے انگریزی پڑھی اور اس میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ اکبر کا دور شاعری ایک بسیط دور ہے جس کو انہوں نے خود پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک پہلا دور ابتدائے مشق سے ۱۸۶۶ء تک کا ہے۔ اس زمانہ کا کلام پرانے رنگ کا ہے جو اس زمانہ کا رنگ تھا۔ یہ زمانہ ان کی نو مشقی کا سمجھنا چاہیے۔ اس میں انہوں نے لکھنؤ اور دلی کے مستند اساتذہ کی تقلید اور ان کے رنگ میں غزلیں کہیں اور اکثر مشاعروں میں پڑھیں۔ ان غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم سے برتا جاتا ہے۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں جذبات عشقیہ بھی ہیں۔ مگر صفائی، سادگی، حسن بندش، روانی وغیرہ بدرجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ اس وقت کے کلام سے آئندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ تصنع بھی شامل ہے۔

دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء عیسوی تک اس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ اصلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہے اور قادر الکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مروجہ اور معینہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں لندن پر طبع آزمائی کی گئی ہے، تصنع بے تکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ حدود معینہ پر غالب آ رہا ہے۔ اشعار نے حشو و زوائد سے پاک ہو کر اپنی کینچل بدل دی ہے۔ مگر غزلیں اس میں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہر طور اشعار کے دروبست، بندش اور طرز ادا میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۴ء سے ۱۹۲۶ء تک یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں شاعر کو

اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں۔ بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب اُن کے کلام میں پورا اُستادانہ رنگ آگیا اور تجربہ اور نومشقی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ اب کلام میں نوکاری کی جھجک اور تردّد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے۔ جس میں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے۔ غزلوں کا رنگ اب پرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر ان میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدّت ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ روحانیت اور تصوّف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرزِ ادا کے تو بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے۔ اس زمانہ کا کلام ان کی کلیات اوّل و دوم میں داخل ہے۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔ اس میں اور دورِ ماسبق کی نوعیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا متمم ہے اس دور میں اکبر فی الواقع "لسان العصر" ہو گئے ہیں۔ اس میں قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی اور حقائق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے۔ بلکہ اور تیز ہو گئی ہے اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہو گئی ہے۔ اخلاقی روحانی، فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کا کلام میں زور ہے۔ مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے۔ حسن و عشق کی زیر لبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی۔ مگر وہ اب سیاسیات کے غل غپاڑہ میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صنّاع کامل ہو گئے ہیں اور کلام میں پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تنوّع ہے۔ قوّت ابداع و ایجاد فن عروض کے قواعد اور مشکلات سے دبتی نہیں اظہار خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے ذہن میں آتے ہیں اور ان کے واسطے نئے نئے دلچسپ قافیوں اور جدید استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوّف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شائع ہو گیا ہے۔ اس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدرِ قلیل رہ گیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی، روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کو معراج سمجھنا چاہیئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ

کے کلام میں وہ جوش وخروش اور بانکپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے اس لئے کہ طویل عمر نے اُن کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقائق سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب زندگی پر اُن کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے۔ لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی ان کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا ان کا کلام بہت ہے۔ اس قدر کہ دو کلیات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کو وہ صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے تھے، یعنی جن کی اشاعت ان کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمّیٰ بہ "گاندھی نامہ" لکھی جس کو نان کواپریشن کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیئے مگر اس کتاب کو انہوں نے مصلحتہً نہیں شائع کیا۔

اُن کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جن میں سے دو ان کی زندگی میں طبع ہوئے تھے۔ اور تیسرا اُن کے صاحبزادے نے ان کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی ایک اور شائع ہونے کو باقی ہے۔ اکبر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ اُن کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی۔ منشی دیا نرائن نگم احسن مارہروی۔ مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبدالماجد بی اے دریا آبادی کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں ان سے ان کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض پنچ کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ سوانحعمری تیار ہو سکتی ہے۔ یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا ان کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ موجود نہیں ہے اودھ پنچ ہی سے انہوں نے غالباً ظریفانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

اکبر کی غزلیات | چستی بندش، روزمرہ۔ سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تخیل اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دنیا کی بے ثباتی۔ دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقی اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائداری کے مضامین سے مملو ہیں۔ اور درد و اثر اور حزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت ان میں موجود ہیں مگر اکبر کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلوں پر مبنی نہیں۔ کیونکہ ان سے ان کی مجموعی تابنیوں کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار اُن کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگ قدیم

جاں نثاروں کے سوا کوئی نہ دیکھے سوئے دوست
رقص کرتی ہے نسیم صبح کیوں مستانہ وار
کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
ہیں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں

چال ہے تیغ قضا کی جنبش ابروئے دوست
گلشن دل سے اڑا لائی ہے شاید بوئے دوست
غیرت دامان گلچیں ہو رہا ہے کوئے دوست
جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روئے دوست

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی
یہی نظر ہے جواب قاتل زمانہ ہوئی
ہزار جلوۂ حسن بتاں ہو اے اکبر

خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف
یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف
تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف

کوئی پہونچا نہیں اے یار تیرے قدرعنا تک
زمین پر شمع روشن ہے فلک پر ماہ تاباں ہے
جو اس نے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے

ہماری فکر عالی سرو سے ہو آئی طوبیٰ تک
تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک
خوشی سے یہ ہوئے بیخود کہ ہم بھولے تمنا تک

کہیں دل ہوں کہیں ہیں باعث بیتابی دل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاید معنی
کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں تصویر حیرت ہوں کہیں محو پریشانی
کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا

کہیں انداز بسمل ہوں کہیں ہیں ناز قاتل ہوں
کہیں ہوں محمل لیلیٰ کہیں لیلائے محمل ہوں
کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں
کہیں ہوں شیفتہ رخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں
روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

رنگ متوسط

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا

اب گرد رہ گئی ہے وہ میلا نکل گیا

ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر

شغل اب کچھ بھی نہیں نسخ عزیمت کے سوا
اب اُٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

پیغام آ رہا ہے دلِ بے قرار کا
شائق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا

قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا
اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا

باغِ جہاں میں کوئی روش بے خلش نہیں
شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر

دوڑاؤں گُل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا
کیا شعبدہ ہے گردشِ لیل و نہار کا

اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا
ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں اے حضور

جب خدا کا سامنا ہو گا تو دیکھا جائے گا
آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آ جائے گا

عشقِ بُت میں کفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا
تجربہ نے حُبِّ دنیا سے سکھایا احتراز
عالمِ ہستی کو تھا مدِّ نظر کتمان راز

جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
پہلے کہتے تھے فقط منہ سے اور اب کرنا پڑا
ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرت اکبرؔ کو بالآخر طلب کرنا پڑا

رنگ آخر

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے
حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سنے

شدّتِ یاس سے ہیں آپ بھی اپنا نہ رہا
عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبرؔ سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزل ہستی سے گزرا دل مرا
نہیں ہے کام زبان کا کچھ اب دعا کے سوا

اُس کی نظروں میں سزاوار تمنا کچھ نہ تھا
نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا

کروں کیا غم کہ دُنیا سے ملا کیا
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل
وہاں تھا لو ابلے یاں بُت پرستی
الٰہی اکبرؔ بیکس کی ہو خیر
میرے دل سے امتیازی فرد اُٹھ گیا

کسی کو کیا ملا دُنیا میں تھا کیا
نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا
یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا
حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اٹھ گیا

جہان فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہے اکبرؔ
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا
غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا

نبی کو سمجھا نہیں ہوں اب تک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا یہی ہے جو ہو رہا ہے
جدائی سے میں بنایا مجھ کو جُدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

دوں گا ذرا سمجھ کے جواب اُن کی بات کا
رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

دہر میں سوختۂ گرمی بازار نہ ہو
دل میں ہو خوں تو سودا کا خریدار نہ ہو
نقش دل ہو صفت معنی رنگیں اے دوست
رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہ ہو
سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر
مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو
نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع
وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو
بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اے اکبرؔ
برق خرمن کہیں یہ گرمی گفتار نہ ہو

جنونِ عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے

یہ پرِ شیخ ہے بے خبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے[1]
کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبرؔ
کہ امید ابتدائے قدیم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبرؔ کی خاص شہرت اُن کی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے جو ان کی زرّیں نظموں میں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اُن کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہونچ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں ان کو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا ان کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی اس رنگ نے ان کی شوخ طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیئے اور انہوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کئے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ بے مثل رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے ان کی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال رہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔ ان کا تیسرے دور کا کلام خاص کر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے اس میں ان کی ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ ظرافت کے پردے میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ نحیف و زار ہو گئے تھے مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو، اخلاقی، سیاسی روحانی مسائل کے ادائے مطالب کا ایک موثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم حقائق مقصودِ اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا حسب ذیل ہیں:-

---

[1] مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ "مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے"۔ ۱۲

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تمثیلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں برتی جاتی ہیں ان میں وہ تصنع اور نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انہیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور انہیں کے بیان میں ایک خاص جدت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے یا مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اُس سے قبل کبھی نہیں سنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور سُبک الفاظ جن کو شعرا عام طور پر استعمال نہیں کرتے وہ شعر میں نہایت جدت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی اتنی کثرت ہے۔ کہ ان کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً کلّو۔ مُلّو۔ بدّھو۔ جمّن وغیرہ کہ یہ ان کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ ان کو خاص خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ۔ مثلاً کٹ پٹ فالتو، یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرا کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مگر اکبر ان کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اردو میں ہنوز مروّج نہیں ہوئے اور کلام میں تقبل اور بے مثل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں انہوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف ہنسنا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بذلہ سنجی اور تمسخر نہ سمجھنا چاہیئے، اس کی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا معاشرتی ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اس میں پنہاں ہوتی ہے ان کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ ان کا مذاق عامیانہ اور سوقیانہ ہوتا ہے۔ ان کی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اڑاتے بلکہ ان کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ ان کی خاص دلچسپی

کی چیز ہے۔ مغربی طرزِ تعلیم اور ہندوستان میں انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خرابیوں اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانۂ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ ہندو و مسلمان، سُنی، شیعہ، سب کی بلاامتیاز تفریق خبر لی گئی ہے۔ اُن کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو ان میں تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبرؔ کی خاص اصطلاحات یہ ہیں:- مس۔ شیخ۔ سیّد۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بُت۔ کالج۔ برہمن۔ لالہ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تو واقف ہیں۔ مگر انگریزی تہذیب سے بالکل نا آشنا ہیں۔ سیّد سے سر سیّد مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ یا اُن کے متبعین یعنی علی گڑھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندوؤں کا اتحاد مراد ہے۔

اقسام ظرافت | اکبرؔ کی ظرافت مندرجۂ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ مذہب۔ سیاسیات۔ تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافت الفاظ۔ طنزیات۔

ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصراً پیش کئے جاتے ہیں:-

مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب	فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں
چہرے کے نیچے تہہ ہے داڑھی کا جھول جھال	اس فرد کو بچایئے تفصیل ذیل سے
بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبرؔ	یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی	اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
پیتا ہوں شراب آبِ زمزم کے ساتھ	رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹمٹم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی و مجازی دونوں	قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی	آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی
پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی	چاقو ولایتی نہیں دیسی چھُرا سہی
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو	دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں
بے نمازوں میں ہیں وہ اور اس پہ شرماتے نہیں نیت کس مصروف کار دیں بہ قلب مطمئن	یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں یک ثنا فی الآزست ویک ثنا نی الدار ون
شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض!	اونٹ کے سب نغات جانتے ہیں کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے	کونسل میں بہت سیدؔ مسجد میں فقط جمنؔ جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں انوکھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے ان روزوں مُرید اُن کے تو شہروں میں اڑتے پھرتے ہیں پرچے	کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں اَلَم تَرَ کَیفَ بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے پر
بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو کہہ دیا صاف ہم نے اے مہاراج ما مقیماں کوئے دلدار ایم! کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو	ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج یا ڈپوٹیشن ست یا تم میم جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کامیابی کا سُدیشی پہ ہر اک در بستہ ہے
اصل کا اُس بُت خود میں سے کوئی ہنٹ کہاں
ممبر علی مرُاد ہیں یا سکھ ندہان ہیں!

کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
چو پنچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے
صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں
لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو
جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں

اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
پھینکئے اب کوٹ کو تہ کیجئے پتلون کو

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
ہر اک شاخ میں پاس یہ لے بوا ہے

نہ وہ وضعِ ملّت نہ قرآن خوانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی
مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
سید بھی کورے کھلے برسوں مساس کر کے

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

پردہ و تعلیم نسواں

پردہ اُٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اُس نے کہہ کر کرے گا کیا مرا یہ بیا

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بیسے کا پانی ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسمان نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ بابا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ظرافتِ الفاظ

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی
حنفی نفی ہی میں معطل ہیں !!

ہر طرح اب ہے عاجزی ہم ہیں
اب ہمارے امام حنبلؒ ہیں

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم ہیں وہ اورادِ سحرگاہی
وظیفہ کی جگہ پایانیر یا آل ڈی ٹی ہے

گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر
کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وسکی کبھی ٹی ہے

شیخ تثلیث کی تردید نہ کر سکتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

عہدِ اسلام و عہدِ انگلش میں
سُنئے قولِ اکبرِ سخن گو کا

پہلے توحید تھی تو اب تخصیص
آ گئے غل ایک کا تھا اب دو کا

ے انگریزی میں ہمبل بمعنی عاجز کے ہیں ۱۲

طنزیات

آزاد اگر ملے جو ہے نام و نمود میں دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ	کیا ہرج زندگی ہو اگر حال زشت میں فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں
نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے	تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے
ہماری مجلسیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ شیخ جی پر یہ قول صادق ہے شیخ جی کو جو آگیا غصہ تم ہو شیطان کے مطیع و مرید ہے تمہاری نمود بس اتنی	بُزِ اخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں گو تقدس مآب بے شک ہیں چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں لگے کہنے یہ چھینک کر دھتّ تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید جس طرح ہو پڑی پریڈ پہ بیلر

استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیرِ الفاظ سے کلامِ اکبر بن گئے ہیں

کریما بہ بخشائے بر حال قوم کریما بہ بخشائے بر حال بندہ رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ	صلوٰۃ است رائج در ایشاں نہ سوم کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ مے برد ہر جا کہ کیک سٹ و پلیٹ
پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے ہو گئی اب خیال کی اصلاح	ہرچہ از باپ میرسد نیکوست ہرچہ از آپ میرسد نیکوست

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر بیٹ رانہ بر سرمن جائے دستار اے عزیز عمر گزری ہے اسی بزم کی حراری میں ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناولہا بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون	کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و مرچہ کرد مرد تا مسٹر تو اند شد چرا قبلہ شود دوسری لشت ہے چندہ کی طلب گاری میں چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا کہ سر سید خبردار و ز راہ و رسم منزلہا
سکۂ زر باید سے درد ہوتی زر نار داشت گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست	باوجودش نالہائے زار در اخبار داشت گفت مارا خوف نیس ٹیکس در ایں کار داشت
درپس ہر گریہ آخر خندہ ایست یاد دار ایں قول مولانائے روم	بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست
ہم ڈنر خواہی و ہم آنر و غ صاف	ایں خیال ست و محال ست و گزاف

اکبر کی سیاسی نظمیں | اس قسم کی نظمیں دو طرح کی ہیں - ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے - یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقائق مضمر ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ ان کی ذاتی ناراضی اور غیظ و غضب بھی شامل ہے - ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی دور ہو کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اتر جائے - اس قسم کے اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گولیوں سے لیتا ہے۔ معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ ان کے انداز طبیعت سے واقف ہیں ان کے لئے وہ بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کو چاہیئے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کے واسطے وہ ذرا غور و فکر سے کام لے۔ سیاسی اشعار ہیں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھلاتے ہیں - ان کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لئے بچھائے گئے ہیں۔ سیاسی

حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادھے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔ ان کے نزدیک سرکاری سکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلرک لوگ تیار کئے جاتے ہیں اور غلامی کی ذہنیت اور بڑھائی جاتی ہے۔ اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کستی جاتی ہیں وہ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی سے معشوق کی کمر کی تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال		خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی سازوسامان کی چکا چوندھ سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو ان کی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں کیونکہ اکبر ایک بڑے شاعر تھے سیاستدان نہ تھے۔ انہوں نے علم پالیٹکس کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دے کر پنشن پا گئے تھے اور حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا۔ چونکہ وہ شاعر تھے لہذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ ان کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اس کے طرز ادا سے تھا وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے اور چونکہ شاعر تھے لہذا نتائج کی گرفت سے بے خوف تھے ان کی رائیں جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ماہر سیاسیات کی مستند رائیں نہیں شمار کی جا سکتیں۔ کیونکہ ان کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ فطرتاً بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کر سکتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کو دشواریاں پیش آئیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو ان کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے۔ خیالات کا اظہار اس کے مابعد ہے وہ کسی گروہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معترف ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ بے دینی اور لامذہبی کا زینہ ہے وہ اخلاقی مسائل کو کسی ناظم یا فلسفی کی طرح

شرح و بسیط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اپنے اشعار میں دلچسپ مختصر طریقہ سے بیان کر جاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پر زور بنا دیتا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب میں ان کو وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی کئی معنی نکالتے ہیں۔ جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُن کے نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے۔ ہماری خوشامد اور گڑگڑانے سے اور اسی طرح آہ وزاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ قوی کا بیکار مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح انہوں نے کانگریس کی کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں۔ اور جابرانہ " حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اڑایا ہے۔ یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات، لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں۔ مگر چشم حقیقت بین ان کی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں محض سماعی اثر سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں ان کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آئندہ اجتناب کریں۔ ان کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے۔ اس واسطے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ اور عامی سے عالم تک ان کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کا مطلب نکال کر ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے کہ اُردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اس کو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں۔ سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیئے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت مادیت پر ضرور غالب آئے گی تمام سیاسی مشکلات کا ان کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت خداوندی پر پورا بھروسہ رکھا جائے۔

اکبر بحیثیت نکتہ چیں سوسائٹی | اکبر کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اثر کر گئی تھی جس کی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے۔ ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگاہ تھا۔ مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور

دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو اس میں خاص لُطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پُرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام۔ یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پا لیا تھا۔ قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چل ہوئی تھی۔ یہی پُر آشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام بیں ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آئندہ خطرے سے واقف تھے انہوں نے ان تیز رفتار لوگوں کو جو شتر بے مہار کی طرح مُنہ اٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا۔ بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے پُر زور اور دلچسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین وعظ و نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اکبرؔ نے بھی یہی روش اختیار کی مگر ان کا حربہ بجائے نثر کے نظم تھا۔ انہوں نے بھی اس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرز و روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اُڑایا ہے مگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ انہوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے لبسا اوقات مغربی تہذیب کے درختوں کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنا چاہا ہے وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تعلیم کے مستقبل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پبلک ان کے ساتھ نہ تھی اور اسی وجہ سے انکی شہرت پر کسی قدر اثر پڑا[1]

---

[1] یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبرؔ ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص ان کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر جب اس ترقی و تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس سے ان کے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو ان کے کمال فن کی قائل اور معترف نہ ہو محض اس وجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ برعکس اس کے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ۱۲ مترجم

اِس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے چونکانے اور ان کو قعر مذلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے۔ بر خلاف اس کے اکبر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اس کی ہر بات ماننے کے مؤید نہ تھے ہمارے نزدیک اُن کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بُری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اس کے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے۔ اکبر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس میں مذہب کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہو کر مذہب کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ پردے کے قیود کو کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس میں بڑے بڑے نقصان ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ وامریکہ وغیرہ میں اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہو گا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن میں بعد المشرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ کیونکہ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں کے بھی سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا۔ انہیں وجوہ سے انھوں نے مغربیت پسندی کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اُڑایا ہے اور جابجا اس پر طنز کئے ہیں۔ ہندوستانی عشاق کو ان کی رائے میں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربان یورپ سے لینا پڑے گا اور ہندوستانی معاشیق کو ادا و ناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یوروپین ہمجنسوں سے سیکھنا پڑے گا۔ کمیٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ پُرانے قومی آثار تبدیل لوگ کھو بیٹھے یا ان کو عمداً حوالہ ماضی کر دیا۔ علماء و عرفا نے اپنی قدیمی وضع چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار کر لی۔ صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علماء مثل سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں بجائے چراغ خانہ کے "شمع انجمن" بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چاپلوسی کو ٹھہرا دیا۔ غرضیکہ یہ امور مذکورۂ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے اسی

انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے وہ سر سید اور ان کے متبعین یعنی تعلیم علی گڑھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے۔ جس قدر سر سید کی رفتار ان کے نزدیک تیز تھی۔ اسی قدر ہمارے نزدیک ان کی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کئے جا سکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں۔ بلکہ وہ قومی تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیائے علوم قدیمہ اور ان خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہو گئی ہیں۔ دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً خلاف نہیں مگر اس کا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پاکر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔ قومی جائداد نہ بنیں۔

دوائے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم		قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

وہ پرانی پاس وضع۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایۂ ناز صفات پالیسی۔ دو روئی۔ خود غرضی بے چینی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں۔ اُن کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین اور واسطہ داروں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے۔ یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس اُن کے دل سے اُٹھ گیا۔ دنیا کے بکھیڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یہ مادہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کے معجز نما اثرات کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا۔ موجود دور کی سائنس کی معجز نمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر آفرینیاں سراپا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں۔ مرگ ناگہانی جو اکثر کثرت اضطرار اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اسی کے برکات ہیں۔ جدید طریقۂ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔ اخلاقی و روحانی امراض کے لئے اکسیر صفت ثابت نہیں ہوا۔ سائنس کی ترقی اور نیچر کی معلومیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کئے جن کے رفع کرنے کی اُمید کی جاتی تھی۔ دونوں ہندو مسلمان

کے درمیان میں ایک عمیق خلیج حائل ہے۔ مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہائے نظر روحانی ترقی ہے وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے فتوحات اور ملک گیری کا اس کو شوق نہیں قناعت اور تسلیم و رضا اُس کا آئین ہے۔

اکبر کے مذہبی عقائد علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم، ریفارمر، واعظ اور فلسفی بھی تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر دعا کے دل سے قائل تھے۔ اُن کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اس میں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں۔ وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے اس کو چند اُرا اور حقائق فلسفیانہ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ اکبر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کر سکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے اُن میں تعصب اور کٹر پن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ مُلّائیت کی تنگ خیالی کو برا سمجھتے ہیں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع النظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہ ہو۔ ان کا قول ہے کہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقائق و معارف کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ظواہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور افعال و اطوار مثل مغز کے، وہ تعصب اور غصہ کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کر دیتی ہے۔ آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہنے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے معاوضۂ ہم آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے۔

نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء نادر علی خاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے اس رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور رہیں درد و اثر اعلیٰ تخییل حب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں یہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اُردو

میں بھی داخل ہو جائے۔ ان کی نظمیں "شمع و پروانہ"، "شعاعِ امید"، "پیکرِ بے زبان"، "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں۔ ان کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین" اور "مادرِ ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی مشہور کتاب "لالہ رُخ" کے طرز پر انہوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رُخ رکھا ہے۔ ان کا انتقال عین جوانی یعنی پینتالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دنیا نے جو امیدیں ان کی ذات سے قائم کی تھیں ان سب پر پانی پھر گیا۔

تاریخ ادبِ اُردو

(حصہ نثر)

باب ۱۵

نثر اُردو کی ابتداء اور ترقی
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثر اردو کی تعویق آغاز کے اسباب

اُردو نثر کی ابتدار واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند میں اس کی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ شرفا کی زبان وہی تھی۔ مراسلے، کتابوں کی تقریظیں اور دیباچے یہ سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اُردو شعرا کے تذکرے جن میں ان کے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروّج تھی۔ اس وقت کے اُردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ اقسام نثر یعنی مرجز، مقفیٰ، مسجع اور عاری اُردو میں بھی بے تکلف اختیار کی گئی تھیں اور جب کبھی کوئی بات نثر میں لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پُر تکلف عبارت میں لکھی جاتی تھی نظم کا عام رواج تھا۔ یہاں تک کہ خطوط بھی نظم ہی میں لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی بڑی دلیل

سمجھی جاتی تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی تمنائے امتیاز تھا۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم نما بنائے ہوئے تھا۔ نثر بیچاری ایک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ دَور نظم کے عروج کا دور تھا اور نثر کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ یہ اسباب اُس کی ابتدا کی تاخیر کے ہوئے اور یہی اِس بات کی بھی وجہ ہے کہ اس کی ابتدا ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور ادبی مرکز سے دور تھا۔

زبان دکھنی میں قدیم اردو نثر کی تصانیف

محققین زبان اور ریسرچ اسکالروں نے بحر تحقیق میں غوطہ زنی کر کے دکن کی قدیم نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کئے ہیں۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اردو کی تیاری کے لئے فراہم ہو جائے گا۔ ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب اور حکیم سید شمس اللہ قادری ہیں کہ جن کی کوششیں اس بارے میں بہت تحسین اور آفرین کے لائق ہیں۔ جہاں تک کہ قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نمونے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقرا اور اہل دل کے اقوال وامثال قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کی تصانیف اور "معراج العاشقین" مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتا مگر پھر بھی اُس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالہ نشاط العشق کو دکھنی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے دو کے نام "جل ترنگ" اور "گلباس" ہیں۔ مولانا وجہی کی "سب رس" ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے جس کا ذکر حصۂ نظم میں مولانا وجہی کے بیان میں آچکا ہے۔ میران یعقوب نے "شمائل الاتقیا و دلائل الانقیا" کا اردو ترجمہ سلیس اور سادہ دکھنی زبان میں ۱۱۰۰ھ میں کیا۔ سید شاہ محمد قادری نے بھی جو اورنگ زیب کے زمانہ میں تھے اور رائچور کے نور دریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مختلف مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ گیارہویں

صدی میں سید شاہ میر نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی میں "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۷۳۲ء

قبل اس کے کہ دکن کی اُردو شمالی ہند میں آئے یہاں بھی کچھ کتابیں نثر میں لکھی گئیں جو زیادہ تر قصہ کہانیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں تھیں اور فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں انہیں کتابوں میں فضلی کی دہ مجلس[1] ہے جو بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس وقت مصنف کی عمر بائیس برس کی تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کی روضتہ الشہداء کا ترجمہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ فضلی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میری بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اُس وقت مروّج تھی۔ لکھی جائے مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ لہٰذا مجھے اس کی تحریر میں بہت پس و پیش تھا اس حالت میں میں نے خواب میں سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ تشریف لائے ہیں اور آپ نے میرے مشکلات کو حل کیا اور امداد فرمائی۔ فضلی جو مذہب امامیہ رکھتے تھے ائمہ معصومینؑ کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں مگر اُن کو کچھ شہرت نہیں ہوئی۔ دہ مجلس جس میں اصل میں بارہ مجلسیں ہیں۔ نثر اردو کی ایک کامل کتاب تو نہیں کہی جاسکتی البتہ وہ اس زمانہ کی اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عبارت میں خامی ہے جیسا کہ ہر ابتدائی کام میں ہوا کرتی ہے جملے پیچیدہ پُر تصنع اور مقفیٰ ہیں۔ اسی طرح ایک مختصر نمونہ اُس زمانہ کی نثر اردو کا سودا کے کلیات کے شروع میں موجود ہے جس سے اس زمانہ کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہے زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں ہے صرف قافیہ دار الفاظ مثل نظم کے جملوں کے آخر میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے مملو ہے۔ ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے نثر کہی جاسکتی ہے ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انشاء اور قتیل کی دریائے لطافت گو فارسی میں ہے مگر نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں اُس وقت کے مختلف پیشہ وروں کی بولیاں مختلف رسوم و رواج اور معمول بول چال اور ضرب الامثال اور دلّی اور لکھنؤ کی زبان

---

[1] مجلس درست نام نہیں، کتاب کا اصل نام "کربل کتھا" ہے۔ مؤلف کا پورا نام فضل علی فضلی ہے۔ کتاب ۳۳-۱۷۳۲ء میں مکمل ہوئی۔ اس وقت فضلی کی عمر ۲۲-۲۳ برس تھی۔ اس طرح ان کا سال ولادت ۱۱-۱۷۱۰ء بنتا ہے یہ بے حد نایاب کتاب تھی۔ اس کا قلمی نسخہ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ٹوبنگن یونیورسٹی جرمنی کے ذخیرہ اشپرنگر سے دریافت کیا تھا اور اب انہوں نے مالک رام کے اشتراک سے مرتب کر کے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا ہے۔ (مرتب)

کا فرق اور متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبان کا زبان دہلی و لکھنؤ میں شامل ہونے سے اثر وغیرہ وغیرہ درج ہیں۔

نوطرزِ مرصع ترجمہ قصہ چہار درویش مصنفہ ۱۷۹۸ء

دوسری مشہور کتاب اس عہد نوطرزِ مرصع ہے کہ جس کو میر محمد عطا حسین خاں متخلص بہ تحسین نے امیر خسرو کے قصۂ چہار درویش سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء[۱] ہے اور یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل ہوا جن کی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے آخر میں دیا ہوا ہے۔ مصنف مذکور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے اور محمد باقر خاں شوق کے بیٹے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اس کے وہ جنرل اسمتھ کے میر منشی مقرر ہوئے اور انہیں کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب صاحب موصوف ولایت گئے تو تحسین پٹنہ چلے آئے اور وہاں وکالت کرنے لگے اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ سے فیض آباد آ گئے جہاں نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے یہ سلسلۂ ملازمت نواب آصف الدولہ کے زمانہ تک قائم رہا۔ تحسین علاوہ خوشنویس ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے۔ چنانچہ "ضوابط انگریزی" جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ ہے اور "تواریخ قاسمی" ان کی تصنیف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ "نوطرزِ مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے مملو ہے۔

---

[۱] ایک زمانہ تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ چار درویش امیر خسرو کی تصنیف ہے مگر پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات سے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چار درویش کے مولف حکیم مہدی علی المخاطب بہ معصوم علی خاں ہیں۔ جو محمد شاہ کے عہد ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ کے درمیان تھے۔ یہ کتاب مؤلفہ محمد شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ نوطرزِ مرصع کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء نہیں، آزاد، بلوم ہارٹ۔ تنہا، بیلی اور عبد الحق نے بھی یہی سنہ دیا ہے۔ بلوم ہارٹ نے ۲۴ برس کے بعد دوبارہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور لکھا کہ تحسین کا دیباچہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب شجاع الدولہ کے انتقال ۱۷۷۵ء میں مکمل کر لی تھی اور آصف الدولہ کے انتقال ۱۷۹۷ء سے کافی عرصہ قبل ختم ہو چکی تھی۔

(نوطرزِ مرصع کے مقدمہ سے)

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے داخلی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نوطرزِ مرصع کا ۱۷۶۸ء میں آغاز ہوا۔ اور ۱۷۷۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ تحسین کا اصل نام میر محمد حسین عطا خاں تحسین ہے۔ (مرتب)

غالباً یہی وجہ ہوگی کہ ڈاکٹر گلگرسٹ نے قصۂ چہار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار" نہایت صاف اردو زبان میں میر امن دہلوی سے کرایا جس کا مفصل حال آگے آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج[1] سے نثر اُردو کے تعلق کے اسباب

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں بڑے بڑے قطعات مُلک حاصل کر لئے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ ان کے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ ان کے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہوجائیں تجارتی تعلقات یوماً فیوماً کم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے جاتے تھے۔ مترجم جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کمپنی عمال یا تجار سمجھ سکتے تھے اب بیکار ہو گئے تھے کیونکہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی قوم تاوقتیکہ مفتوح قوم کے زبان اور رسوم و رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کما حقہٗ بلا واسطہ واقف نہ ہوگی اس پر پورے طور سے حکومت نہیں کرسکتی اور ان سب باتوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہٰذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ دیکھ کر کہ ان کے عمال ہندوستان میں اپنے فرائض منصبی محض دیسی زبانوں کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت بُری طرح سے ادھورے طریق پر ادا کرتے طریق پر ادا کرتے ہیں یہ تاکیدی حکم دے دیا کہ آئندہ سے ان کے حکام مقامی اپنے عمال کے واسطے دیسی زبانوں سے کما حقہٗ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک انگریزی عملداری میں داخل ہوتے جاتے تھے۔ لہٰذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رُکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں کے تعلیم میں پڑ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہونچ رہا تھا۔ اب دور ہو جائے۔ اسی اصول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی جس سے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب عظیم پیدا ہونا شروع ہوا۔ جس کا اثر کہیں نظم پر پڑا اور کہیں نثر پر مختصر یہ کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کے واسطے وہی کیا جو اب سے پانچ چھ سو برس پیشتر ریناسانس

---

[1] فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو قائم ہوا۔ (مرتب)

(نشاۃ ثانیہ) نے یورپ کے واسطے کیا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر تغیر اور انقلاب کے ساتھ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیاں بھی ضرور آجاتی ہیں مگر اس صورت میں اچھائیوں کا پلہ بھاری رہا۔ یعنی اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبانوں کو بہت فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء لغایت ۱۸۴۱ء

ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منتظم اعلی تھے اردو کے مربیّ (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ انہیں کی اَن تھک کوششوں سے ملک کی دیسی زبان یعنی اردو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی۔ اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی۔ ڈاکٹر واسکاٹ سکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں بمقام ایڈنبرا پیدا ہوئے۔ جارج ہیرٹ کی درسگاہ میں جو اسی شہر میں واقع تھی تعلیم پائی ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بہ حیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے[۱]۔ ابتدا ہی سے یہ خیال اُن کے دل میں راسخ تھا کہ انگریزی افسروں کو فارسی دانی کی اس قدر ضرورت نہیں رجیسا کہ اس وقت دستور تھا) جس قدر کہ ملک کی دیسی زبانوں علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اس وقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کے لئے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی۔ گلکرسٹ نے خود اس معاملہ میں سبقت کی۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی کپڑے پہنے ان مقامات میں جہاں اردو بہت صحیح اور بامحاورہ بولی جاتی تھی۔ برابر گھوما کرتے تھے[۲]۔ اور اردو کے علاوہ سنسکرت فارسی و دیگر مشرقی زبانوں سے بھی باخبر تھے۔ ان کی کامیابی کو دیکھ کر دیگر ملازمین کمپنی کے دل میں بھی اُردو پڑھنے کا شوق

---

[۱] گل کرسٹ ۱۷۸۲ء کے آخر میں بمبئی پہنچے۔ اسسٹنٹ سرجن کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ (مرتب)

[۲] ۱۷۸۵ء میں گل کرسٹ اپنی مجوزہ قواعد و لغت کی تکمیل کے لئے فیض آباد میں قیام کیا تھا۔ اپنی ادبی مہم میں گل کرسٹ اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ انہوں نے ہندوستانی لباس پہن لیا۔ لمبی سیاہ داڑھی بڑھائی، عوام میں جا کر قواعد لغت کے مسائل دریافت کرنے لگے۔ جب گل کرسٹ نے قواعد اردو کی کتابوں کے متعلق لوگوں سے پوچھا تو لوگ حیرت سے منہ تکنے لگے اور حیران ہو کر جواب دیا۔ "بھلا آج تک کہیں بھی کسی نے قواعد و لغت کی مدد سے اپنی زبان سیکھی ہے"۔ (مرتب)

(دیکھئے گل کرائسٹ اور ان کا عہد)

پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انگریزوں میں اردو پڑھنے کا رواج اسی وقت سے ہوگیا۔ لارڈ ولزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل تھے اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کر کے اور گلکرسٹ کے مفید کاموں کے عمدہ نتائج کو دیکھ کر ان کی مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔[1] یہ کالج ۱۸۰۰ء میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ اس میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ گلکرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پر نہ رہ سکے علالت کی وجہ سے مستعفی ہو کر ۱۸۰۴ء میں پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔[2] زبان اردو سے ان کو اس قدر عشق تھا کہ ایڈنبرا میں ۱۸۱۶ء تک قیام کر کے لندن آ گئے جہاں امیدواران انڈین سول سروس کو وہ مشرقی زبانوں میں پرائیویٹ طریق پر تعلیم دیا کرتے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں وہ اورینٹل انسٹیٹیوٹ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جس کو اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن میں قائم کیا تھا مگر ۱۸۲۵ء میں بند ہو گیا تھا۔ اس کے بند ہونے کے بعد بھی وہ تقریباً سال بھر تک شائقین زبان کو پرائیویٹ طور پر اردو پڑھاتے رہے اور

---

[1] سکینہ اور بعض دوسرے مورخین ادب نے لکھا ہے کہ گل کرسٹ اس کالج کے پرنسپل یا افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ یہ درست نہیں۔ گل کرسٹ کا تقرر ہندوستانی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ (مرتب)

[2] گل کرسٹ علالت کے باعث مستعفی نہ ہوئے تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ۱۸۰۴ء کے آغاز میں ولزلی نے شعبہ ہندوستانی کے طلبہ کے مباحثہ کیلئے جو موضوع تجویز کیا تھا اس کا ہندوستانی زبانوں میں انجیل کے تراجم سے تعلق تھا۔ موضوع کے مطابق طلبہ نے اس مسئلہ پر موافق یا مخالف ارکان کی حیثیت سے مباحثہ کرنا تھا کہ اگر انجیل کا ترجمہ تمام ہندوستانی زبانوں میں ہو جائے اور ہندوستانی لوگ اپنی مذہبی کتب سے اس کا مقابلہ کریں تو فوراً عیسائی ہو جائیں۔ مباحثہ کے اس موضوع سے کلکتہ میں شدید اضطراب پیدا ہوا۔ کمپنی کے بعض مخالف انگریزوں نے یہ تاثر دیا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ ہاؤس میں زبردستی عیسائی بنا لیا جائے گا۔ صورت حال کشیدہ دیکھ کر ولزلی نے یہ موضوع ہی منسوخ کر دیا، اس بات سے گل کرسٹ کو رنج ہوا اور انہوں نے استعفیٰ دیدیا۔ اردو نامہ اکتوبر ۱۹۶۳ء مقالہ از عتیق صدیقی (مرتب)

اپنے بعد اپنی جگہ پر سٹینڈ فورڈ آرنو اور ڈنکن فوربس کو جو مشہور مستشرق تھے مقرر کر گئے۔ گلکرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں بمقام پیرس ۱۸۴۱ء میں ہوا۔ وہ بہت سی کتب متعلقہ زبان ہندوستانی کے مصنف ہیں۔ جن کی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانوں کے تفتیشات) کی جلد نہم میں دی ہے۔ ان کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

(۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۲ حصوں میں۔ مطبوعہ ۱۷۹۳ء

(۲) اورنٹیل لنگوسٹ (مشرقی زبان داں) جو زبان اردو کا آسان مقدمہ ہے۔ مطبوعہ ۱۷۹۸ء۔

(۳) ہندوستانی گرامر۔ مطبوعہ ۱۷۹۶ء۔

(۴) ہندوستانی فلالوجی ۳؎

(۵) گلکرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کی کالج میں قائم ہوگئی تھی۔ جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کے پڑھنے کے واسطے درسی کتابیں بلکہ زبان اردو و ہندی میں مستقل تصانیف نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف کیں سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر ڈاکٹر گلکرسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہرہ سن کر کلکتہ پہونچ گئے تھے انہوں نے ان سب کو نیز اکثر کلکتہ کے لوگوں کو اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں۔ مثلاً کپتان روبک[۱]، کپتان ٹیلر[۲]

۱؎ کپتان ٹامس روبک نے لغت جہازرانی کلکتہ سے ۱۸۱۱ء میں شائع کی۔ ان کی قواعد اردو کی ایک کتاب ۱۸۲۴ء میں لندن سے چھپی۔ (مرتب)

۲؎ ٹیلر نے اردو انگریزی لغت لکھی جو ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے چھپی۔

۳؎ مکمل فہرست کتب کیلئے دیکھئے:۔

۱۔ قواعد اردو۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔

۲۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ عتیق صدیقی۔

۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری (مرتب)

۴۔ داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری۔

ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانہ میں مشہور ہندوستانی اہل قلم جو کالج میں جمع ہو گئے تھے حسب ذیل ہیں :۔

میرامن ۔ افسوس

حسینی لطیف

حیدری جوان

للو لال جی نہال چند

اکرام علی ولا سید محمد منیر

سید شیر علی افسوس ادیا

مداری لال گجراتی

میرامن دہلوی | میرامن دہلوی متخلص بہ لُطف دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں وظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ دُرّانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج کی لوٹ مار میں میرامن کا گھر بھی شامل تھا۔ اور سورج مل جاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرامن اس مصیبت میں دلی سے نکل کر پٹنہ پہونچے یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعلیم و تربیت ان کی سپرد تھی۔ اسی زمانہ میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کرا دیا[1] جن کی فرمائش سے انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب قصہ چہار درویش لکھی جس کا تاریخی نام باغ و بہار ہے یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اس کو امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیر و مرشد

---

[1] میرامن ۴ مئی سنہ ۱۸۰۱ء کو ماتحت منشی کے طور پر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ تنخواہ ۴۰ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ (مرتب)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بحالت علالت دل بہلانے کے واسطے تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو آپ نے دعا دی کہ اس قصہ کو جو کوئی سُنے گا وہ بحکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونوں اُردو ترجمے یعنی تحسین اور میر امن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کے اکثر دیسی زبانوں اور نیز غیر ملکی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں ختم ہوئی[1]۔ تحسین کے ترجمہ کو میر امن نے اپنی زبان میں لکھا ہے کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ تھے جن کو میر امن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو اس قدر صاف و سلیس و بامحاورہ عبارت میں لکھا کہ بقول سر سیّد مرحوم کے جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔ یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے، بلکہ اس میں اُس زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے مرقعے نہایت وضاحت سے کھینچے گئے ہیں۔ دیباچہ میں سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھ کر زبان اُردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بتا دی ہے جو زیادہ صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کتاب باغ و بہار انگریزوں میں بہت مقبول رہی ہے۔ چنانچہ اب تک وہ انگریزی حکام کے اُردو امتحانوں میں داخل درس ہے، علاوہ اس کتاب کے "گنجینۂ خوبی" بھی میر امن کی تصنیف ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی سے طرز میں ۱۸۰۲ء میں تحریر کی گئی[2]۔ منشی کریم الدین کا خیال ہے کہ میر امن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہو گا۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ ڈاکٹر فیلن نے خود میر امن کی زبانی سُنا تھا کہ کسی سے فن شعر میں تلمذ نہ تھا۔

---

[1] مئی ۱۸۰۱ء کے بعد باغ و بہار کا کام شروع ہوا۔ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی اور اور ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ (مرتب)

[2] اس کتاب کا نام "گنج خوبی" ہے۔ اس پر میر امن کو چار سو روپے انعام بھی ملے تھے۔ حال ہی میں شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے اُسے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

افسوس[1] سنہ ۱۷۳۵ء
تا غایت سنہ ۱۸۰۹ء

میر شیر علی دہلوی متخلص بہ افسوس میر علی مظفر خان کے بیٹے تھے جو نواب میر قاسم کے سرکار میں داروغہ سلح خانہ تھے۔ یہ حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں تھے اور اُن کے آباؤ اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں ایک شخص سید بدر الدین نامی نار نول میں جو آگرہ کے قریب ہے سکونت گزیں ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے باپ اور چچا سید غلام علی خاں آگرہ سے دلّی آئے۔ اور عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ایک بیش قرار تنخواہ پر ملازمت اختیار کی۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے جس کو ان کے بزرگوں نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا۔ ۱۷۴۶ء میں جب نواب امیر خاں کا انتقال ہوا تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور ان کے بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آخر الذکر معزول کئے گئے تو وہ لکھنؤ آگئے تھے اور چونکہ میلان طبیعت شعر و شاعری کی طرف بہت تھا اور فضائے لکھنؤ میں زمانہ شاعری اس وقت گونج رہا تھا۔ انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیران کو دکھلاتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ میر حسن۔ میر تقی اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور انکے بعد ان کے بیٹے نواب مرزا نوازش علی خان کرتے رہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں نواب حسن رضا خاں نائب نواب آصف الدولہ کی وساطت سے افسوس کرنیل اسکاٹ صاحب سے ملے جنہوں نے ان کی قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ مشاہرہ پر ان کو کلکتہ بھیجا اور پانچسو روپیہ زاد راہ کے لئے بھی عنایت فرمائے افسوس راستے میں مرشد آباد میں مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند سے بھی ملے تھے۔ کلکتہ پہونچکر وہ فورٹ ولیم کالج کے زمرۂ استادان میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے[2]۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] ولادت ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء اور ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء کے درمیان (کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ)

[2] افسوس بطور مترجم ۱۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ملازم ہوئے ۲۰۰ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۹ نومبر ۱۸۰۴ء کو افسوس ہیڈ منشی ہو گئے، افسوس ان فرائض سے ۱۸۰۸ء میں فارغ ہوئے۔
(کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۵۵)

(۱) اردو ترجمۂ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو[1] جو کلکتہ میں پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں چھپا تھا اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

(۲) ۱۸۰۴ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب آرائش محفل[2] لکھنا شروع کی جس میں علاوہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے اس کی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی مگر اُس کا اصلی ماخذ منشی سوجن رائے بٹیالوی کی خلاصۃ التواریخ ہے ان کے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی کی نثر بے نظیر منشی عزت اللہ کی مذہب عشق اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی بہار دانش کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی اور کلیات سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی[3] | ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے بہر طور اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے اور کتب ذیل کے مصنف ہیں۔

(۱) اخلاق ہندی جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی یہ ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مُفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا صاف اور سلیس اُردو ترجمہ ہے

(۲) نثر بے نظیر یعنی مثنوی میر حسن نثر میں جو ۱۸۰۲ء میں تصنیف اور ۱۸۰۳ء میں یعنی دو برس قبل اصل مثنوی کے شائع ہوئی۔

(۳) رسالہ گلکرسٹ یعنی گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اُردو کی صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۶ء۔

۱-۲ باغ اردو اور آرائش محفل مجلس ترقی ادب لاہور شائع کی ہیں۔ (مرتب)

۳ بہادر علی حسینی غالباً دلی کے سادات میں سے تھے۔ باپ کا نام عبداللہ کاظم تھا۔ کریم الدین، نگارستان قلمی تاسی اور سید محمد لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن کا جب پہلی بار ترجمہ کیا تھا اسکی اشاعت انہی عبداللہ کاظم کی سعی سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کی تردید کی ہے (کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۸۹) حسینی کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو قائم ہوا ۱۸۰۸ء نومبر ۱۸۰۴ء تک بحیثیت میر منشی اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ (مرتب)

(۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین تالش ۔ جسمیں اورنگ زیب کے مشہور جرنیل میر جملہ کے حملۂ آسام ۱۶۶۲ء کا ذکر ہے ۔ حسب الحکم کولبرک صاحب ترتیب پایا ۔ ان کے علاوہ قصۂ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ میں بھی حسینی نے شرکت کی تھی ۔

سید حیدر بخش حیدری[1] سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے ۔ ان کے آباو اجداد نجف کے باشندے تھے ۔ ان کے والد لالہ سکھ پورا ئے کے ساتھ دلی سے نکل کر بنارس پہونچے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے ۔ بنارس میں اس وقت نواب علی ابراہیم خان متخلص بہ خلیل مصنف تذکرۂ گلزار ابراہیم عدالت انگریزی کے جج تھے ان کی سپردگی میں حیدری دیئے گئے ۔ تاکہ نواب صاحب کے فیض صحبت سے اچھی طرح مستفیض ہوں علوم مذہبی کی تعلیم ان کی مولوی غلام حسین غازی پوری کے سایۂ عاطفت میں ہوئی جو نواب صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سربرآوردہ مولوی تھے ۔ ۱۸۰۰ء میں یہ سُن کر کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قابل منشیوں کی مانگ ہے ۔ حیدری نے ایک کتاب موسوم بہ "قصۂ مہر و ماہ" ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۴ھ ہے اور اس کو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں بطور اپنی قابلیت کے نمونہ کے پیش کیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو بہت پسند کیا اور حیدری کو کالج مذکور کی ایک منشی گری پر ممتاز کیا[2] ۔ حیدری کی اکثر تصانیف ہیں جو زیادہ تر فارسی کتابوں کے تراجم ہیں ۔ کتب ذیل زیادہ مشہور ہیں ۔ (۱) قصہ لیلیٰ مجنوں ۔ جو امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ غالباً ملازمت کلکتہ سے پیشتر تحریر ہوا تھا ۔

(۲) طوطا کہانی[3] سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ مصنفہ ۱۸۰۱ء بحکم ڈاکٹر

---

[1] وفات ۱۸۲۳ء ۔ (مرتب)

[2] حیدری کا تقرر بحیثیت ماتحت منشی ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو ہوا (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۵)

[3] توتا کہانی مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی ہے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے ۔

گلکرسٹ صاحب۔ اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں شوکا شپتی کے نام سے تھا۔ فارسی میں اسی نام کی ایک کتاب جو باون قصوں پر مشتمل تھی ضیائے بخشی نے ۱۳۳۰ھ میں لکھی تھی۔ جس سے یہ دوسرا طوطی نامہ پینتیس ۳۵ قصص کا سید محمد قادری نے ۱۷۹۳ء ۹۲ میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا۔ یہ سب قصے، مثل انگریزی کنگ آرتھر کے فسانوں کے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں مختلف اوقات میں ہوئے مثلاً انگریزی میں اسمال صاحب نے ۱۸۷۵ء میں کیا بنگلہ میں چندی چرن سیرام پوری نے ۱۸۰۶ء میں کیا اور طوطا اتہاس نام رکھا ہندی میں انبا پرشاد راسا نے زبان دکنی میں نظم میں غواصی نے اور نثر میں ایک غیر معلوم شخص نے۔ ہندی میں اصل سنسکرت سے بھیرو ل پرشاد نے۔ گجراتی نظم میں سملا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے۔

(۴) آرائش محفل ترجمہ قصہ حاتم طائی اس کو میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل سے غلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ یہ قصہ سب سے پہلے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں چھپا تھا اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دلچسپ ہے اس کا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور گجراتی میں ہو گیا ہے۔

(۴) تاریخ نادری ترجمہ نادر نامہ منشی مرزا مہدی مرتبہ ۱۲۲۴ھ

(۵) گل مغفرت جس کو انہیں کے گلشن شہید ان کا خلاصہ سمجھنا چاہیئے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے اس کا دوسرا نام دہ مجلس بھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔ اس کا ترجمہ زبان فرانسیسی میں بھی ہو گیا ہے۔

(۶) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ جس میں عورتوں کے مکر و کید کے قصے درج ہیں۔

(۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب مصنفہ ۱۸۰۵ء

(۸) ان کے علاوہ حیدر اتی ایک دیوان غزلیات اور مجموعہ صد حکایات بھی ان کی تصانیف سے ہیں[1]۔ حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب اودھ میں ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوان اصل میں دلّی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۷۹۵ء میں وہ موجود تھے ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں کیا ہے جن کے پاس بنارس میں انہوں نے اپنا کچھ کلام نمونتاً بھیجا تھا ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو منشی گری کی ایک جگہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا۔ منشی بینی نارائن اپنے تذکرہ جہان میں جو ۱۸۱۲ء کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت زندہ تھے بلکہ ۱۸۱۵ء میں جو مشاعرے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہوئے تھے اس میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہیں۔

(۱) کالیداس کی مشہور کتاب شکنتلا ناٹک کا اردو ترجمہ جس کے دیباچہ میں بطور تمہید کے وہ لکھتے ہیں لکھتے ہیں کہ کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں ۱۷۱۶ء میں ایک شاعر نواز کبیشر نامی نے مولے خاں پسر خدای خاں سپہ سالار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے یہ ترجمہ برج بھاشا سے بزبان اردو ۱۸۰۱ء میں کیا گیا

اور اس پر نظر ثانی للو لال جی کبیشر نے کی اور کلکتہ میں ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا۔[۲]
(۲) قرآن شریف کا ایک اردو ترجمہ حسب فرمائش گلکرسٹ صاحب[۳] (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی جس کی تصنیف میں للو لال جی

---

[۱] حیدری کی تین کتابیں اور بھی ہیں۔
۱۔ گلشن ہند ۱۸۰۰ء تذکرہ شعرائے اردو
(۲) گلدستہ حیدری ۱۸۰۳ مجموعہ مراثی۔ حکایت و لطائف، دیباچہ مہر و ماہ اور لیلیٰ مجنوں۔ غزلیات و قصائد وغیرہ
(۳) حیدر بخش حیدری کی کہانیاں۔ اس کتاب کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ (مرتب)

[۲] شکنتلا کے دو ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوئے ہیں ایک ایڈیشن ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کیا ہے جسے اردو دنیا کراچی نے شائع کیا ہے دوسرا ایڈیشن

باقی اگلے صفحہ پر

بھی شریک تھے (۵)، بارہ ماسہ یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۲ء جس میں ہندوستان کی مختلف فصلوں اور موسموں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب بعد ترجمہ شکنتلا ناٹک کے تحریر ہوئی۔

جوان نے "خرد افروز" (جس کا حال آگے آتا ہے) اور میر و سودا کے کلام سے کچھ منتخبات بھی شائع کیے تھے ان کے دو بیٹے عیاں اور عتانہ بھی کسی قدر مشہور ہوئے۔

نہال چند لاہوری دلی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ لاہور میں زیادہ رہے اس وجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہیں۔ سنہ ۱۲۱۷ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ ان کے کچھ مزید حالات معلوم نہیں سوائے اس کے جیسا کہ اپنی کتاب مذہب عشق کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ کپتان ڈورٹ نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے ان کا تعارف کرایا جن کو فرمائش سے انہوں نے قصہ تاج الملوک اور بکاولی کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) مذکورہ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہے) معروف بہ قصۂ گل بکاؤلی جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصۂ مصنفہ ۱۱۲۴ھ کا اردو ترجمہ ہے ایک دوسرا اردو منظوم ترجمہ اسی قصہ کا کسی شخص ریحان نامی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا ہے۔ جس میں چالیس باب ہیں جو گلگشت کے نام سے

بقیہ حاشیہ

ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کے مقدمہ کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے۔

۳؎ سنہ ۱۸۰۴ء (مرتب)

۴؎ سنہ ۱۸۰۹ء (مرتب)

۵؎ انتخاب کلیات سودا بہ اشتراک افسوس ۱۸۱۰ء انتخاب میر دیگر ادیبوں کی شراکت سے ۱۸۱۱ء (مرتب)

موسوم ہیں، نیز ایک اُردو مثنوی موسوم بہ تحفۃ المجالس اسی قصہ کی بہت قدیم موجود ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے سنہ ۱۰۵۳ھ نکلتے ہیں۔ اور اس سے بھی ایک قدیم تر نسخہ کا پتہ چلتا ہے جو زبان دکنی میں ہے جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۳۵ھ ہے مگر ان سب سے زیادہ مشہور مثنوی گلزار نسیم ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے۔ مذہب عشق کا سنہ تصنیف ان تاریخوں سے جو کتاب کے آخر میں دی ہوتی ہیں ۱۲۱۷ھ اور ۱۸۱۳ عیسوی نکلتا ہے۔

مظہر علی خاںؔ ولا — مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خان متخلص بہ ولا سلیمان[2] علی خان وداد کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ گلشن بیخار میں میر نظام الدین ممنون کو بھی انکا استاد لکھا ہے یہ بھی کلکتہ کے کالج میں منشی تھے اور اکثر تراجم ان کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً

(۱) پند نامہ سعدی کا اردو ترجمہ منظوم مصنفہ ۱۸۰۲ء

(۲) ناصر علی خان بلگرامی واسطی کی ہفت گلشن کا ترجمہ جو اخلاق و مواعظ کی کتاب ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے۔ جو تاریخیں اس کے آخر میں دی ہوتی ہیں ان سے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء نکلتا ہے۔ اس میں اخلاقی حکایتیں آداب گفتگو بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور رچنیا احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہیں [2]

(۳) قصہ مادھونل و کام کنڈلا جو موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کا اردو ترجمہ ہے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء ہے [3]

(۴) صورت کبیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا اردو ترجمہ جو للو لال جی کی شرکت

---

[1] ولانے اپنے خاندانی حالات "جہاں گیر شاہی" کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ ان کے مطابق ولا کے بزرگ اصفہان سے شاہ جہان آباد آئے۔ ان کے دادا محمد شاہ کے ملازم ہوتے علی قلی خاں کا خطاب اور بائیس خدمتوں کا اعزاز ملا ولا کے والد سلیمان قلی خاں منگ باشی کے عہدہ پر کام کرتے رہے ولا لکھنؤ میں جہاندار شاہ کی رفاقت میں رہے ۱۲۰۱ھ کے بعد آصف الدولہ کے دربار سے متعلق رہے فورٹ ولیم کالج مرزا جعفر (م ۱۲۳۰ھ) کی وساطت سے پہنچے (باقی اگلے صفحہ پر)

میں کیا گیا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پچیس قصے کسی بتیال (بھوت) نے راجہ بکرماجیت کے سامنے کہے تھے یہ ہندوستانی پبلک میں بہت مقبول ہے مگر اس میں کوئی ادبی ندرت نہیں ہے (۵) فارسی تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی میں بھی ہو گیا ہے (۶) ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا جس میں غزلیات قصاید رباعیات وغیرہ مع سوانحِ مصنف کے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد انہوں نے خرد افروز کے نام سے ۱۸۰۳ء میں ابوالفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا اور عیار دانش خود ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی تلخیص اور انوار سہیلی کلیلہ دمنہ عربی کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہیں قصوں کا ایک ناتمام ترجمہ انوار سہیلی سے ایک شخص مرزا مہدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس کے منشی تھے اور ان کے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے۔ کپتان ناکس نے گیا میں ایک مشہور داستان گو سینگا خاں نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا اور ان دونوں کا مقابلہ کر کے مرزا مہدی کے ترجمہ کو ترجیح دی تھی۔ انوار سہیلی کا ایک ترجمہ دکنی زبان میں بھی موجود ہے جو ایک شخص مسمی محمد ابراہیم بیجاپوری کی تصنیف ہے اور مدراس میں ۱۸۲۴ء میں چھپا ہے۔ بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا کی بھی اسی کا

بقیہ حاشیہ

بحیثیت مترجم ۱۰۔ نومبر ۱۸۰۰ء کو ملازم ہوئے ۳۰ اگست ۱۸۰۲ء کو برطرف کئے گئے مگر ۴۔ اکتوبر ۱۸۰۲ء کو دوبارہ ملازم کئے گئے ۱۸۱۴ء تک ان کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) گل کرسٹ اور اس کا عہد

(۲) دیباچہ جہانگیر شاہی (مرتب)

(۳) سلیمان قلی خاں وداد (مرتب)

صہ ۴ صہ ۵ یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو گئی ہیں

صہ ۵ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔ (مرتب)

ترجمہ ستارہ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ ارژنگ راضی بہاری لال بھرت پوری نے ۱۸۷۹ء میں کیا تھا۔

مولوی اکرام علی[1] انہوں نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا[2] کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کو جو تعداد میں اکاون ہیں اشخاص ذیل نے تحریر کیا۔ محمد بن نصر المقدسی۔ ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی ابو احمد المشہر جوری عوفی۔ زید بن رفاعہ اور یہ سب کے سب حکیم تھے اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ڈیٹرس نے ۱۸۵۰ء لغایت ۱۸۷۹ء میں کیا مولوی صاحب موصوف نے اردو میں صرف اس قدر حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ جس میں کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ مختصر مضمون یہ کہ جانور اپنے مالک انسان کے ظلم و تعدی سے عاجز آگئے ہیں اور انہوں نے اپنا یہ مرافعہ بادشاہ اجنہ کے پاس جس کا نام بیوراسب ہے پیش کیا ہے اس مقدمے کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا ہے۔ جس میں سب جانور جمع ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہونچاتا ہے اور انسان اس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا ہے بیان کرتا ہے۔ چنانچہ گھوڑے گدھے اونٹ اور بھیڑی ہے کے بیان یکے بعد دیگرے لئے جاتے ہیں جو سب ایسے ہی دلچسپ ہیں۔ جیسے کہ کنگہ بی کی مشہور انگریزی کتاب ایونگز ایٹ ہوم یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمائش سے نہایت سلیس اور آسان اردو میں کیا گیا اور ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔ کپتان

---

[1] مولوی اکرام علی کا شجرۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے اکرام سیتا پور کے رہنے والے تھے۔ باپ کا نام احسان علی تھا۔ اکرام علی کی تعلیم و تربیت "مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تقرر فروری ۱۸۰۲ء میں ہوا یہاں سے فارغ ہو کر کلکتہ کے صدر الصدور بھی رہے۔ کلکتہ ہی میں ۱۲۵۳/۱۸۳۷ء کو فوت ہوگئے (مرتب)

(۱) مولوی اکرام علی اور فورٹ ولیم کالج (۲) مقدمہ اخوان الصفا از احراز نقوی

[2] اخوان الصفا مجلس ترقی ادب لاہور نے ڈاکٹر احراز نقوی کے مقدمہ کے ساتھ شائع کی ہے۔ (مرتب)

لاکٹ کی سفارش سے جو اس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسرِ اعلیٰ تھے

مولوی اکرام علی ۱۸۱۴ء میں محافظ دفتر مقرر ہوتے تھے۔

للّو لال جی[1] | یہ گجراتی برہمن تھے مگر شمالی ہند میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ باوصف اس کے کہ ہندو تھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ شکنتلا ناٹک۔ سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف میں انہوں نے اصل مصنفوں کو بہت مدد دی تھی جس کا حال اوپر بیان ہوا۔ علاوہ اس کے ۱۸۱۰ء میں انہوں نے ایک کتاب زبان ہندی میں لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطائف ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن | بینی نرائن متخلص بہ جہاں دیوان جہاں کے مصنف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندوستانی شعرا کا بھی شامل ہے جو کپتان روبک صاحب سیکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے ۱۸۱۲ء میں لکھا گیا اور انہیں کے نام پر معنون بھی ہے[2]۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا۔ جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۱۱ء میں منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ جنہوں نے اس کو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اس کی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کرا دی۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق ہے کہ انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف | کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے جو استر آباد کے رہنے والے تھے اور ۱۱۵۶ھ میں نادر شاہ کی ہمراہی میں آئے تھے اور بعد کو ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی میں داخل ہو گئے۔ لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے جن کا تخلص ہجر یا ہجری تھا۔ اردو شاعری کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں۔ دکن حیدرآباد کے سفر کے ارادے سے نکلے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کو روک لیا اور ان کا مشہور تذکرہ "گلشن ہند" ان سے لکھوایا۔ چنانچہ اس

---

[1] للولال جی ۸ر جون ۱۸۰۲ء کو فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ (مرتب)
(گل کرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۵۹)

[2] دیوان جہاں ۱۹۵۹ء میں کلیم الدین احمد نے پٹنہ سے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

قصہ کا ذکر انہوں نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء اور ماخذ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے گو کہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے یہ تذکرہ بالکل نایاب تھا۔ جب حیدر آباد میں طوفان عظیم آیا تو اُس کی ایک جلد موسیٰ ندی میں بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ اتفاقاً وہ کسی قدر دان کے ہاتھ آئی اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دلچسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے اس وجہ سے کہ اُس زمانہ کا طرز تحریر اس وقت کے مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے کہ مصنّف سے ملاقات ہوئی اور اُس وقت کی سوسائٹی کے مرقعے اس میں موجود ہیں۔ ہر چند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پُر تکلف و پُر تصنّع مسجّع و مقفّیٰ ہے۔

مولوی امانت اللہ | ان کا تخلص شیدا تھا۔ انہوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ "جامع الاخلاق" کے نام سے کپتان جیمس مونٹ صاحب کے حکم سے ۱۸۰۵ء میں کیا۔ دیباچہ میں کپتان مذکور اور نیز گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف ہے۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں کتاب ہدایت الاسلام بزبان عربی در اردو تحریر کی جس کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں کیا۔ ۱۸۱۰ء میں انہوں نے ایک منظوم صرف و نحو اُردو موسوم بہ صرف اُردو تصنیف کی۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار | علاوہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی و نثار یہ تھے: سید جعفر علی رواں لکھنوی، افتخار الدین شہرت، عبدالکریم خاں کریم دہلوی، مرزا ہاشم علی عیاں، مرزا قاسم علی غمناز، میر عبداللہ مسکین[1]، مرزا جان طپش[2]

---

[1] میر عبداللہ مسکین کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے ثابت نہیں۔ (مرتب)

[2] مرزا جان طپش تقریباً ۱۱۸۲ھ / ۶۹-۱۷۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت میں فضیلت حاصل کی۔ جہاندار شاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ۱۱۹۸ھ میں ان کے ساتھ لکھنؤ اور پھر بنارس گئے۔ ۱۲۰۱ھ میں ان کے انتقال پر ڈھاکہ میں نواب احمد علی خاں سے وابستہ ہوئے۔ بعد ازاں فورٹ ولیم کالج سے تعلق قائم کیا۔ ۱۸۰۲ء میں مثنوی بہار دانش لکھی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں انتقال کیا۔ (مقدمہ بہار دانش۔ از خلیل الرحمٰن داؤدی گل کرسٹ اور اس کا عہد) مرتب

مولوی خلیل علیخاںؔ[1]، اشکؔ اور مرزا محمد فطرتؔ[2] - اشکؔ نے ۱۸۰۹ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ "واقعات اکبر" کے نام سے تیار کیا، مگر وہ شائع نہیں ہوا - طپشؔ نے ایک کتاب اُردو محاورات پر لکھی اور ۱۸۱۱ء میں ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی - ان کا کلیات فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہو گیا ہے -

تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہؒ وشاہ عبدالعزیزؒ وشاہ عبدالقادرؒ شاہ رفیع الدینؒ

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث و صوفی اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہیں - ان کی متعدد تصانیف ہیں - جن میں حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا عن سیرۃ الخلفا نہایت مشہور و ممتاز ہیں - ان کے بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ صاحب بھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار سے کم نہ تھے ان کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا - دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ / ۱۲۳۲ھ بھی نہایت جید عالم تھے جنہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو[3] ترجمہ کیا - تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر تھے (۱۱۶۷ھ / ۱۲۳۰ھ) جو اپنے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے - انہوں نے ۱۲۰۵ھ میں ایک دوسرا اردو ترجمہ قرآن شریف کا کیا اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے تصنیف کی - ان کا ترجمہ نہایت سلیس سادہ اور بامحاورہ اردو میں ہے جس سے اُن کا تبحر علمی بدرجۂ اتم ظاہر ہے - یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا اور اب تک ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمہ

---

[1] اشکؔ نے اپنے حالات "انتخاب سلطانیہ" میں لکھے ہیں - یہ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے - چھوٹی عمر میں فیض آباد چلے گئے، وہیں تربیت پائی، ۱۷۹۴ء میں بنگال گئے، ۱۸۰۳ء میں کاظم علی جوان کے توسط سے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے کتب یہ ہیں - داستان امیر حمزہ ۱۸۰۱ء - رسالہ کائنات ۱۸۰۴ء گلزار چین ۱۸۰۴ء (یہ دونوں کتب ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شائع کر دی ہیں)، انتخاب سلطانیہ ۱۸۰۴ء واقعات اکبر ۱۸۰۹ء (مرتب)

[2] مرزا فطرتؔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے - ۵ نومبر ۱۸۰۳ء کو بحیثیت مترجم فورٹ ولیم میں ملازم ہوئے - اُن کا اہم علمی کام یہ ہے کہ انہوں نے ہیڈلے کے لغت میں بہت سے مفید اضافے کئے اور اس کی تصحیح کی یہ لغت ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا -

[3] قرآن مجید کا یہ پہلا اردو ترجمہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء کے قریب ہوا -

قرآن شریف میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور رہے اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ گئے کیونکہ ان لوگوں کے تراجم اصل میں قرآن شریف کے تراجم نہیں بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ کے تراجم کے تراجم ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے فی الحقیقت اُس تغیر عظیم کا پتہ دیتے ہیں۔ جو زبان اردو میں ہونے والا تھا۔ جبکہ فارسی کا اختلاط ہو رہا تھا۔

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی | مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے تھے۔ ذہانت اور رسائی فکر میں یگانۂ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم با عمل تھے۔ سید احمد مجاہد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالاکوٹ ملک پنجاب کے قریب شربت شہادت سے سیراب ہوئے یہ واقعہ ۱۲۴۶ھ کا ہے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر ایک قصیدہ کی صورت میں لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ	نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے	اگرچہ تھے دُم شملہ سے وہ شیر نیستانی

جب اس قسم کے طنز آمیز اشعار اُن کے مریدوں نے سُنے تو وہ شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ دوڑے اور ان کی خوب خبر لینا چاہی۔ مرزا خانی[۱] کوتوال شہر کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ موقع واردات پر پہونچے اور شاہ صاحب کو ان لوگوں سے چھڑا لایا۔ مولانائے موصوف کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

رسالہ توحید۔ صراط مستقیم۔ تنویر العینین۔ تقویۃ الایمان وغیرہ۔

ترتیب صرف و نحو و لغات اُردو | کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف و نحو و تراجم

---

[۱] یہ مرزا خانی راقم آثم (مترجم) کے دادا تھے جنکی تعریف میں اسی قصیدہ میں بطور شکریہ کے شاہ صاحب نے یہ شعر کہا ہے۔

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا   نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر بانی میرزا خانی

(دیکھو آب حیات ذکر شاہ نصیر)۔

کے اوپر بھی پوری توجہ مبذول کی گئی۔ کتب مذکورہ ذیل اُن یورپین اصحاب کی تصنیف و تالیف ہیں جن کو زبانِ اُردو کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی۔ سب سے پہلی ہندوستانی گرامر وہ ہے جو ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کیٹلر نے تصنیف کی تھی جو بزمانہ شاہ عالم و جہاندار شاہ یعنی ۱۷۱۲ء میں مملکت ہالینڈ کی طرف سے ہندوستان میں سفیر تھے۔ انہوں نے آگرہ لاہور دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی اور ۱۷۱۶ء میں اپنے ملک کی طرف سے ایران میں بھی سفیر ہوئے تھے، انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جس کو ایک انگریز ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کیٹلر مذکور کی گرامر میں نہ صرف ہندوستانی افعال کی گردانیں ہیں۔ بلکہ احکام عشرۂ توراۃ اور "لارڈس پریر" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔ ۱۷۴۴ء میں ایک مشہور جرمن پادری شلز نامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا ہندوستانی کا" زبان لاطینی میں تیار کی جس میں ہندوستانی الفاظ بخط عربی و فارسی مع خط انگریزی کے تحریر کئے۔ اسی سنہ میں مل نے ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اوپر ایک رسالہ لکھا۔ ۱۷۴۸ء میں بھی اسی مضمون کی ایک کتاب جی۔ اے۔ فرٹز نے تصنیف کی جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور ۱۷۷۱ء میں اسی قسم کی ایک تیسری کتاب ایک اطالوی پادری کیسیانو بیلی گاگی ٹے نے تصنیف کی جس کا نام "الفابیٹم برہمانکم" رکھا۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی حروف اپنی خاص شکل میں ٹائپ میں لکھے گئے۔ ۱۷۷۲ء میں ہیڈلی کی گرامر اور ۱۷۷۸ء میں زبان پرتگالی میں ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا اندوستانا" چھپیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف کا زمانہ آتا ہے جنہوں نے نہایت شوق اور تلاش سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگیں اور تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں ان کی مدت تصنیف بیس برس ہے اور ۱۷۸۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں متعلق بہ صرف و نحو و علم الالسنہ و لغات و تراجم و امثال وغیرہ تصنیف کیں۔ اکثر ہندوستانی منشی اور پنڈت جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے ان کے ساتھ بھی بہ شریک تصنیف رہے۔ اس کے علاوہ ان کی نگرانی میں متعدد عمدہ عمدہ ادبی کتابیں تیار ہوئیں۔ مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے روح رواں تھے اور علاوہ علمی قابلیت و استعداد کے ایسے خلیق متواضع اور ہمدرد

واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع ملک سے قابل قابل لوگ ان کی قدردانی کا شہرہ سُن کر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۰ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۸۰۹ء ہیں۔ اسی طرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۰۸ء میں اور مولوی امانت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف اُردو ۱۸۱۰ء میں تصنیف کیں۔ جان شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۱۳ء میں اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئیں۔ کپتان پرائس اور ٹیس نے بھی ہندوستانی کتابیں لکھیں گارسن ڈیٹاسی مشہور مستشرق فرانس نے زبان اُردو کے متعلق متعدد کتابیں زبان فرانسیسی میں تصنیف کیں اور ڈنکن فاربس نے اپنی متعدد تصانیف سے جو از قسم گرامر اور لغت ہیں اور نیز اُردو کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے زبان اُردو کو ممنون احسان کیا۔ میر ولیم مانیر بانی ایشاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید کتابیں بصورت گرامر اور لغت کے تصنیف کیں۔ پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۸۴ء میں اور پادری کریون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۹۱ء میں چھپ کر نکلیں اور یہ سب کتابیں طلبار کے لئے نہایت مفید سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ لغات و دیگر کتب

اب دیکھنا چاہیئے کہ خود ہندوستانیوں نے اپنی زبان کی ترقی و تدوین میں کیا حصہ لیا۔ انشار اور قتیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت" جس کو زبانِ اُردو کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہیئے۔ ۱۸۰۲ء میں تحریر اور ۱۸۴۸ء میں بمقام مرشد آباد پہلی بار شائع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے ایک اُردو کی صرف و نحو معروف بہ تحفہ الفنسٹن ۱۸۲۳ء میں لکھی مولوی احمد علی دہلوی کا رسالہ "چشمۂ فیض" اُردو کی صرف و نحو پر ۱۸۴۵ء اور مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدایق البلاغت ۱۸۴۹ء اور منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی۔ نثار علی بیگ فیض اللہ خان اور محمد احسن کے رسالجات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب "جامع القواعد" مطبوعہ لاہور[1] ۱۸۴۵ء۔ جلال کی "گلشن فیض" مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۰ء جو ایک اُردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق کی لغت ہے یہ سب اسی زمانے کی تصنیف

---

[1] جامع القواعد ۱۸۸۴ء (مرتب)

ہیں۔ زمانہ حال کی تصانیف میں منشی امیر احمد صاحب کی مشہور لغت امیر اللغات (جو افسوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ چار جلدوں میں جو سالہا سال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریا دلی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور مولوی نور الحسن صاحب نیر کاکوروی کی نور اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر رسالہ صرف و نحو ایک نئے طریقے سے ترتیب دیا ہے۔ مگر ہماری ناچیز رائے میں باوجود ان تمام کتب کے جن میں سے اکثر فی زماننا موجود ہیں۔ پھر بھی ایک مکمل سائنٹیفک اردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ اگر اس زمانے کے فضلا کمر ہمت باندھ لیں اور امیر اللغات کی باقی جلدیں پوری کر دیں اور کوئی دریا دل رئیس اُس کی طباعت کا اہتمام کر دے تو اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے تکمیل سے زبان اُردو کی نہایت معقول اور عمدہ خدمت سرانجام پائے گی۔

عیسائی پادریوں کے کارنامے زبان اُردو کی توسیع و ترقی میں

سب سے قدیم اُردو ترجمے بائیبل کے وہ ہیں جو بنجمن شلز اور کالبرگ نے ۱۷۴۵ء لغایت ۱۷۵۸ء میں کئے۔ مرزا محمد فطرت اور دیگر کالج کے منشیوں نے "عہد جدید کا ترجمہ اُردو میں کیا جو بنظر ثانی ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے بھی بائیبل کے ترجمے اردو ہندی میں نکالے۔ پادری مارٹن نے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید کا ترجمہ زبان یونانی سے اُردو میں کیا جس پر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء لغایت ۱۸۱۹ء میں شائع کیا۔ پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس پر دل نشیں کرنے کے واسطے انہیں کی زبان میں اپنی تحریریں اور تقریریں کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جن میں مذہبی روایتوں اور گیتوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

باب ۱۶

نثرِ اُردو کا متوسّط اور دَورِ جدید

مطبوعات لکھنؤ ہر چند کہ نثرِ اُردو کی ابتدا، فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ بھی جو دلّی کی تباہی کے بعد علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ نثر نگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا۔ کتب ذیل سب اسی اشرف البلاد کی طباعت کی یادگار ہیں۔ بستانِ حکمت۔ کلیلہ دمنہ۔ گل بکاولی۔ گلشن نوبہار۔ گل و صنوبر، نورتن[1] مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرأت وغیرہ وغیرہ۔

فقیر محمد خاں گویا۔ بستانِ حکمت ۱۲۵۱ھ نواب فقیر محمد خاں لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور فوج شاہی کے ایک مشہور رسالدار تھے۔ حُسام الدولہ خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے مگر خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحبِ دیوان ہیں گو کہ دیوان ان کے مرنے کے ایک عرصہ کے بعد مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپا۔ گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ ان کی تصنیف بُستانِ حکمت انوارِ سہیلی کا مشہور ترجمہ ہے۔ جو

---

[1] ان داستانوں کے مصنف اور ان کے سِنینِ تصنیف:۔

گلشن نوبہار ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء از محمد بخش مہجور

گل و صنوبر ۵۲-۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۶ء از پریم چند کھتری۔ (مرتب)

۱۲۵۱ھ میں ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ کہی جس کا مصرع تاریخ یہ ہے ع خود گفت بستان سیراب حکمت۔ سبب تالیف اس کا مصنف یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سہیلی کا ذکر ہو رہا تھا اور سب لوگ اس کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اثنائے گفتگو میں سب اہل محفل نے مصنف سے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو میں ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو۔ غرضکہ ان لوگوں کے اصرار پر مصنف نے کمر ہمت باندھی اور ترجمہ شروع کر کے انجام کو پہونچایا۔ اگر کتاب کو باستیعاب پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ موقع موقع پر ایجاز و اطناب کو دخل دیا ہے۔ البتہ عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت ہیں اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہیں۔ عربی الفاظ اور امثال بکثرت استعمال کئے گئے ہیں جس سے کہیں کہیں عبارت بے مزہ اور مغلق ہو گئی ہے مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع نہیں جیسا کہ سرور کی فسانہ عجائب کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب ایک زمانے میں مقبول تھی۔ مگر اب لوگ اس کو کم پڑھتے ہیں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور متوفی ۱۲۸۴ھ

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا رجب علی بیگ سرور ایک جامع الکمالات شخص تھے باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۱۹۷ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما اور تعلیم پائی عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاطوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں موجود ہے۔ موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے فن شعر میں آغا نوازش تلمیذ میر سوز کے شاگرد تھے جن کا ذکر اپنی کتاب میں بہت محبت و ادب سے کرتے ہیں۔ حریف ظریف ہشاش بشاش وجیہ اور خوش رو آدمی تھے۔ ان کے دوستوں میں شرف الدین میر ٹھی اور مرزا غالب بھی تھے اور آخر الذکر نے فسانۂ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے آنے کا اتفاق مجبوراً مجھ کو

جو کانپور میں ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوچ و لچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزیں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا۔ کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا کہ جنوں ہو جائے۔ تیرہ بختی روز سیاہ پیش لائے۔" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہیں کانپور میں حکیم سید اسد علی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے ایک دن ان سے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں۔ سُن کر فرمایا۔ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ اُس وقت یہ کلمہ توسن طبع پر تازیانہ ہوا۔ یعنی باعث تصنیف کتاب بن گیا۔ پھر اسی کے آگے ایک طنزیہ طور پر لکھتے ہیں کہ میں ہیچمیرز ہوں مجھ کو زبان کا دعویٰ نہیں۔ اگر شاہجہان آباد کا رہنے والا ہوتا تو زباندانی کا دعویٰ کرتا۔ جیسا کہ میرامّن نے کیا ہے۔ جس کی نسبت یوں گلفشانی کرتے ہیں "اگر وہاں (شاہجہان آباد میں) چندے بود و باش کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا کہ میرامّن نے چار درویش میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصہ میں یہ بات آئی ہے دلی کے روڑے ہیں۔ محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے بشر کو دعوے کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید[1]"

مختصر یہ کہ کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے شروع میں چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مدح و ثنا میں شاید اس غرض سے لکھی ہیں کہ ان کا قصور معاف کیا جائے۔ اور لکھنؤ آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ جن کی تعریف میں سرور نے لکھنؤ کے حالات کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور آخر میں ایک دعائیہ غزل بھی ان کی شان میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہیں ؎

[1] اس سخت تنقید کا جواب خواجہ فخر الدین حسین صاحب سخن دہلوی مرحوم نے سروش سخن میں نہایت دنداں شکن اور معقول دیا ہے (دیکھو دیباچہ سروش سخن)

یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

ان کی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جامِ جم پر تف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

جن و انس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں
ہے سلیماں ان دنوں فرمانروائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تا بہ دَورِ مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں یہ دعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشکِ ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

سرور کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی مگر بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے۔ جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۴۶ء میں سرور کی بیوی کا انتقال ہوا۔ اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے درباری شعرا میں بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے۔ اور انھوں نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت ظلِ سبحانی کی تعریف میں معرفت قطب الدولہ مصاحب شاہی پیش کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کے حکم سے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ موسوم بہ سرورِ سلطانی کیا اور ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۱ء کے اثنا میں اکثر چھوٹے چھوٹے قصے تصنیف کئے جن میں سے ایک "شررِ عشق" ہے۔ جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں "شگوفۂ محبت" امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش سے تحریر ہوا۔ انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء کی وجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہو گئے تھے کچھ دنوں سید قربان علی سررشتہ دار کارینگی صاحب اور منشی شیو پرشاد ملازم کمسریٹ نے ان کی اعانت کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس ذریعہ کو بھی منقطع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والی بنارس کی طلبی پر سرور ۱۸۵۹ء میں بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہاں ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر و مدارت کی۔ بنارس میں انھوں نے "گلزارِ سرور"، "شبستانِ سرور" اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ بنارس کی طرح سرور کو مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اپنی ریاستوں میں طلب کیا تھا اور آخر الذکر نے ایک جوڑی طلائی کڑوں کی ان کو مرحمت فرمائی تھی۔ سرور کے ایک خط سے جو ان کی انشائے سرور میں چھپ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی۔ لکھنؤ۔ میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اس وجہ سے کہ اس خط میں انھوں نے اپنے سفر کی تکلیفوں کا حال مشرح طور پر لکھا ہے۔ انشائے مذکور میں جو خطوط درج ہیں وہ ان کے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر ایک الزام قتل بھی لگایا گیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے

علاج کے لئے کلکتہ گئے تھے اور واجد علی شاہ سے بھی ملے۔ تھے جو اس وقت مٹیا برج
میں نظر بند تھے۔ مگر سرور وہاں سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی آنکھوں کا علاج لکھنو میں
ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا۔ اس کے بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء مطابق
۱۲۸۴ھ میں (یعنی غالب سے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔

فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ اس کا
قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کے مضمون و واقعات میں کوئی جدت نہیں اور
عبارت اسی زمانے کی مروّجہ فارسی کی تقلید میں پُر تکلّف و تصنّع و مُقفّٰی اور مسجّع ہے
یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جس میں طلسم سحر دیووں سے لڑائی جادوگروں سے مقابلے سفر
کے عجائب و غرائب بکثرت ہیں۔ یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے مگر سن رسیدہ
لوگ نفس قِصّہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ البتہ اس کی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر
پسند کرتے ہیں۔ اس کی عبارت پُر تکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے
بعض فقرات ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دلچسپ اور ادبی مُرصّع کاری کا بہترین نمونہ
ہیں۔ اس کتاب کو زمانۂ حال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اس
وجہ سے کہ مصنف اگلے زمانے کے لوگوں میں ہیں۔ قِصّہ بھی پرانے رنگ کا ہے اور طرز
عبارت اس زمانہ کا ہے جب فارسی عام طریقے سے رائج تھی۔ اردو کے خطوط تک میں
تصنع اور تکلف شامل تھا اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت
پر محمول کرتے تھے ان قیود پر نظر کرتے ہوئے ہم کو ان لوگوں کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیئے
جنہوں نے قدیم فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ مثلاً مرزا غالب اور سرسید
وغیرہ جس طرح نظم اردو کی ابتدا مرثیوں غزلوں اور مثنویوں سے ہوئی۔ اسی طرح فرضی
قِصّوں اور افسانوں پر نثر اردو کی بنیاد رکھی گئی اور جس طرح اصناف نظم مذکورہ تدریجی
ترقی کرتی ہوئی اس درجے کو پہونچیں۔ اسی طرح نثر اردو بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے
زمانۂ حال کی سلیس اور متین سادہ روش پہ آگئی ہے۔ فسانۂ عجائب کا دیباچہ اس لئے
اور بھی دلچسپ ہے کہ اس میں اس زمانے کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی وہاں کی طرز معاشرت
امرا و رؤسا کی وضعداریوں ان کے پُر تکلف جلسوں۔ شہر کے رسوم و رواج کھیل تماشوں
دلچسپ مناظر مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات۔ بازاروں کی چہل پہل۔ سودا فروشوں
کی آوازوں وغیرہ وغیرہ کی۔ دلکش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو
سرشار کی مُرقّع نگاری سے علیحدہ سمجھنا چاہیئے۔ اس وجہ سے کہ سرشار کے یہاں کیرکٹر اور مختلف

سوسائیٹیوں کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہیں۔ ان میں تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے اور اپنے ظریفانہ طرز بیان سے اس میں ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کر دی ہے برعکس اس کے سرور کے یہاں سوسائٹی کے مرقعے یا کیرکٹر نگاری کے کرشمے نہیں ہیں نیز یہ کہ سرور اپنے سلسلۂ بیان میں ان چیزوں پر جن کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں صرف ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت ایک ناولسٹ کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی سرور کو چنداں ضرورت نہیں اس موقع پر پنڈت کشن پرشاد کول کے وہ فاضلانہ خیالات سننے کے قابل ہیں جو فسانہ عجائب کو پڑھ کر انھوں نے انگریزی میں قلمبند فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرشار کے بہ نسبت سرور کے یہاں لکھنؤ کا بیان بہت زیادہ مکمل۔ بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے۔ صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوائی کی دکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تنبولیوں کے یہاں کی گلوریاں دیکھ کر ہمارا جی للچاتا ہے۔ بالائی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشایر کی کریم (بالائی) کوئی چیز نہیں۔ پیس فروش جوہری بنئے بقال۔ کبڑیے سب چوکھا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسری بازاریں اور سیرگاہیں (جو اب باقی نہیں رہیں) ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ ان بلند عمارتوں اور کمروں پر بھی جاتی ہے جہاں سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں۔ ہم چوک میں ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خموشاں ایک سونی بستی معلوم ہوتا ہے۔ راہ گیر اور دکاندار سب سو رہے ہیں۔ ہم مجمع میں چلتے ہیں۔ مگر کھوے سے کھوا ہاں نہیں چھلتا۔ کبڑے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں تنبولنیں کرشمہ و ناز میں مصروف ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔ کبڑیے بہرے ہیں۔ بساطی بدست۔ حلوائی اونگھ رہے ہیں۔ چلو ان کی مٹھائیاں جیبوں میں بھر کر لے چلیں۔ زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ مشہور مشہور گویّے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مگر ان کا گانا سننے میں نہیں آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی۔ پہلوان۔ بادشاہ وزیر سب سامنے سے فانوسی تصویروں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ سب خاموش۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہیں لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خموشاں ہے جس کا نقشہ ٹینیسن نے اپنی مشہور نظم ''ڈے ڈریم'' (خواب روز) میں کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"کہیں بٹلر (خانساماں) اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں شراب کی بوتل دبائے بیٹھا ہے جو آدھی رہ گئی ہے۔ اور کہیں بڈھا سٹوورڈ (باورچی) اپنے کام میں مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نو عمر خادم (ٹدبیج) نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ کچھ کہنے کے لئے اپنا منہ کھولا چاہتی ہے۔ بیچ بوسہ کے واسطے منہ پکاتا ہے۔ اور شرم کی سرخی میڈ کے رخساروں پر دوڑ جاتی ہے۔"

اس زمانے میں مقفیٰ مسجّع عبارت اس درجہ مقبول اور مروّج تھی کہ اس سے احتراز مشکل تھا۔ اسی وجہ سے فسانۂ عجائب کی عبارت سلیس اور بول چال روزمرّہ میں شمار نہیں کی جاسکتی برعکس اس کے اس میں تعقید و تکلف بحد ہے اور سرور کی کھینچی ہوئی تصویریں جیسا کہ پنڈت برج نرائن درنے اوپر بیان کیا ہے۔ اشخاص قصہ کے صحیح خط و خال نہیں دکھاتیں بلکہ وہ محض ان اشخاص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی ہیں قوافی کی پابندی کی وجہ سے سلسلۂ بیان کی روانی اور سلاست میں فرق پڑجاتا ہے اور اکثر جگہ پڑھنے والا الفاظ کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ سرور نے اپنے جذبۂ وطنی کے جوش میں میر امن بلکہ دلّی والوں پر اکثر چوٹیں کی ہیں۔ جس کا ذکر اوپر ہوا۔ قصے میں کیرکٹر نویسی کم ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ملکۂ مہر نگار کے کیرکٹر میں سچی محبت "باوفائی"۔ دلیری۔ معاملہ فہمی۔ جرأت، اور متانت و بردباری کو نہایت واضح طریقے سے دکھایا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضمناً بعض قصے ایسے بھی بیان کئے ہیں جن کے ہیرو انگریز ہیں۔ مثلاً پسر مجسٹن کا قصہ جس کے ذیل میں کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہیں جو شاید اس سے پیشتر نثر اردو میں شاذ و نادر استعمال ہوئے ہوں۔ دنیا کی بے ثباتی کا سبق جو بندر کی تقریر سے ملتا ہے اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتیں نہایت مؤثر اور دلکش ہیں۔ اس کتاب کے جواب میں دو قصے اور بھی لکھے گئے۔ ایک "سروش سخن" مؤلفہ خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی جو ۱۸۶۰ء میں تحریر ہوا۔ اور جس میں سرور پر بہت سی چوٹیں کی گئی ہیں اور دلّی والوں کی تعریف میں ہیں۔ دوسرا "طلسم حیرت" مؤلفہ محمد جعفر علی شیون لکھنوی جو ۱۸۶۲ء میں تصنیف ہوا۔ جس میں سرور بلکہ اہل لکھنؤ کی طرف سے "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب دیا گیا ہے۔

سرور کی دیگر تصانیف | (۱) ۱۸۴۷ء میں سرور سلطانی ترجمہ "شمشیر خانی" جو شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے۔ اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانۂ عجائب کے مقفیٰ اور مسجّع ہے جو تاریخ کے لئے مناسب نہیں۔ اس میں ایک مقام پر جذبۂ وطنیت کے جوش میں ہندوستان

کی بہت تعریف کی ہے جو قابل دید ہے۔

۲- ۱۸۵۱ء میں "شرر عشق" جس میں بھوپال کے جنگلوں کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سارس کا جوڑا جس کی محبت مشہور ہے۔ ایک جنگل میں پھر رہا تھا کہ نر کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیاں جمع کیں اور اس کے اوپر نہایت باقاعدہ طریقے پر ستی ہو گئی وغیرہ۔

۳- اسی سال "شگوفہ محبت" بھی لکھا گیا۔ جس میں مہر چند کھتری کا پرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ کا بھی اس میں ذکر ہے۔

۴- "گلزار سرور" جو ایک فارسی کتاب حدایق العشاق کا ترجمہ ہے۔ جس میں ایک افسانہ کی صورت میں سلوک اور عشق کا مجادلہ دکھایا گیا ہے یہ ایک مذہبی مضمون ہے جس کو مصنف نے اپنی خاص رنگین عبارت میں لکھا ہے۔ اسی پر مرزا غالب نے ایک دلچسپ تقریظ اسی رنگ یعنی مقفیٰ عبارت میں لکھی ہے۔

۵- "شبستان سرور[1]" یعنی الف لیلہ کے چند قصوں کا دلچسپ ترجمہ جس میں جا بجا چیدہ چیدہ اشعار داخل کر کے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

الف لیلیٰ کے ترجمے الف لیلہ کے قصے ہندوستان میں ہمیشہ سے مقبول رہے اور ان کا ترجمہ اکثر لوگوں نے کیا ہے۔ منشی شمس الدین احمد نے ۱۸۳۶ء میں مدراس سے ایک ترجمہ نکالا۔ جس کا نام "حکایات الجلیلہ" ہے۔ اس میں صرف دو سو راتوں کی حکایات ہیں اور مدراس کالج کے طلباء کے واسطے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ دوسرا ترجمہ منشی عبدالکریم نے ۱۸۴۲ء[2] میں فارسٹر صاحب کی انگریزی الف لیلہ سے کیا۔ جس کی زبان اس قدر صاف اور سہل ہے کہ ادبی ذوق کے لوگ اس کو معیار سے گرا ہوا

---

[1] شبستان سرور کے نام سے یہ ترجمہ ۱۲۷۹ھ میں ہوا اور اسی سنہ میں مطبع نجم العلوم لکھنؤ سے شائع ہوا۔ (مرتب)

[2] یہ ترجمہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں ہوا۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں مجموعی طور پر ۹۴ قصے ہیں اور دو سو راتیں ہیں۔ (مرتب)

الف لیلیٰ کا ایک اور عربی ترجمہ دس جلدوں میں حیدر علی فیض آبادی نے ۱۸۴۰ء میں کیا۔ اس ترجمہ کی صرف ایک جلد انجمن ترقی اردو ہند کے کتب میں ہے۔ مزید جلدوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پہلی جلد ۱۲۶۳ھ میں شائع ہوئی۔ (مرتب)

سمجھتے ہیں۔ پھر ایک منظوم ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمائش سے ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں چار حصوں میں نسیم دہلوی منشی طوطا رام شایاں اور منشی شادی لال چمن نے کیا[۲]۔ جس کا ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام شایاں نے ۱۸۶۸ء میں نکالا۔ اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا اور مرزا حیرت دہلوی نے ۱۸۹۲ء میں "شبستان حیرت" کے نام سے بطرز ناول ترجمہ کیا۔ (۶) شاہزادۂ ایڈورڈ (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم ہوئے) کی شادی کے موقع پر سرور نے ایک تہنیت نامہ موسوم بہ "نثر نثرہ نثار" لکھا۔ جس میں انگریزی حکومت کے فوائد اور برکات نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کئے ہیں (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انہیں کے خاص طرز میں ہیں۔

اردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم طرز کے اردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنے طرز خاص میں وہ عدیم المثال ہیں۔ مگر بعد کو جب زمانے کا رنگ بدلا اور کاروباری دور شروع ہوا تو اس قسم کی پر تکلف اور پر تصنع عبارت جس کے طویل جملوں اور ثقیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگوں کا جی اکتا گیا تھا۔ اور موجودہ ضرورتوں کے اظہار کے لئے بھی ناموزوں تھی۔ ترک کی گئی۔ بہر طور سرور نے اپنا رنگ خوب برتا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے۔ ان کی تمام تصنیفات میں لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی سوسائٹی کے مرقعے خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں۔ نثر میں ان کو اتنا شغف تھا اور اس میں وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے دیگر کمالات یعنی ان کی خوشنویسی ان کی موسیقی دانی یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی اس کے سامنے فروغ نہ پا سکی۔ ان کا دیوان مفقود ہے مگر ان اشعار سے جو ان کی نثر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ضرور اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ سرور گو کہ لکھنؤ کے عاشقوں میں ہیں اور لکھنؤ ہی میں رہے مگر پھر بھی ان کے اشعار سے دلی کا اتباع معلوم ہوتا

۱؎ الف لیلیٰ کا عربی سے ایک اور ترجمہ ۱۸۴۴ء میں دلی کالج کے مترجمین نے کیا۔ اس میں حکایات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ میں جلد اول کے گیارہ صفحے مولوی جعفر علی اور باقی مع جلد دوئم اور چہارم محمد حسن علی خان اور جلد سوئم کا ترجمہ مولوی سدید الدین خان نے کیا ہے۔ یہ کیفیت کتاب کے مطبوعہ نسخہ پر موجود ہے۔ جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ (مرتب)

۲؎ ان جلدوں میں کہانیوں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ پہلی ڈھائی سو راتیں نسیم دہلوی پانچ سو راتیں شایاں اور آخری ڈھائی سو راتوں کو چمن نے نظم کیا۔ (مرتب)

ہے۔ کیونکہ لکھنؤ کے تصنع اور مبالغہ سے وہ بری ہیں۔

غالب بحیثیت نثار عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے روشناس ہیں ان کی نثاری کی حیثیت عام نظروں سے پوشیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو دونوں کے بے مثل نثار بھی اسی طرح ہیں جس طرح کہ بے نظیر و بے عدیل شاعر ہیں۔ ان کی نثر اردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی تیغ تیز اور نامہ غالب[1] جو سب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے گئے۔ اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب میں ان کے وہ خطوط جو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے نام سے مشہور ہیں اور نیز وہ تقریظیں جو چند کتابوں پر لکھی ہیں نثر اردو کا بہترین نمونہ اور ان کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔

اردوئے معلےٰ اور عود ہندی[2] ۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ جیسا کہ ان خطوط سے پایا جاتا ہے جو پنج آہنگ میں چھپتے ہیں اور نیز بعض جگہ خطوط اردو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو میں خطوط لکھنا شروع کئے۔ ان کا رنگ بالکل مخصوص ہے اور انہیں پر نثر اردو کی ایک خاص طرز کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر جہاں تک خیال ہے کوئی شخص ان کی پوری تقلید اور نقل میں کامیاب نہیں ہوا۔ یوں تو بہت سی انشا اور رقعات کی کتابیں موجود ہیں۔ اکثر مشہور لوگوں کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے علیحدہ ہے۔ اس میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع خشونت اور خشکی مطلق نہیں۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور

---

[1] نامہ غالب کو آب حیات میں مرزا کی تصانیف فارسی میں رکھا ہے۔

[2] غالب کے اردو خطوط کے مجموعے اور ان کے سنین اشاعت:-

عود ہندی۔ اشاعت اول مطبع مجتبائی میرٹھ اکتوبر ۱۸۶۸ء

اردوئے معلیٰ۔ اشاعت اول مارچ ۱۸۶۹ء

مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی رام پور ۱۹۳۷ء

نادرات غالب۔ مرتبہ آفاق حسین دہلوی کراچی ۱۹۴۹ء

خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، الہ آباد ۱۹۴۱ء

(اس مجموعہ میں عود ہندی، اردوئے معلیٰ اور مکاتیب غالب کے خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں)
(مرتب)

مضامین کی کثرت پتہ دیتی ہے کہ ایک دریائے مضامین اُمڈا چلا آتا ہے ۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہر چند عبارت حد درجے کی بے تکلف اور روزمرہ ہے مگر ابتذال اور سوقیت اس میں مطلق نہیں ۔ بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہے ۔ بطون ہر فقرے سے عیاں اور ظرافت ہر جملے کی تہ میں پنہاں ہے ۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب الیہ موافق نہ بھی ہو اس جسارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہیں جیسے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی تحریر کا زور اور ان کا انداز بیان اس کی زبان بند کر دے گا ۔ بلکہ اس کو اُن کے دام محبت میں اسیر کر دے گا ۔ ان کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے اور بعض خطوط انہوں نے فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں ۔ کسی میں مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیا ہے ۔ جس سے معلوم مکتوب الیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے ۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہیں کہ دل مزے اٹھانے لگتا ہے ۔ مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہے کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جو عموماً خطوط میں لکھی جاتی ہیں مگر درحقیقت فضول اور بیکار ہیں ۔ سب چھوڑ دیں ۔ وہ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ " خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں ۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ اور شکرہ و شادی و غم کا قدیم ردّیہ میں نے بالکل اٹھا دیا " مثلاً یہاں چند نمونے اسی شان کے لکھے جاتے ہیں " اہا ہا میرا پیارا مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے ۔ بیٹھو یہ رام پور ہے دارالسرور ہے ۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے " " آؤ میاں سید زادہ آزادہ دلّی کے عاشق دلدادہ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے سے لکھنؤ کو برا کہنے والے ...."

" برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعا حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا تپ کو کیوں چڑھنے دیا ۔ کیا بچارہ میرن صاحب کی صورت بن آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے .... " " میری جان تو کیا کہہ رہا ہے ۔ بنیئے سے سیانا سو دیوانا صبر و تسلیم توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے ۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا " " سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لینا ۔

یہاں ہم مرزا کا ایک خط جو میر مہدی کے نام ہے بتمام و کمال نقل کرتے ہیں تاکہ مرزا کی وہ تمام خصوصیات تحریر جن سے ان کی نثر بھی مثل نظم کے معجزہ نما معلوم ہوتی ہے

بخوبی سمجھ میں آسکیں مثلاً خط سے القاب و آداب کا بالکل غائب ہونا اور بجائے اس کے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کر دیا جانا۔ عبارت کی سادگی شوخی اور بے تکلفی مذاق کے پیرایہ میں کچھ دوستانہ نصیحتیں بھی کرنا۔ جدید رنگ زمانہ یعنی جمہوریت پسندی کے برخلاف پرائیویٹ خط میں بھی "ملکۂ انگلستان" کے پہلے لفظ "جناب" لکھنا جس سے ان کی حد درجے کی قدامت پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی چند سطور کو جن سے خط شروع ہوتا ہے ہم مکالمے کی صورت میں لکھے دیتے ہیں۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھنا چاہیئے۔

خط بنام میر مہدی

غ ۔ اے جناب میرن صاحب السلام علیکم۔

م ۔ حضرت آداب۔

غ ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔

م ۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

غ ۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہو گا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

م ۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

غ ۔ میاں آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

م ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اے وحضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

غ ۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔

م ۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق

سے یکھیئے گا۔

غ ۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو تمہارے جانے سے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں میں آگیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا۔

(اس کے بعد مسلسل خط شروع ہوتا ہے)

لاحول ولا قوۃ سنو میر مہدی صاحب میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو تپ تو رفع ہو گئی۔ پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرد۔ یہ جدی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمہارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔ حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں کیا جانوں حکیم میر اشرف میں اور ان میں کچھ گو تسل ہو تو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی۔ اور یہ بھی معلوم کر بھیجو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ دفتر را گاؤ خورد اس کے معنے کیا ہیں۔ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں سر نامہ لکھ کر چھوڑ دوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میرا سرفراز حسین کو دعا پہونچے۔ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماؑ اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے ہیں یا نہیں۔ میر نصیر الدین کو دعا۔

اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک نہایت عمدہ جدت کی مثال قائم ہو گئی۔ جس سے اردو خطوط نویسی پرانے "تکلف و تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ بن گئی۔ ہر چند کہ یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اور وقت گزرتا گیا اب لوگوں کو اس کی اہمیت کا ضرور احساس ہوا اور ہر طرف اس کے متبعین پیدا ہو گئے۔ مولانا حالی۔ سرسید۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے علاوہ دیگر ارباب قلم مثلاً امیر مینائی۔ اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثریں لکھیں مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی شوخی و ظرافت جذبات نگاری و اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مدمقابل نہ ہوے گا۔

ان کے رقعات کی ایک بین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے حالات زندگی کے

مصفّیٰ اور مجلّیٰ آئینہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ ان کے خطوط کو تاریخ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور اُن کے وہ حصّے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہیں۔ علیحدہ کرتا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ سوانح عمری ان سے مرتب ہو جائے گی۔ یہ خطوط ان کی زندگی اور جزئیات زندگی کی تصویریں ہیں ۔ان سے حیات، احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق ان کے نظریئے اور ہمعصر اور قدیم شعرا کے متعلق ان کے خیالات سب بخوبی اخذ کیئے جا سکتے ہیں۔ بعض کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوب الیہ کے دل کو خوش کرنا اور اُس کا غم غلط کرنا ہے ۔ ان کا مذاق ظرافت بھی سب سے نرالا ہے۔ اُردو نظم میں تو اس کا جواب ہی نہیں۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہے۔ فرینچ شاعر والٹیر اور انگریزی نثار ڈین سویفٹ اپنے اپنے طرز میں ایک خاص رنگ ظرافت رکھتے ہیں۔ مگر مرزا اُن سب سے علیحدہ ہیں والٹیر کی طرح ان میں نقالی اور سویفٹ کی طرح ان میں تیزی اور دل آزاری نہیں ہے ۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیسن میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے۔ مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نثر اُردو کو خشکی اور بد مزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفّیٰ اور مسجع عبارت مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ تھے۔ مگر رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اُسی پرانے انداز میں لکھتے تھے۔ اس کی وجہ مولانا حالی کی زبان سے سننا چاہیئے وہ کہتے ہیں "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیئے ۔جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرنے والے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے ۔جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔" یہاں ان کی دو تقریظوں کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ میں بھی ان کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔

(۱) مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ۔ "سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فروز صنعتیں ہیں۔ تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ یہ جو "حدائق العشاق" کا فارسی زبان سے عبارت اُردو میں نگارش پاتا ہے ارم کا بین دنیا سے اُٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جاتا ہے ۔وہاں حضرت رضوان ارم کے نخلبند و آبیار ہوئے یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ ہیچمیرز جو موسوم بہ اسد اللہ خان اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔

ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرِ دفتر سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایا ہے۔ اور اس بزرگوار کا کلام شاہدِ معنی کے واسطے کیا گراں بہا پیرایہ ہے۔ مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا یہ وہ تحریر ہے ...."

۲۔ مفتی میر لعل کی کتاب "سراج المعرفت" کی تقریظ "حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نمونہ دہم پر پیچیدہ سربستہ ہے۔ کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہے لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی خامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں (۱) آثاری (۲) افعالی (۳) صفاتی (۴) ذاتی انبیائے پیشیں صلوات اللہ نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمد کا سینہ ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے ......"

کتب و رسائل اسلامی سے اردو کو تقویت ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی تھی مگر اس سے بلاشبہ نثر اردو کو بہت فائدہ پہونچا اور اس کی تقویت کا باعث ہوئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی اور اُن کے بزرگ استادوں یعنی مشہور و معروف شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے زمانے میں اشاعت مذہب وہابیت کی صورت میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے۔ یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا اور گو اصل تحریک جو مولوی صاحب موصوف نے اٹھائی تھی ان کی وفات کے بعد امتداد زمانہ سے دب گئی تھی مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خان کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی دبی روح رواں تھی[1]۔

---

[1] مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ جو تحریک مذہبی بصورت اشاعت وہابیت مولوی سید احمد شہید کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جو ترمیمیں اور تاویلیں مذہب میں سر سید مرحوم نے پیش کیں یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہابیوں کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر بلا کسی توجیہ اور تاویل کے عمل واجب ہے اور سر سید مرحوم اپنے معتقدات اور اصولوں کے ثابت کرنے میں دلائل عقلی اور تاویلات سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد وہابیہ کے بالکل منافی ہے (مترجم)

سید صاحب اور ان کے رفقائے کار کے جدید اصولوں کی اشاعت نے گو ملک میں اس وقت بہت بے چینی اور مخالفت پیدا کر دی تھی اور اختلافات کی آندھی سے ملک کی فضا گرد آلود ہو گئی تھی مگر جس قدر کتب اور رسائل ان مسائل کی موافقت و مخالفت میں لکھے گئے ہر چند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سب صاف اور سلیس زبان میں ہوتے تھے اس وجہ سے زبان کو ان سے یقیناً بہت کچھ تقویت اور مدد پہونچی۔

مولوی سید احمد شہید ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر صاحب ایسے بزرگوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جنہوں نے بعد کو توہبت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے۔ لہذا ان کی تقریریں اور واعظ سن سن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اپنے اصول کی تبلیغ پہلے دتی میں مکمل کر کے ۱۸۲۰ء میں کلکتہ گئے اور وہاں سے ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ کی نیت سے مکے روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کر کے قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور چھ برس تک ٹرکی کی سیر و سیاحت اور نیز اپنے ہم خیالوں کی جماعت پیدا کرتے رہے۔ جب دلی واپس آئے اور یہاں کے مسلمانوں کے عقائد کا دیگر ممالک کے لوگوں سے مقابلہ کیا تو نسبتاً زمین و آسمان کا فرق پایا۔ اور اسی سے ان کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ آدمی پر جوش تھے۔ لہذا اشاعت دین کے متعلق ان کے جوش کی کوئی انتہا باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے سکھوں سے انہوں نے جہاد کا اعلان کیا اور ۱۸۲۶ء میں مولوی اسماعیل کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی اور اکثر امرار اور مشاہیر نے جو ان کے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام کے واسطے کافی روپیہ سے ان کی مدد کی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے اس مشن میں ان کو اتنی کامیابی ہو گئی تھی کہ پورا پشاور ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ لیکن بعد کو ان کے اصولوں کی سختی دیکھ کر افغانوں نے جنہوں نے ان کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا ان سے بیوفائی کی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ دریائے اٹک کے اس پار پہاڑوں میں جا چھپے جہاں ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ایک دستہ سے جس کا سردار شیر سنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر موسوم بہ تفسیر عزیزی فارسی میں لکھی جس کا اب ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا جو ۱۸۰۳ء میں ختم ہوا اور ایک شخص سید عبداللہ نامی نے جو مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تنبیہ الغافلین جو اصل میں زبان فارسی میں تھی اس کا بھی اردو

ترجمہ انہیں مولوی عبداللہ نے ۱۸۲۳ء میں ہبگلی سے شائع کیا۔ مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف۔ مثلاً ترغیب جہاد۔ ہدایۃ المومنین نصیحۃ المومنین۔ موضح الکبائر والبدعات۔ مائۃ مسائل وغیرہ یہ سب اسی زمانے کی کتابیں ہیں جو اصل میں اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔ مگر جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہونچی۔

چھاپہ کی ابتدا۔ منجملہ اور اسباب کے چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان میں بہت بڑی مدد دی اور قدیم حالت میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھل گیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے اہتمام میں چھپ کر تیار ہوتی تھیں[۱]۔ مگر ان کی تیاری میں اس قدر روپیہ خرچ ہوتا تھا کہ آخر کار یہ مطبع بند کر دینا پڑا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابیں بھی یہاں نہ چھپ سکیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جو ٹائپ کے حروف مروج تھے وہ بھی نہایت بدنما اور بھدے تھے۔ اسی زمانے میں سیرام پور واقعہ بنگال کے پادریوں نے بھی ایک چھاپہ خانہ کھولا تھا۔ جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۸۱۲ء میں اس چھاپہ خانہ میں آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل کر خاک ہوگئیں ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دلی میں قائم ہوا۔ جس نے اشاعت کتب کو بہت آسان کر دیا۔ اس میں پرانی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا اور کتابیں اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور تکلف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا تھا[۲]۔ جس میں سب سے پہلے ہفت قلزم چھپی تھی دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں:-

مناقب الحیدریہ بزبان عربی ۱۸۱۹ء میں۔
محامد حیدری فارسی میں ۱۸۲۲ء میں۔

(یہ دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی تعریف میں ہیں) گلدستۂ محبت جس میں

---

[۱] اس چھاپہ خانہ کا نام ہندوستانی پریس تھا اور ۱۸۰۱ء یا ۱۸۰۲ء میں قائم ہوا تھا (ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں صد ۲)، گل کرسٹ اس پریس کے بانی تھے۔ (مرتب)

[۲] غازی الدین حیدر نے یہ مطبع موتی محل کے اندر ۱۸۱۹ء یا اس سے قبل قائم کیا تھا۔ اس مطبع کا نام "چھاپہ خانہ دار السلطنت لکھنؤ" تھا۔ (مرتب)

نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال فارسی میں ہے پنجسورہ بخط طغرا۔ تاج اللغات جو ایک عربی کی لغت زبان فارسی میں ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنہوں نے ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا۔ ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی وہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جس کو لارڈ بروہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا۔ اس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسینی لکھنوی نے سکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرمائش سے کیا اور مطبع سلطانی میں ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو لکھنؤ میں لیتھو میں چھپی شرح الفیہ تھی۔ ۱۸۴۸ء میں تقریباً بارہ چھاپہ خانے لیتھو کے لکھنؤ میں موجود تھے۔ جن میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور رہیں۔ ۱۸۴۹ء میں منشی کمال الدین حیدر مذکور نے جو رصد خانہ شاہی

۱؎ سکسینہ نے یہ تمام معلومات اشپرنگر کی فہرست کتب خانہ شاہان اودھ سے اخذ کی ہیں۔ اشپرنگر نے آرچر کے مطبع کا قیام ۱۸۳۰ء قطعی طور پر نہیں لکھا ہے بلکہ آرچر کے مطبع کا قیام ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ لکھا ہے۔ (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ دیباچہ صفحہ ۴ کلکتہ ۱۸۵۴ء) (مرتب)

۲؎ یہ بیان بھی اشپرنگر سے ماخوذ ہے۔ اشپرنگر نے یہ نہیں لکھا کہ ۱۸۴۸ء میں تقریباً بارہ مطبع تھے وہ لکھتے ہیں کہ جب میں لکھنؤ میں تھا تو وہاں بارہ مطبع تھے۔ لکھنؤ میں ان کا قیام ۳ مارچ ۱۸۴۸ء سے یکم جنوری ۱۸۵۰ء تک رہا۔ اس طرح یہ مطابع اسی مدت کے دوران موجود ہونگے (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ صفحہ ۱۳ ۔ مرتب)

۳؎ مطبع مصطفائی ۱۸۴۴ء کے لگ بھگ قائم ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں لکھنؤ میں کام کر رہا تھا۔ اسی برس مطبع لکھنؤ سے دلی منتقل کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں کانپور میں بھی کام کر رہا تھا۔ صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ء۔ ۱۸۵۳ء) کی رپورٹ میں مطبع کے مالک مصطفےٰ خان کی کارکردگی کی تعریف کی گئی ہے۔ ۱۸۵۱ء کی رپورٹ میں لکھا ہے "مصطفےٰ خان مطبع مصطفائی کے مالک ہیں اور عبد الرحمٰن مہتمم ہیں۔ معیاری کتابوں کی اشاعت اور طباعت کی نفاست کا امتیاز جو اس مطبع کو لکھنؤ میں حاصل تھا وہ یہاں بھی بدستور قائم ہے" (صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات صفحہ ۲۰۲) ۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں لکھا ہے "مطبوعات کی جو فہرست مطبع نے ارسال کی ہے وہ گذشتہ سال ہی کی طرح طویل ہے۔ طباعت کی نفاست کے ساتھ ساتھ قیمت کی ارزانی کی وجہ سے اس مطبع کی کتابوں کی فوری نکاسی ہوتی ہے۔ مالک مطبع اپنے ایجنٹوں کو کتابیں دے کر بڑے بڑے شہروں میں فروخت کے لئے بھیجتا ہے" (صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات صفحہ ۲۰۲) ۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں کارکردگی کے متعلق لکھا ہے کہ کتابوں کی نکاسی کے لئے جگہ جگہ ایجنسیاں قائم ہیں۔ لاتعداد حلقوں میں اس مطبع کی کتابوں

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کے میر منشی تھے۔ بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ لکھنا شروع کی مگر کچھ باتیں بادشاہ کو پسند نہ آئیں جس کی وجہ سے رصد خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت بھی روک دی گئی۔ اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے۔ مطابع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ اس عہد کا یہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نولکشور صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جس کی بدولت پرانی پرانی فارسی و عربی و نیز سنسکرت و ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھیں اور اگر شائع نہ ہوتیں تو معدوم ہو جاتیں۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہونچائے۔ تعلیم و تعلم کی ارزانی ہو گئی۔ اس میں حدیث و تفسیر، قرآن شریف با ترجمہ فقہ اصول وغیرہ جملہ علوم اہل اسلام و نیز وید پران بیدک وغیرہ علوم اہل ہنود یکساں طور پر نہایت فراخدلی سے شائع کیے گئے۔ قرآن شریف کے مترجم چھپنے سے لوگوں کو اس کے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے وہی فائدہ مسلمانوں کو ہوا جو بائیبل کے ترجمے سے مسیحیوں کو پہونچا تھا۔

رسائل و جرائد و اخبارات طباعت کی آسانیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسائل و جرائد اور اخبارات زبان اردو میں بکثرت جاری ہوئے جس سے پبلک کے معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور ان کو دنیا بھر کی خبریں بے تکلف معلوم ہونے لگیں۔ ہندوستانی اخبارات سے جو لکھنؤ میں چھپنے لگے پبلک کے لئے تمدنی و اقتصادی معلومات کا ایک دروازہ کھل گیا اور ترقیوں کی راہیں فراخ ہو گئیں اور مضمون نویسوں کو علاوہ توسیع زبان کے یہ موقع بھی ملا کہ وہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈھالیں۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اردو سرکاری زبان قرار پائی جس سے اس کا نہ صرف مرتبہ بڑھا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو اب تک اس زبان میں رائج تھے اردو زبان میں منتقل ہو گئے اور رواج پا گئے۔ مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو طرح طرح کے فوائد سے مالا مال کیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید میں جو عبارت اور لفظوں پر زور دیا جاتا تھا وہ طریقہ متروک ہو کر زبان صاف اور سادہ ہوئی اور بجائے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پر زور دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں جو تعلیمی ضرورت سے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی

(بقیہ حاشیہ) ۔ کی کھپت ہوتی ہے (ایضاً صفحہ ۱۹۶) مطبع مصطفائی نے ۱۸۵۰ء میں بارہ[12]، ۱۸۵۱ء میں بیس[20]، ۱۸۵۲ء میں بائیس[22] اور ۱۸۵۲ء میں سولہ[16] کتابیں شائع کیں۔ (مرتب)

گئیں۔ ان کا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے پیچیدہ عبارت میں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا صاف اور سلیس عبارت میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ کلکتہ اور لاہور میں جو انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے گئے وہ سب اسی قبیل کے تھے اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس اصطلاح کو سرسید ایسے قابل بزرگ کے مساعی جمیلہ نے بہت تقویت پہونچائی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی ایک بزرگ ہستی اور مسلمانوں کے ایک رہبر اور مصلح اعظم تھے۔ جن کا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء

جواد الدولہ عارف جنگ سرسید احمد خان بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ہندوستان کے مشہور ریفارمر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف ریفارمر اور مدبر تھے۔

اُن کی قابلیت ان کی ہر دلعزیزی اور ان کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل قابل اہل علم و فضل ان کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کے ادبی کارناموں سے نہ صرف ادب اُردو مالامال ہوا۔ بلکہ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پر ان کی مساعی جمیلہ کا بہت گہرا اثر پڑا۔ چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبوں اور مشاغل پر منقسم ہے لہٰذا ان سب سے قطع نظر کر کے ہم یہاں ان کا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

سرسید مرحوم دلّی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علو مرتبت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے آباؤ اجداد جو ابتدائً عرب کے رہنے والے تھے داغستان آئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے ہمدان اور ہرات پہونچے۔ ان کے بزرگ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہاں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے۔ عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب دیا تھا جو حُسنِ اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا۔ سید صاحب کے والد میر تقی ایسے قانع بزرگ تھے کہ کہا جاتا ہے جب اکبر شاہ ثانی نے ان کو عہدۂ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النساء بیگم تھا، جو ایک روشن دل خاتون تھیں، سید صاحب کی پرورش کی، اور ان کو زمانے کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی۔ سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا زمانہ پایا تھا جس میں غالب صہبائی۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ مومن وغیرہ کی طرح کے زندہ دل ارباب کمال موجود تھے۔ مرزا غالب اور سید صاحب میں اس قدر

ارتباط تھا کہ سید صاحب ان کو چچا کہتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں سید صاحب دلی میں بعہدۂ سررشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔ ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلی کے صدر امین رہے اور اسی زمانے میں اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی۔ جس میں دلی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ اور نیز اپنے زمانہ کے دلی کے تمام کاملین اور فقراء، علماء اور شعراء وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اور فرینچ میں گارسن ڈیٹاسی نے ترجمہ کیا۔ جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ سید صاحب نے ۱۸۴۲ء میں ایک کتاب موسوم بہ "جلاء القلوب" جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے۔ ۱۸۴۴ء میں "تحفہ حسن" ۱۸۴۵ء میں "تحصیل فی جرح السائل" (ترجمہ معیار العقول)، ۱۸۴۶ء میں "فوائد الافکار" اور "قول متین" ۱۸۴۹ء میں کلمۃ الحق، ۱۸۵۰ء میں راہ سنت، ۱۸۵۲ء میں سلسلہ ملوک ہند۔ جس میں دلی کے بادشاہوں کے مختصر حالات راجہ جدھشٹر کے وقت سے لکھے ہیں اور ۱۸۵۳ء میں ترجمہ کیمیائے سعادت تصنیف کیں۔ ۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے تاریخ بجنور لکھی۔ آئین اکبری کی تصحیح و تحشی کا فخر بھی سید صاحب کو حاصل ہے۔ مسٹر بلاکمین جنہوں نے آئین اکبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ سید صاحب کی کاوش کے معرف اور ان کی تصحیح کے معترف ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی سید صاحب نے مختلف طریقوں سے امداد کی۔ اور جب ان کو ایک علاقہ ان کی خدمات کے صلے میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں انہوں نے اپنا مشہور پمفلٹ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کیا جو ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "وفادار مسلمانانِ ہند" کے نام سے شائع کی۔ برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمائش سے تصحیح کی۔ ۱۸۶۲ء میں ان کی تفسیر بائیبل موسوم بہ "تبیین الکلام" شائع ہوئی۔ جس کو قدیم روش کے مسلمانوں نے ناپسند کیا اور اس پر نکتہ چینی کی مگر اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔ ۱۸۶۲ء میں سید صاحب بدل کر غازی پور آئے جہاں سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف ہوں۔ ڈیوک آف آرگائیل جو اس زمانے میں سیکرٹری آف اسٹیٹ ہند تھے اس سوسائٹی کے مربی (پیٹرن) اور لفٹننٹ گورنر ان پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن بنائے گئے۔ ایک زمانے میں یہ سوسائٹی بہت

مشہور و مقبول تھی اور اس کے ممبروں نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے مختلف مضامین مثلاً تاریخ، جیوگرفی زراعت و فلاحت اقتصادیات پر لکھے۔ ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڑھ آئے۔ اور ان کے ساتھ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہو کر آگئی۔ ۱۸۶۱ء میں انہوں نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۳ء میں اسی طرح کا ایک اسکول غازی پور میں قائم کیا تھا۔ اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم کے فوائد اور برکتوں پر لکچر دیئے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن تھا[1]۔ اور نیز اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکالا۔ جس میں وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں کے بھی اچھے اچھے مضامین اس میں ترجمہ کرا کے شائع کئے جاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا بنارس کو تبادلہ ہوگیا۔ مگر ان کے ادبی اور تعلیمی کاموں میں اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہیں ہوا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل بھی بھیجا تھا۔ اور ان کے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگوں میں ایک قسم کی شورش پیدا ہوگئی۔ اور سید صاحب ان باتوں کی وجہ سے بہت بدنام ہوگئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ (جو بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہوگئے تھے) ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات اور نیز ان کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانے میں سر ولیم میور کی مشہور کتاب "لائف آف محمد" (سوانح عمری آنحضرت صلعم) کا ایک دلیرانہ جواب انہوں نے لکھا اور نیز مسلمانوں کے واسطے ایک رہائشی کالج ولایت کے آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کے انداز پر ہندوستان میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے مطالعہ سے مسلمانانِ ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ اس سے

---

[1] برٹش انڈین ایسوسی ایشن ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عوام کے حقوق کے لئے پارلیمنٹ سے براہ راست تعلق قائم کیا جائے۔ ایسوسی ایشن نے بعض مفید کام بھی کئے۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید کی تبدیلی بنارس ہوگئی۔ اور ایسوسی ایشن کا خاتمہ ہوگیا۔
(حیات جاوید ص۹۵ طبع علیگڑھ ۱۹۲۲ء) - مرتب

مسلمانوں کو وہی فوائد پہونچے جو اڈیسن اور سٹیل کے رسائل "ٹیٹلر" اور "سپکٹیٹر" سے اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اس کے جاری کرنے کی یہ غرض تھی کہ مسلمانوں کے خیالات علی الخصوص مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہوں جس سے ان کے تمام معاشرتی اور تمدنی معاملات میں ضرور اصلاح ہو جائے گی۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر لکھے جاتے ہیں اور لکھنے والے خود سرسید نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی اور آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف ہے نکل جائے اور ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن اسباب سے اس قسم کے خیالات ان کے پیش روؤں کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہنچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کریں۔ وہ اپنے افلاس و ادبار کا احساس کریں اور کٹھ ملاؤں کے پنجے سے نجات پا جائیں۔ اسی زمانے میں ایک تفسیر قرآن بھی سید صاحب نے تصنیف فرمائی۔ جس کی چھ جلدیں شائع ہوئیں۔ مگر یہ نصف قرآن تک پہنچی۔ پہلی جلد ۱۲۹۶ھ میں طبع ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتوں پر جن کا حوالہ قرآن شریف میں ہے۔ بائیبل کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاد، دوزخ و بہشت، معراج وغیرہ پر جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی ہیں اُن کا شافی جواب دیا گیا ہے۔ بعض تاویلات اور ضعیف و غیر مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے اور جو شکوک کہ علوم مادی کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتاب ہونے میں پیدا ہوتے ہیں وہ رفع کئے گئے ہیں۔ مگر ان دونوں چیزوں سے قدیم روش کے مذہبی پیرو سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے۔ ان کو کافر، ملحد، نیچری کے خطابات دیئے گئے۔ اکثر اخبارات اور رسائل صرف اسی غرض سے جاری کئے گئے کہ سید صاحب اور ان کے جدید خیالات کا خاکہ اڑایا جائے اودھ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں ان کے کارٹون نکلے اور تمسخر آمیز مضامین نظم و نثر ان کے نسبت لکھے گئے۔ مگر سید صاحب اپنے مشاغل میں سرگرم رہے اور اس مخالفت کا ان پر مطلق اثر نہ پڑا۔ آخر عمر میں ان کو سوائے اپنے محبوب کالج کی ترقی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر تعلیمی اور سیاسی مشاغل میں گزار دی۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں ایک طویل عمر پا کر اور ایک کامیاب زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندوستان کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

سید صاحب کا طرزِ تحریر | یقیناً سید صاحب اُردو کے نثر نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ

رکھتے ہیں۔ اُن کا قلم بہت زبردست اور اُن کا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ ان کا طرزِ تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہے۔ کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی۔ مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے وہ مقررہ قواعد انشاپردازی سے بالکل بے نیاز تھے۔ مگر یہی چیز ان کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہونچانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ ان کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی۔ ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کردیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ ”مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو“ پر سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت ان کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ نثر اردو لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ اُن کے پیشتر کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ مولانا حالی تو ان کو نثر اُردو کا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے۔ مگر سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے۔ اس کا نقش اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے رفقائے کار دنیا کے تمام بڑے لوگوں کو سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و راستبازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کے حواریوں کا تھا جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں :-

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی۔ مولوی ذکاء اللہ۔ خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین۔ ان میں سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ حالی تو نامی شاعر تھے۔ مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانوں اور ناولوں کے لئے مشہور ہیں۔ شبلی اور ذکاء اللہ فن نقد اور تاریخ کے امام تھے۔ مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے بیش بہا اور گران قدر

مضامین نے ادب اردو کو ہمیشہ کے لئے ممنون احسان کیا۔ ان تمام بزرگوں کی مساعی جمیلہ جو مسلمانوں کی اصلاح حال کے لئے وقف تھیں نہایت بار آور اور کامیاب ثابت ہوئیں اور ان کی تصانیف سے زبان اردو میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

محسن الملک نواب سید مہدی علی خان بہادر ۱۸۳۷ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ معمولی درسیات سے فراغت کر کے بعہد ایسٹ انڈیا کمپنی دس روپیہ ماہوار پر کلرک مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۸۵۷ء میں اہلمد پھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار سرکاری مقرر ہوئے۔ اپنے خدمات کی انجام دہی میں انہوں نے انتہا درجہ کی قابلیت اور کارگزاری کا ثبوت دیا۔ اور اسی اثناء میں دو کتابیں اردو میں ایک قانون مال اور دوسری قانون فوجداری کے متعلق تصنیف کیں۔ جن کو اس زمانے میں شہرت ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلہ کا امتحان کامیابی سے دیکر ۱۸۶۷ء میں مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی شہرت دور دور پہونچی تھی۔ چنانچہ سرسالار جنگ اول نے ان کو حیدر آباد طلب کیا اور ۱۸۷۴ء میں وہ مالیات کے افسر اعلیٰ (انسپکٹر جنرل) مقرر ہوئے۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں انہوں نے اکثر کام نہایت مفید انجام دیئے۔ مثلاً محکمۂ بندوبست و پیمائش میں بہت مفید اصلاحیں کیں اور بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ۱۸۸۴ء میں ریونیو سیکرٹری یعنی اعلیٰ معتمد مال اور ۱۸۸۷ء میں فنانشل و پولیٹیکل سیکرٹری کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے اور سرکار نظام سے "محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ" کا خطاب پایا۔ سفر انگلستان بھی کیا تھا اور گلیڈ سٹون سے ملاقات کی تھی۔ بالآخر پولیٹیکل سازشوں کے سبب سے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو کر اور آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پا کر علی گڑھ چلے آئے جہاں بقیہ عمر کالج کے انتظام اور سرپرستی اور تعلیمی خدمات میں صرف کی۔

سید صاحب سے اُن سے بہت قدیم تعلقات تھے۔ مشہور ہے کہ جب سید صاحب شروع شروع میں مذہب میں کچھ دست اندازیاں کر رہے تھے تو عام مسلمانوں کی طرح یہ بھی ان کو کافر و ملحد سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو جب ان کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو ان کے بہت بڑے مدّاح اور معاون ہو گئے۔ چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر بیش بہا مضامین انہیں کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی غرض اصلی صرف یہ ہے کہ زمانۂ حال کے مسلمان جو نکبت و فلاکت کے گڑھے میں بڑے

ہوئے ہیں اپنے بزرگانِ سلف کے قدم بہ قدم چلیں اور اپنے آپ کو ہر حیثیت یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین ان کے تبحر علمی وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عادل ہیں مولانا حالی نے بہت سچ لکھا ہے کہ "سید مہدی علی مسلمانوں کے دلوں کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا کر اُبھارتے تھے۔ اور جو کچھ کہ انہوں نے سرسید کی تائید میں لکھا وہ بڑے استدلال و استناد سے لکھا۔ اکثر ان کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہیں بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہیں" اسی طرح مولانا شبلی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میدانِ ادب میں وہ کسی بڑے سے بڑے نثار سے پیچھے نہیں رہے اور اُن کا ایک خاص طرز تحریر ہے۔"

ان کے طرز تحریر کے خصوصیات یہ ہیں کہ عبارت نہایت زوردار ہوتی ہے مگر اس پر بھی صفائی اور سلاست اور حسن بیان میں فرق نہیں پڑتا۔ اگر کہیں پرانے طرز کی تقلید میں عبارت آرائی اور رنگینی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے صنایع بدایع اور استعارات و تمثیلات برُے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ حسن عبارت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس قسم کی پُر تکلف عبارت وہ زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ ان کے زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ علاوہ مضامین مذکورۂ بالا کے اُن کی کوئی مشہور تصنیف سوائے "آیات بینات" کے نہیں ہے اور یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی ظفر علی خان نے ڈریپر کی مشہور کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" کا ترجمہ نواب صاحب موصوف ہی کی فرمائش سے کیا تھا۔ نواب صاحب نے ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا اور سرسید کے قریب دفن ہوئے۔

نواب وقار الملک
۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء

خلافت علی گڑھ کے خلیفہ ثانی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے صاحبزادے تھے امروہہ (یو۔پی) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایک کمبوہ خاندان سے تھے۔ شروع میں کسی سکول میں پڑھاتے تھے اور زمانہ قحط میں امروہہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں۔ پھر رفتہ رفتہ سر رشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہوگئے اور سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے۔ سرسید ہی کی سفارش سے حیدر آباد پہونچے جہاں سر سالار جنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تن دہی اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا۔ سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلد بلائے گئے اور

دوبارہ انہوں نے نہایت عمدہ اور مفید اصلاحیں سرکاری کاموں میں کیں۔ جس کے صلہ میں معزز خطاب "وقار الدولہ وقار الملک" کا سرکار آصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بقیہ عمر قومی کاموں میں علی الخصوص علی گڑھ کالج کی اصلاح و ترقی میں صرف کردی۔ نواب صاحب موصوف ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر اور "تہذیب الاخلاق" کے مہتمم بھی ہو گئے تھے۔ تصانیف آپ کی چند قیمتی مضامین ہیں جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب "فرینچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کا اردو ترجمہ "سرگزشت نپولین بونا پارٹ" ہے جس کی تالیف میں منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا تھا۔ اور ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے چھپ کر شائع ہوا۔

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ انہوں نے میرٹھ سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری ملازمت کر کے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ضلع بستی کے محکمۂ خزانہ میں مبلغ بیس روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں سر سید کی کوشش سے حیدرآباد گئے جہاں نواب محسن الملک کی ماتحتی میں نائب معتمد مال بمشاہرہ چار سو روپیہ مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ریونیو اور پولیٹکل سیکرٹری کے معزز عہدہ پر بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ممتاز ہوتے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور راستباز شخص تھے۔ کتب بینی کا ان کو اس قدر شوق تھا کہ مقامات دور دراز مثلاً مصر و شام سے کتابیں منگواتے تھے۔ ابتدائے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا۔ جس میں مذہبی رنگ غالب تھا۔ کبھی کبھی عیسائیوں پادریوں سے بھی مقابلہ ہو جاتا تھا۔ جس میں یہ مذہب اسلام کی خوبیوں کو نہایت شد و مد سے ثابت کرتے تھے۔ یہ مطالعہ کتب کے عاشق اور پابندی اصول کے ایک پیکر مجسم تھے۔ ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ علاوہ ان کتابوں کے جو ملازمت حیدرآباد کے زمانے میں حیدرآباد کے انتظامی معاملات اور سرکاری رپوٹوں وغیرہ کے متعلق انہوں نے لکھیں۔ کتب ذیل جو عام دلچسپی کی ہیں مشہور ہیں۔ تحقیق الجہاد مسلمانوں

نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا کیا اصلاحات کیں، رسول برحق، اسلام کی دنیا دی برکتیں
قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ان کے علاوہ اُن کے مضامین تہذیب الاخلاق اور وہ خطوط، جو
مجموعۂ رسائل "کے نام سے چھپے ہیں اور چند اُردو اور انگریزی پمفلٹ بھی ہیں جو مسائل اختلافی
پر لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب موصوف علاوہ ایک متبحر فاضل اور جیّد عالم ہونے کے فن مناظرہ
میں ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور ان کو مشکل مشکل مسائل میں دلنشیں جواب دینے
کا ایک خاص سلیقہ تھا اور عبارت بھی نہایت زور دار لکھتے تھے۔ ہر چند کہ اس میں ادبی شان
کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد متوفی ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد گزشتہ صدی کی تیسری دہائی
دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی باقر علی جنہوں نے شمال
ہند میں مضمون نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسی وجہ
سے آزاد کی ابتدائی تعلیم استاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی انہیں کی بابرکت صحبت میں
انہوں نے شعر گوئی اور فن عروض سیکھا آزاد پرانے دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ جس سے
مولوی نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال آشوب ایسے لائق اور ہونہار لوگ پڑھ کر
نکلے۔ استاد ذوق کے ساتھ یہ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے اور بڑے بڑے شعراء
سے روشناس ہوتے تھے اور انہیں ادبی صحبتوں سے ان کا ذوق سخن سیراب ہوتا تھا۔ غدر
۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کے بعد آزاد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگرداں پھرتے ہوئے
لکھنؤ پہونچے۔ ان کے والد کا انتقال غدر میں ہو چکا تھا۔ استاد کا کلام اور کچھ خود ان کا کلام
جو بچنے کا تھا غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ ہنگامہ غدر فرو ہونے کے بعد آزاد نے کسب معاش
کے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ کچھ دنوں تک ایک فوجی سکول میں ماسٹر رہے۔ مگر چند
دنوں کے بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخر کار پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہونچے اور
مولوی رجب علی کے ذریعہ سے پنڈت من پھول لفٹنٹ گورنر کے میر منشی سے ملے جن کی
سفارش سے سررشتہ تعلیم کے محکمہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ چھوٹے عہدے
کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے ملیں۔ جو ان کی لیاقت
اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کر کے ان کو کسی اعلیٰ عہدے پر پہونچائیں اتفاق سے ماسٹر پیارے
لال آشوب کے ذریعہ سے جو ان کے بہی خواہ اور دوست تھے میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتہ
تعلیم تک رسائی ہو گئی جو علوم والسنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے اور رسائی کی صورت یہ ہوئی
کہ میجر صاحب نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا۔ جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔

ماسٹر پیارے لال نے آزاد کو بلایا اور اُن سے اس کی بابت دریافت کیا گیا۔ انہوں نے "ایجاد" کو مذکر کہا۔ اور جب سند مانگی گئی تو یہ شعر سودا کا پڑھا ـــــ ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے نسخہ ہیں معجون زر بناد ہے۔ اس وقت سے میجر صاحب کی خدمت میں ان کی رسائی ہو گئی اور کچھ ترقی بھی ہو گئی۔ سب سے پہلے یہ اردو فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے۔ چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اُردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری اور قصص ہند اس زمانے کی اُن کی مشہور تصانیف ہیں جو مبتدیوں میں نہایت مقبول ہوئیں اور انہیں تصانیف کی بدولت پنجاب میں سکولی تعلیم بہت رائج ہوئی۔ آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ انہوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جس کی وجہ سے صوبۂ پنجاب میں اُردو کی ترقی اور ترویج ہوئی۔ جب میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوئے۔ جن کو زبانِ اُردو کا محسن سمجھنا بالکل بجا ہے تو ۱۸۶۷ء میں آزاد نے کرنیل صاحب موصوف کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک خاص مشاعرہ قائم کیا جائے جس کی غرض یہ ہو کہ اُردو شاعری کو مبالغہ آمیز اور پُر تصنع روش بدل جائے اور اُس میں حقیقت اور اصلیت کی روح پیدا کی جائے۔ ۱۸۶۵ء میں وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل و بخارا گئے تھے[1]۔ ایران وہ دو مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء میں زبان فارسی سے ان کو ایک خاص لگاؤ تھا اور اسی وجہ سے اس کا مطالعہ انہوں نے خاص طور پر کیا تھا اور ایران کے قیام نے ان کو جدید فارسی سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ انہیں وجوہ سے ان کی وہ تصانیف جو زبان فارسی کے متعلق ہیں۔ دلچسپی اور معلومات سے پُر ہیں۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو "آتالیق پنجاب" (ایک سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر بمشاہرہ پچھتر روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا۔ اور ایڈیٹر رائے بہادر پیارے لال آشوب تھے۔ جب

---

[1] آزاد انگریز حکومت کی ہدایت پر کابل و بخارا میں روس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا جائزہ لینے کیلئے سیاسی مشن پر گئے تھے۔ یہ مشن چار افراد پر مشتمل تھا، آزاد کے علاوہ پنڈت من پھول، منشی فیض بخش پشاوری اور کرم چند نندرام اس میں شامل تھے۔ پنڈت من پھول انگریز حکومت کی نظر میں معتمد تھے اس لئے وہ سربراہ مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر محمد صادق کا بیان ہے کہ مشن کے سربراہ ڈاکٹر لائیٹنر تھے۔

۱۔ محمد حسین آزاد۔ ڈاکٹر محمد صادق۔ ۲۔ محمد حسین آزاد جلد نمبر ۱۔ اسلم فرخی

۲۔ انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت۔ آغا محمد اشرف (مرتب)

تھوڑے عرصہ کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا اور "پنجاب میگزین" اس کی جگہ نکلا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہدے پر متعین رہے۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جوبلی کے موقع پر ان کی قابلیت کے صلہ میں ان کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ دماغی محنت اور سفر ایران کا تعب اور اپنی پیاری بیٹی کی بے وقت موت کی وجہ سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور جن کو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی۔ ان کے قوائے دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جس کی وجہ سے ۱۸۸۹ء میں کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے جس سے وہ کسی ادبی کام کے لائق نہیں رہے۔ آخر عمر تک یہی حالت جنون کی رہی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی۔

تصانیف | آزاد کی حسب ذیل تصانیف[1] ہیں۔ فارسی ریڈریں (۲ حصے) قدیم اردو ریڈریں (۲ حصے)

---

[1] آزاد کی تصانیف کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ مکمل فہرست کے لئے محمد حسین آزاد جلد دوم از ڈاکٹر محمد اسلم فرخی دیکھئے۔

مذکورہ تصانیف کے سنین یہ ہیں :۔

فارسی ریڈریں ۱۸۷۰ء

قصص ہند ۱۸۶۹ء

جامع القواعد ۱۸۸۴ء

نئی اردو ریڈریں (۲ حصے) ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان (تقریباً)

آب حیات ۱۸۸۰ء

نیرنگ خیال ۱۸۸۰ء (حصہ اول)

سخندان فارس ۱۸۷۲ء (حصہ اول)

قند پارسی ۱۸۸۱ء

نصیحت کا کرن پھول ۱۸۶۴ء

دیوان ذوق ۱۸۹۱ء

دربار اکبری ۱۸۹۸ء

نظم آزاد ۱۸۹۷ء

نگارستان فارس ۱۹۲۲ء (اشاعت، زمانۂ تصنیف ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ۔

سیاک دنماک ۱۸۹۰ء

جانورستان ۱۹۲۸ء ۔ (مرتب)

اردو کا قاعدہ و قواعد اُردو - قصص ہند - جامع القواعد نئی اردو ریڈریں (۲ حصوں میں)
آب حیات - نیرنگ خیال - سخندان فارسی - تند پارسی - نصیحت کا کرن پھول - دیوان ذوق -
نظم آزاد - دربار اکبری - نگارستان فارس - سپاک دناک - جانورستان -

ریڈریں اور سکولی کتابیں | اُردو اور فارسی ریڈریں اور ابتدائی رسائل صرف و نحو طلبائے سکول اور ہندیوں کے واسطے لکھے گئے تھے - ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلبا کے واسطے وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک وہ داخل درس رہی بھی ہیں - علی الخصوص قصص ہند جس میں تاریخ ہندوستان کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب دلچسپ بلیغ اور پُرزور عبارت میں لکھے گئے ہیں یہ لاجواب کتاب جماعت طلبا میں اور نیز پبلک میں بیحد مقبول ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں - بچے اس کو دلچسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھے لکھے اس کی عبارت کے دلدادہ ہیں - جملوں کا توازن - عبارت کی چستی الفاظ کی شکوہ اور مضامین کی ترتیب اس کی ہم جنس کتابوں سے اس کا درجہ بلند کر دیتی ہے -

آب حیات | مولانا آزاد کا شاہکار اور ان کی بہترین تصنیف آب حیات ہے - اس میں مشہور مشہور شعرا کے مختصر حالات مع ان کے نمونہ کلام اور تنقید کے درج ہیں - اور زبان اُردو کی تاریخ اور اُن تغیرات کا بھی ذکر ہے جو زبان اردو میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں - حقیقت میں اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہو گئی اس وجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعۂ اشعار موجود تھے - مگر وہ قابل اعتنا نہ تھے اور نامکمل بھی تھے - بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعروں کا حال صرف چند سطروں میں لکھ دیا اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ محض کلمات توصیف و تحسین - ادب اردو آزاد کا ممنون ہے کہ انہوں نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرۂ شعرا ترتیب دیا - جس کے واسطے یقیناً ان کو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہوگی - وہ ایک ایسا خزانۂ معلومات ہے کہ جس سے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدد لے سکتے ہیں اور لیتے رہے ہیں - علاوہ اس خوبی یعنی گنجینۂ معلومات ہونے کے اس کی اصلی خوبی اس کی بے مثال طرز عبارت ہے کہ جس کی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہیں مگر کما حقہٗ کوئی نہیں کر سکا - الحق آزاد نے آب حیات لکھ کر ادب اردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زیب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے - وہ ایک زور دار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل ان سے لطف اٹھاتا ہے مگر اسی کے ساتھ

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دیں۔ اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے واقعات میں کمی و بیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا۔ مگر زمانہ حال کے تجسس و تلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آبحیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہیں۔ اکثر جگہ جانبداری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے استاد ذوق کی بیحد تعریف و توصیف اور ان کے حالات میں شغف اور مرزا غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی بلکہ جگہ جگہ ان پر در پردہ چوٹیں۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ انشا کے آخری زمانے کے عبرت انگیز غیر موثق حالات وغیرہ یہ اور اسی قسم کی باتیں جو اب تک مطالعہ پر نظر آئی ہیں۔ آبحیات کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہیں۔ پھر بھی اگر اس قسم کی اور بھی غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں کتاب کی اصل خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی زیادہ فرق نہیں آتا۔ اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اردو میں قائم ہوا۔ حالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیمی تذکرہ کے۔ بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے۔ بحیثیت غیر قابل تنقید ہونے کے یہ کتاب آپ اپنی جواب ہے۔ اور آئندہ بھی اس کا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نیرنگ خیال | یہ بھی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے جس میں خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردہ میں عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ دو حصوں میں ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم میں لوگوں کے مطبوع خاطر رہے ہیں یونانی اور رومی لوگوں کو ان کا بہت شوق تھا۔ انگریزی میں ایڈیسن جان نیبین اور اسپنسر کے ایلیگری (خیالی قصے) مشہور ہیں اور فارسی میں مثنوی مولانا روم اور انوار سہیلی سنسکرت میں ہتوپدیش اور عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ ہمارے خیال میں آزاد نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے ان کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر لیٹنر نے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس اتباع میں کامیاب ہوئے یہ کتاب ان کے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے۔ مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔

سخندان فارس | ادب فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک تحقیقی رسالہ علم فلالوجی پر ہے۔ جس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحد الاصل ثابت کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اس میں اہل ایران کے رسوم و رواج کا بھی ذکر ہے اور ان کا مقابلہ ہندوستان سے کیا ہے۔ خود مصنف کے سفر ایران اور ان کے علمی مکاشفات کے حالات بھی درج ہیں مثل مولانا شبلی کی شعر العجم کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جا سکتی۔ مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک ذخیرۂ معلومات ہے۔

قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول | قند پارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانۂ حال کی فارسی کے حاصل کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اس میں مولانا کے سفر ایران کے بھی بہت کچھ حالات درج ہیں نصیحت کا کرن پھول جو ایک مکالمہ اور نصایح کے پیرایہ میں ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لئے بہت مفید ہے۔ اس کی عبارت بہت صاف و سلیس ہے۔

دیوان ذوق | اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے مولانا آزاد نے ادب اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اپنے استاد کے کلام کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔ تذکرۂ آبحیات میں انہوں نے نہایت مؤثر اور دردناک لہجہ سے اور تفصیل کے ساتھ استاد کے کلام کا ضائع ہو جانا اور پھر ان اجزائے پریشان کو بڑی محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہے۔ دیوان کے شروع میں ایک دیباچہ ہے اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ ان کے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور پیشتر کے مطبوعہ کلام سے ایک بیّن اضافہ بھی اس میں موجود ہے۔ ان دلچسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ بلکہ اس میں ایک "رومان" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں نے الحاقی کلام پر شک بھی ظاہر کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس قسم کے شکوک بے بنیاد ہیں اور ان پر زیادہ نہ خیال کرنا چاہیئے[1]۔

دربار اکبری | یہ مہتم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور ان کے اراکین سلطنت کے حال میں ہے۔ اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

دیگر تصانیف | "سپاک و نماک" و "جانورستان" اس زمانے کی تصانیف ہیں جبکہ مولانا

---

[1] دیوان ذوق میں الحاق کا الزام غلط نہیں ہے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے ایسی ۱۲ غزلوں کے حوالے دیئے ہیں جو آزاد نے خود لکھ کر دیوان میں ڈالی ہیں۔ اور دوسری بے شمار غزلوں کی اصلاح کر دی ہے۔ (ہندوستانی ۱۹۳۴ء) ۔ مرتب)

صحیح الدماغ نہ رہے تھے۔ اولاً کہ ایک غیر مربوط مجموعہ متصوفانہ خیالات کا ہے جو اُسی عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوقِ تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے کہ باوجود تعطّلِ دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ ان کو ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف "جانورستان" بھی ہے۔ جس میں کچھ جانوروں کے حالات اور ان کی آوازوں کا بیان ہے "نگارستانِ فارس" جو بعد ان کے انتقال کے شائع ہوئی ایران ہندوستان کے فارسی شعرا کا ایک مختصر تذکرہ ہے جس میں رودکی سے لے کر حزیں اور واقف و آرزو تک تقریباً ۲۶ شعرا کے حالات مع اُن کے نمونۂ کلام کے درج ہیں۔ اس کی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آبِ حیات کے پُرلطف نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ ان کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخری کتاب جو ان کے نام ان کے پوتے نے شائع کی ہے "الہیات" ہے۔

آزاد کا مرتبہ، اُردو نثاروں میں اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایاں ہستی ہے۔ بحیثیت بانیٔ تحریکِ جدید ہونے کے۔ بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے بحیثیت ایک فارسی سکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ بحیثیت ایک مروّجِ تعلیم کے۔ جن کی وجہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اردو فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا۔ بحیثیت ایک اعلیٰ مضمون نگار کے۔ بحیثیت ایک زبردست ناقد کے۔ بحیثیت ایک مشہور پروفیسر اور مصنف کے۔ بحیثیت حامیٔ اردو کے۔ بحیثیت ایک زبردست مقرر کے۔ آزاد اپنے زمانہ میں عدیم المثال تھے۔ مگر وہ چیز جس نے ان کو زندہ جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرزِ تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔ زبان اردو نے ان کی ذات میں اپنا ایک بہت بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ ان کے طرزِ تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دور از کار صنائع بدائع جن کا آج کل بہت رواج ہے اس میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حسن و خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنّعات اور تکلّفات سے گوکہ عاری ہے۔ مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اُس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشاپردازوں میں ڈی کوئینسی۔ لیمب اور اسٹیونسن سے جو صاحبانِ طرزِ خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اپنے زمانے میں بھی آزاد بہت ہر دلعزیز اور مقبول ہو چکے تھے اور ان کے معاصرین ان کو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ حالی نے آبِ حیات اور

نیرنگ خیال کی تقریظوں میں ان کی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کے طرز جدید کا ان کو بانی قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی اُن کو اُردو کا ایک بہت بڑا ہیرو سمجھتے تھے۔ اور ان کی موت پر ان کو خدائے اردو کہہ کے یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکار اللہ بھی ان کے بڑے مداح اور قدر دان تھے۔

آزاد ظریف الطبع۔ نہایت مہذب و متین اور تعصب سے بالکل آزاد تھے۔ وہ سریع الغیظ مگر جلد معاف کر دینے والے تھے۔ بعض معاصرین سے چشمک رہتی تھی جس کا انجام بحث و مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی | خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے حصۂ نظم میں ہو چکا ہے۔ یہاں بحیثیت معروف نثار کے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

تریاق مسموم مطبوعہ ۱۸۶۸ء۔ علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ۔ مجلس النساء[1] (۲ حصوں میں) مطبوعہ ۱۸۷۴ء۔ حیات سعدی مطبوعہ ۱۸۸۶ء۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۶ء۔ حیات جاوید یعنی سر سید مرحوم کی سوانحعمری مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔ مضامین حالی یعنی ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپتے ہیں۔

ابتدائی تصانیف | "تریاق مسموم" پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہے جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جس نے اسلام پر اعتراضات کئے تھے۔ ان میں کوئی ادبی خوبی نہیں۔ محض اس لئے دلچسپ ہے کہ اس سے ان کی ذکاوت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ "طبقات الارض" ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو خود فرانسیسی سے کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر لیبیٹر کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ "مجلس النساء" ایک انعامی رسالہ ہے جس کے صلہ میں مولانا کو مبلغ چار سو روپیہ کا انعام لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے عطا کیا تھا یہ عورتوں کے واسطے بہت مفید ہے اور لڑکیوں کے اسکولوں میں ایک عرصہ تک بحیثیت درسی کتاب کے داخل رہی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو شریف گھرانے کی عورتیں بولتی ہیں۔

حیات سعدی | حیات یعنی شیخ سعدی شیرازی کی سوانحعمری اس سے مولانا نے اردو نثاروں کی صفِ اوّل میں جگہ پائی اور ان کی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان

---

[1] صحیح نام مجالس النساء ہے۔ (مرتب)

کا پتہ چلا۔

مقدمہ شعر و شاعری مولانا کے دیوان کے شروع میں یہ معرکتہ الآرا مقدمہ ہے جس نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور مولانا کی شہرت کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ اس میں دو سو سے زیادہ صفحات ہیں اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہے مگر اس کو دیوان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک نہایت قابلانہ تنقیدی مضمون نفس شاعری کے آئیڈیل (انتہائی نقطۂ خیال) پر ہے۔ اس کی تصنیف سے بڑے تجسس و تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے اس میں یونانی و رومی انگریزی و عربی نقادان فن شعر کے خیالات شعر کی بابتہ قلمبند کئے گئے ہیں ہر چند کہ نہایت مجمل اور غیر مربوط طریقے سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یورپین شاعری میں مولانا حالی تہ تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شناور نہیں ہیں۔ سنسکرت کی شاعری کی بوجہ عدم واقفیت زبان بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر باوجود ان سب کے کتاب ایک ذخیرہ معلومات ہے اور اس وجہ سے کہ اس قسم کے فن نقد میں سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابل قدر ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کے مطالعے سے قدیم طرز کے شعراء کے سامنے جدید معلومات اور تحقیق کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تقلید میں زمانہ موجودہ کے اکثر دواوین کے ساتھ اکثر مقدمات لاطائل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا ماخذ درحقیقت یہی مقدمۂ شعر و شاعری ہے اور کسی جدید بات کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

یادگار غالب مولانا کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز تصنیف یادگار غالب ہے۔ جس سے بہتر کوئی کتاب اس طرز کی اب تک نہیں نکلی۔ اس میں مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات ان کے لطائف و ظرافت وغیرہ نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کے بعد اُن کے ہر قسم کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دید لکھتے ہیں مشکل اشعار کے معانی بھی سمجھائے ہیں اور اُن مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہے گئے تھے۔ جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اس تصنیف کے ذریعہ سے حالی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اسی طرح ادا کر دیا جس طرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو زندہ جاوید بنا دیا دونوں اپنے اپنے استادوں کے شاگرد رشید اور دل سے چاہنے والے تھے۔ "یادگار غالب" تنقید کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ تنقید گو کہ اعلیٰ درجہ کی ہے مگر پھر بھی جوشش

عقیدتمندی کہیں کہیں جادۂ انصاف سے ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید | حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خود انہوں نے حیات ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال کثیر الاشغال زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہوگیا ہے۔ جو باسویل کی مشہور کتاب "ڈاکٹر جانسن کی لائف" کو انگریزی میں ہوا ہے۔ سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور مدبر اور ریفارمر اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں۔ سرسید کے ساتھ ان کے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات اس میں درج ہیں۔ یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اسی وجہ سے مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا ان کی کوئی توجیہ کردی گئی ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہاں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور زیادہ توقع و بریدہ سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔

مضامین حالی | وہ مضامین ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد میں علی الخصوص تہذیب الاخلاق میں چھپوائے ہیں۔ ان کے علاوہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے ترتیب دے کر چھپوایا ہے۔

طرز تحریر | مولانا کی عبارت نہایت صاف سادہ زبردست اور زوردار ہوتی ہے۔ مگر اس میں آزاد کی سی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف ظرافت نہیں ہوتی۔ حالی گو کہ صاحب طرز نہیں مگر بہترین نثار ہیں۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہیں۔ صنایع بدایع کی نہ ان کے یہاں کثرت ہے اور نہ ان کا بیجا استعمال وہ کرتے ہیں۔ محض لفاظی اور عبارت آرائی وہ کبھی نہیں کرتے اور عبارت کی ظاہر آرائش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی عبارت مدلل ہوتی ہے جدید نثر اردو نے ان کو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور انہوں نے مرزا غالب اور سرسید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ اُن کی تصانیف آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین نمونہ سمجھی جاسکتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱ء لغایت ۱۹۱۲ء | شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد موضع

ریہڑ ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لئے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا، اور انہیں سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا اور دلی میں آکر ۱۸۴۵ء میں مولوی عبد الخالق کے شاگرد ہوئے جن کی پوتی سے انہوں نے عقد بھی کیا۔ دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ دلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں ادب عربی اور فارسی و ریاضی وغیرہ میں تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی مگر والد کی مخالفت کی وجہ سے چھوڑنا پڑی۔ اس زمانہ میں ان کے ہم سبق حالی، آزاد، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔ مثل اس زمانے کے اور بڑے لوگوں کے مولوی نذیر احمد نے بھی زندگی کی ابتدا ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی۔ یعنی وہ پنجاب میں کسی مقام میں بیس پچیس روپیہ ماہوار کے ٹیچر مقرر ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ غدر کے زمانے میں انہوں نے کسی میم کی جان بچائی تھی جس خدمت کے صلے میں ایک تمغہ اور کچھ زر نقد سرکار سے ملا اور انسپکٹر مدارس کے درجے پر ترقی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد میں ہو گیا اور یہیں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی سیکھ لی کیونکہ ان کو نہایت شرم و حجاب معلوم ہوتا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اس سے وہ محروم ہیں۔ اپنی طباعی اور ذہانت سے انہوں نے چھ مہینے کے اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۶۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر منجملہ دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے۔ ان کا ترجمہ (مجموعہ تعزیرات ہند) ایسا مقبول ہوا اور پسند آیا کہ اس کے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بند و بست ہو گئے۔ انہوں نے نجوم کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کو اس زمانے کے رزیڈنٹ کشمیر نے لکھا تھا کہ مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام پایا تھا۔ ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سر سالار جنگ اول نے ان کی خدمات گورنمنٹ سے اپنے یہاں منتقل کرالیں اور افسر بند و بست بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے قرآن شریف بھی حفظ کیا اور بعد کو سر سالار جنگ کے ایما سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار کر لی۔ جس میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبر مال بمشاہرہ سترہ سو روپیہ مقرر ہوئے اور ان کے بیٹے اور اعزہ کو معقول جگہیں اچھے اچھے عہدوں پر دی گئیں۔ سر سالار جنگ کے حکم سے انہوں نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا اور سر سالار جنگ

کے صاحبزادہ نواب لائق علی خاں اُن کے شاگرد تھے۔ ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دے کر ملازمت سے دست کش ہوگئے اور بقیہ عمر اپنے وطن مالوف دہلی میں یادِ الہٰی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بسر کی۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نہایت کامیاب و مصروف زندگی کے بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی اور ملت و قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ مولانا موصوف سرسید کی اس جماعت کے ایک معزز فرد تھے کہ جنہوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکچروں کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں بڑی اعانت کی تھی۔

تصانیف | مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہیں جن میں سے حسب ذیل بہت مشہور ہیں:۔

(از قسم ناول و حکایات)

مراۃ العروس	بنات النعش	توبۃ النصوح
ابن الوقت	محصنات	ایامیٰ
رویائے صادقہ	منتخب الحکایات (کتب مذہبی اخلاقی)	ترجمہ قرآن شریف
ادعیۃ القرآن	دہ سورہ	الحقوق والفرائض
مطالب القرآن	امہات الامۃ	اجتہاد (متفرق کتابیں)
صرف صغیر	رسم الخط	موعظۂ حسنہ
افسانۂ غدر	نصاب خسرو	چند پند
مبادی الحکمۃ	مایغنیک فی الصرف	مجموعۂ لیکچر اور انگریزی

قانونی کتابوں کے ترجمے مثلاً تعزیرات ہند قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سریع التصنیف دونوں تھے ان کی اکثر کتابیں مثلاً مایغنیک فی الصرف۔ مبادی الحکمۃ۔ منتخب الحکایات۔ رسم الخط وغیرہ۔ سکول کے طلباء کے واسطے لکھی گئیں اور واقعی ان کے واسطے بہت مفید ہیں۔ سرکاری ایکٹوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کئے گئے۔ مجموعہ تعزیرات ہند یعنی پینل کوڈ کے ترجمہ کو ان کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ اس مشہور قانون کے ترجمے کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے۔ پھر سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لئے مقرر ہوئے اور انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی اور بڑی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ ان کے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہیں جس میں اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک الفاظ مشکل الفاظ انگریزی کے لئے اردو میں وضع کئے گئے

ہیں جواب زبان زد خلایق ہو گئے ہیں۔ قانون شہادت یعنی ایوی ڈنس ایکٹ کا ترجمہ
پیرون کی کتاب سے کیا گیا ہے۔ "افسانۂ غدر" ایڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے
جس میں انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعض دلچسپ سوانحات کو قلمبند کیا ہے ان کے علاوہ
سات آٹھ چھوٹی چھوٹی مختصر کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدرآباد کے زمانے میں وہاں
کے عمال کے لئے بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے مگر چھپے نہیں۔

کتب مناظرہ و متعلق مذہب | اُس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائی واعظوں سے جن میں
سے بعض دین اسلام کو چھوڑ کر مسیحی ہو گئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے
لوگ مثلاً سرسید۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک وغیرہ ان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔
ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے امہات المومنین کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں
پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات کی نسبت کچھ بیجا الزامات قائم کئے تھے۔ مولوی نذیر احمد
نے اس کے جواب میں "اُمہات الاُمۃ" لکھی جس کی بعض لوگوں نے بہت قدر کی مگر بعض نے
سخت برا سمجھا اور اس کے بارے میں اتنا اختلاف بڑھا کہ اس کی جلدیں آخر میں جلا دی گئیں۔
اور وہ دوبارہ بعد ترمیم چھاپی گئی۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اُردو ترجمہ قرآن شریف
ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کو بڑا نفع پہونچا
جو قرآن شریف کو ازبر بلا معنی سمجھے یاد کر لیا کرتے تھے اس سے پیشتر جس قدر ترجمے قرآن
شریف کے ہوئے تھے اُن کی زبان قدیم تھی اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ
تھا اسی وجہ سے مقبول عام نہ تھا مولانا نے چار عالموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و
جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا۔ مگر اس میں اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ
ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے بیجا تصرّف
سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ نہیں
رہتا۔ بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں انہوں نے ادعیۃ القرآن۔ وہ سورہ
اور الحقوق والفرائض تصنیف کیں جن میں سے آخر الذکر ایک بہت جامع اور مکمل کتاب
ہے۔ ان کی آخری تصنیف جو نامکمل رہ گئی "مطالب القرآن" ہے یہ اب چھپ گئی ہے۔
مولانا کے پاس ایک مطبع بھی تھا جس کا نام شمسی پریس تھا۔ اسی میں ان کی تصانیف
چھپا کرتی تھیں۔

اخلاقی ناول | سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی ان کا ناول
مراۃ العروس ہے جو ایک معزز مسلمان خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔

اس کی تصنیف اس وقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قصہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعہ سے کیونکر بدل گئی۔ یہ کتاب مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں مقبول ہے اور عورتیں اس کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اس قدر صحیح اور بامحاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے۔ اس کتاب کو پبلک میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار جلدیں خریدکیں اور ایک ہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں میں ہو گیا ہے۔ دوسری کتاب "بنات النعش" ہے جو مراۃ العروس کے بعد اور اسی طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے لکھی گئی۔ اس میں بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتیں عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق اکثر جگہ مکالمہ کی صورت میں درج ہیں۔ اس کی بھی پبلک اور گورنمنٹ دونوں نے بڑی قدر کی۔ اس کے بعد "توبۃ النصوح" کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مختصر طور پر انہوں نے قصہ کے طریق پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک فاسق و فاجر شخص جس کا نام نصوح ہے، سخت ہیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایک خواب دیکھتا ہے، اس کے بعد بیدار ہو کر خوف خداوندی سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر تمام منہیات سے توبہ کر لیتا ہے۔ اس کی بیوی اور بعض اور اعزہ بھی اس کے ہم خیال ہو جاتے ہیں مگر اس کا بڑا لڑکا اس کی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں مولانا نے ضمناً اولاد کی بری اٹھان کے برے نتیجے اور کمسنی میں ان کی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے۔ "ابن الوقت" میں ایک ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدمات کے صلے میں ایک بڑے عہدہ تک پہونچ جاتا ہے۔ اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انہیں کی طرز معاشرت اختیار کر لیتا ہے اور یوروپین سوسائٹی میں شامل ہو کر اپنے ہندوستانی عزیزوں اور دوستوں کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر بعد کو جب اس کے انگریز دوست سب چلے جاتے ہیں تو وہ کدھر ہی کا نہیں رہتا اور آخر کار بڑی دقت سے پھر اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگوں میں ملنے کی کوشش کرتا ہے اس کتاب کی نسبت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مصنف نے خود اپنی ہی سرگزشت ایک افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے "ایامیٰ" میں انہوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے۔ اور ہندوستان میں ان کی افسوسناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازدواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے "محصنات" میں تعداد ازدواج کا

نقصان دکھایا ہے "رویائے صادقہ" میں اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقائد کی بحث ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا سب کتابیں نہایت اخلاق آموز اور نصیحت خیز ہیں۔

لیکچر اور تقریریں | ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنی تقریریں اور لیکچر شروع کر دیئے تھے ہمارے خیال میں آپ کا پہلا پبلک لیکچر ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا۔ وہ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں پُر زور تقریریں کرتے تھے۔ سر سید مرحوم کے اثر سے وہ ہر اسلامی اہم اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پر مغزہ تقریروں سے محظوظ کرتے تھے وہ نہایت خوش بیان اور طلیق اللسان مقرر تھے اور یہ بھی ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی وسیع معلومات اور دلچسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے ظرافت آمیز طرز بیان سے سامعین کو بہت محظوظ کرتے تھے ان کا مجموعہ لیکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین پر مشتمل ہے اس میں عقائد مذہبی تعلیم و حریت نسواں وغیرہ پر نہایت مبسوط بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے | آخر عمر میں شاعری نے بھی طبیعت کو گدگدایا تھا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے لیکچروں کو اپنے اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ہم نہایت ادب سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت ان میں مطلق نہ تھی تدریجاً کچھ کلام میں ترقی ضرور ہوئی مگر اصلی جذبات شعریہ سے وہ ہمیشہ دُور رہے۔ ان کا منظوم کلام چھپ گیا ہے اور مجموعہ بے نظیر کے نام سے موسوم ہے مگر اس سے ان کی قابلیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

اخلاق و عادات | مولانا نہایت سادہ مزاج مہذب اور بہت ظریف الطبع تھے۔ زندگی نہایت سادگی بلکہ عسرت سے بسر کرتے تھے اسی وجہ سے جذرس مشہور تھے۔ مگر پھر بھی بعض بعض غریب طلباء کی امداد بہت فراخدلی سے کرتے تھے آخر عمر میں روپیہ جمع کرنے کے شوق میں تجارت شروع کر دی تھی جس سے ان کی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا تعلیم و تعلم کے وہ اس قدر شائق تھے کہ مرتے دم تک یہی اشتغال جاری رکھے جاتے۔ علی گڑھ کالج کے وہ پرانے سرپرست اور معاون تھے۔ ۱۸۹۶ء میں خطاب شمس العلماء ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کی طرف سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او۔ ایل یعنی ڈاکٹر آف اورنٹیل لرننگ (عالم علوم مشرقیہ) کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب نے جو بحیثیت چانسلر جلسہ کانووکیشن کے صدر تھے ڈگری

دیتے وقت ان کے علم و فضل اور طباعی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف و سادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ بے آتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنایع بدایع سے اور بعض موقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ آزاد کی سی لطافت اور شیرینی ان کے یہاں نہیں ہے۔ البتہ خاص چیز جو ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ہے وہ ان کا ظریفانہ رنگ ہے جو ان کے ناول لیکچر اور مضامین سب میں بدرجہ اتم موجود ہے ان کی ظرافت ہمیشہ ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑ پن مطلق نہیں ہوتا۔ مولانا اپنے تمام معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لے گئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ تو انہیں کے تراجم سے وہ گورنمنٹ اور پبلک میں روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں میں ان کی شہرت ہوئی۔ اور ناولوں وغیرہ کی وجہ سے ہر گھر میں ان کا نام پہنچ گیا۔

مولوی ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ قدیم دلّی کالج کے مشہور شاگردوں میں تھے اور خود انہوں نے اپنی زندگی بچوں کی تعلیم و ترقی کے لئے وقف کر دی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا اور مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے مولوی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے جہاں مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے۔ لہٰذا ان تینوں میں عمر بھر رابطہ اتحاد و محبت قائم رہا اور تینوں آدمی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ جب مولوی ذکاء اللہ کالج سے پڑھ کر نکلے تو پھر اسی کالج میں ریاضی کی تعلیم پر مقرر ہوئے جس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی و اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن میں رہ کر ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمقام بلند شہر و مراد آباد ہو گئے۔ جس جگہ پر تقریباً گیارہ سال تک رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے اور ۱۸۷۲ء میں اورنٹیل کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے۔ مگر قبل اس کے کہ اس نئے عہدہ کا چارج لیں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں عربی و فارسی کی پروفیسری ان کو مل گئی۔ جہاں سے ۲۶ برس کی ملازمت کے بعد پنشن پائی اور تقریباً چوبیس پچیس برس پنشن سے بہرہ یاب ہو کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

تصانیف | تصانیف کثرت سے ہیں ۔ اور متعدد مضامین پر مشتمل ہیں ۔ مثلاً ریاضی ۔ تاریخ جغرافیہ ۔ ادب اخلاق ۔ طبعیات ۔ کیمیا ۔ سماسیات وغیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی ۔ تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلبار کے لئے لکھی گئی ہیں ۔ ہنذا رنگینی وعبارت آرائی اور ایک ادبی شان ان میں بالکل نہیں ہے مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی داں اور مترجم اور مورخ کے مشہور ہیں ۔ مگر ریاضی میں ان کا پایہ بلند نہ تھا اور ان کی کوشش صرف انگریزی کتابوں کے ترجمے اور ان کی شرحیں لکھنے تک محدود رہی ۔ البتہ تاریخ میں انہوں نے ایک کار نمایاں ضرور کیا ۔ ان کی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ایک ضخیم کتاب اور قابل قدر تصنیف ہے گو اس میں ریسیرچ سے کم کام لیا گیا ہے اور عامتہ الناس کے لئے ہے ۔ مہمات عظیم میں ان بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے جو انگلستان اور دوسرے ملکوں میں کوئن وکٹوریہ کے عہد میں ہوئی تھیں ۔ ان کی ایک اور بھی عمدہ تصنیف ہے ۔ جس میں کوئن وکٹوریہ کے عہد کے حالات اور ترقیاں درج ہیں جو تین جلدوں میں ہے " آئین قیصری میں کوئن وکٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں جو ہندوستان میں ہوئیں اور فرہنگ فرنگ میں یورپین شائستگی کی تاریخ اور کوئن وکٹوریہ اور ان کے شوہر کی زندگی کے حالات درج ہیں ۔ مولوی سمیع اللہ خان بہادر ۔ سی ایم جی کی سوانحعمری بھی ان کی تصنیف ہے آخر عمر میں ایک تاریخ اسلام لکھنے میں مشغول تھے مگر وہ ناتمام رہی ۔ ان تمام کتابوں کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی اور تصنع سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولوں میں پڑھانے کے قابل ہیں ۔

مولوی صاحب میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور جرائد اور رسالوں کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے ۔ مثلاً تہذیب الاخلاق ۔ سائنٹیفک گزٹ علیگڑھ ۔ رسالہ حسن ۔ ادیب فیروز آباد ۔ مخزن زمانہ ۔ خاتون وغیرہ ان کی کثیر التصانیفی پر مولانا حالی نے یہ پھبتی کہی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے ۔ جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے ۔ ممکن ہے اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنیے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں ۔

گورنمنٹ نے ان کے علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی ترقی تعلیم نسواں کی کوششوں کے صلے میں ان کو ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر و شمس العلماء عنایت ہوا ۔ مولوی صاحب سرسید مرحوم کے گہرے دوستوں میں تھے اور ان کے تمام تعلیمی کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے ۔

مولوی سید احمد دہلوی[1] مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اردو لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اردو داں پبلک میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دلّی میں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام حافظ سید عبدالرحمٰن تھا جو مستند سادات سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے موافق دیسی مکتبوں میں ہوئی۔ جب کچھ حرف شناس ہوگئے تو سرکاری سکول اور نارمل سکول میں تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد اپنی فطری طباعی اور مشاہیر اہل علم کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک چھوٹی سی فارسی نظم ''طفلی نامہ'' کے نام سے اور ایک انشا کی کتاب ''تقویۃ الصبیان'' لکھ ڈالی۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب ''کنز الفوائد'' نکلی جس پر سرکار سے دو سو روپیہ انعام ملا۔ ۱۸۶۸ء سے انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے مسالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں ان کی دوسری کتاب ''وقائع درونیہ'' شائع ہوئی جس پر ان کو مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام ملے۔ اس رقم سے ان کی فرہنگ آصفیہ کی تیاری میں کچھ آسانیاں ہوگئیں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر فیلن صاحب نے جو صوبہ بہار میں انسپکٹر مدارس تھے ان کو بلا بھیجا اور اپنی اردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری میں ان سے مدد لینا چاہی۔ مولوی صاحب راضی ہوگئے اور فیلن کی ڈکشنری سات برس کی محنت شاقہ کے بعد ختم کی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں انہوں نے مہاراجہ الور کا ایک سفرنامہ مرتب کیا۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری بکڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ فیلن صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانے میں انہوں نے اپنی کتاب ہادی النسا شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ان کی حسب ذیل تصنیفات شائع ہوتی رہیں جو اپنے طرز میں سب نہایت عمدہ اور مفید ہیں:۔

''تکمیل الکلام'' پیشہ وروں کے اصطلاحات میں۔

''تحقیق الکلام'' اردو زبان کے نکات کے متعلق۔

''رس کھان'' جس میں کچھ ہندی دوہے اور پہیلیاں اور گیت ہیں۔

''ریت بکھان'' اہل ہنود کے رسم و رواج کے متعلق۔

---

[1] وفات ۱۹۱۹ء۔ (مرتب)

"ناری کتھا" ہندو عورتوں کی بولی۔

قواعد اُردو۔ تعلیم نسواں اور عورتوں کے متعلق ان کی حسبِ ذیل کتابیں بہت مشہور ہیں:-

لغات النساء، تحریر النساء، لڑکیوں کی ریڈر، "بی راحت زمانی کا قصہ" عورتوں کو وقت کی قدر و قیمت سکھاتا ہے۔ "اخلاق النساء" بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق "علم النساء" زبان اور اس کی ترقی کے متعلق۔ "رسوم دہلی" جس میں دہلی کے مروجہ رسوم و رواج کا ذکر ہے۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں سیر شملہ جس میں شملہ کی تاریخ بھی داخل ہے۔ "اُردو ضرب الامثال"، "روزمرہ دہلی"، "رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی"۔ ان میں سے بعض اب شائع ہو رہی ہیں۔

فرہنگ آصفیہ | اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتوں اور پریشانیوں کے متعلق مصنف نے دیباچہ میں بہت طول دے کر لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف کے چھاپنے کے لئے ایک زرِ کثیر کی ضرورت تھی جس کی فراہمی سخت مشکل تھی۔ بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۶ء میں سر آسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہاں مولوی صاحب بھی کسی سکول میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے وزیرِ اعظم حیدرآباد کی خدمت میں حضوری حاصل کر کے اپنا مسودہ بطور نذر کے گزرانا جو سید علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا۔ جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا اور اس کے سلسلے میں مصنف صاحب کو حیدرآباد متعدد دفعہ جانا پڑا۔ آخر کار وہ اپنی امیدوں میں کامیاب ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن اور پانچ ہزار انعام دیا گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اُس کی قدر افزائی میں بہت کچھ حصہ لیا۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اردو کی کتب میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے۔

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء
تعلیم اور ابتدائی مشاغل

مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے۔ نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مورّخ، ناقد، ماہرِ تعلیم، معلّم واعظ، ریفارمر، جریدہ نگار، فقیہ، محدّث، سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انہوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے ؎ وَلَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِی الْوَاحِدِ

نگران سب میں ادب، تاریخ اور ریسرچ میں ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۸۵۵ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ (جو وکیل تھے)، کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑھیں اور جب عربی و فارسی میں کچھ دستگاہ ہوگئی تو مولانا فاروق چریاکوٹی کے سامنے جو اس وقت غازی پور میں ہیڈ مولوی تھے اور فلسفہ و ریاضی و ادب وغیرہ کے استاد مانے جاتے تھے زانوئے شاگردی تہ کیا انہیں سے انہوں نے عربی ادب اور معقولات پڑھی تھیں۔ پھر جذبۂ شوق نے اُبھارا اور تلاش علم کے واسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رامپور پہونچے جہاں استاد زمانہ مولوی عبد الحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اسباق لئے۔ لاہور میں ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا۔ وہاں سے سہارنپور آئے اور تکمیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی۔ ۱۸۶۷ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی۔ عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستے میں وفور شوق اور جوش عقیدت سے ایک پُر زور قصیدہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے[1]۔ اس زمانے میں رودہا بیہ میں

---

[1] مولانا میرے حال پر ایک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے۔ مجھ کو ان کے اس استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید واقعہ یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر "پیام یار" مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے ان کی چوک میں عطر کی دوکان تھی۔ جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا۔ جس میں مولوی عبد الحلیم شرر۔ شوق قدوائی۔ لڈن صاحب، خورشید۔ اکو صاحب جلیس۔ سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔ وزیر قنوجی کی خوش ذائقہ گلوریوں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کی جاتی۔ کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون والے عینک لگائے آنکھیں مچکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہوجاتے اور اپنی پرلطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے۔ ایک دن جبکہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی وقت ۸ بجے شام۔ چوک میں بڑا مجمع تھا۔ تعزیے مع جلوس و باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی۔ (باقی صفحہ ۴۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

بھی کچھ رسالے لکھے جن میں "اسکات المعتدی" جو عربی میں ہے زیادہ مشہور رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے امتحان وکالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور لبنی میں کچھ دنوں وکالت بھی کی تھی اور آخرکار جب اس پیشے سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی چند دنوں کی تھی اور کہیں کے امین ہو گئے تھے۔ چند دنوں کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اب ہمہ تن خدمت علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے کے لئے جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں بتوسط خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خان سے ملے جن کے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کی جگہ کے واسطے جو اس وقت خالی تھی گزرانی، جو منظور ہو گئی اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی۔

قیام علیگڑھ

علیگڑھ کالج کی اُس زمانے کی فضا اس گل سرسبد کی شگفتگی کے لئے بہت مفید ہوئی۔ ارباب کمال مثلاً سرسید اور مولانا حالی وغیرہ کی صحبت اور سرسید کے کتب خانے کی قربت سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ علیگڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی مولانا نے اُن سے فرینچ سیکھی اور ان کو عربی سکھائی۔ جس طرح سے مولانا نے نکات تنقید بطرز اہل مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کئے ہوں گے۔ اسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کی اکثر باتوں کے لئے مولانا کے ممنون ہیں۔

ابتدائی تصانیف

غالباً علیگڑھ ہی میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان و شوکت اور اکابر سلف کے زرین کارنامے قلمبند کئے جائیں۔ اس مبارک کام پر سرسید نے بھی اُن کی ہمت افزائی کی یہاں سرسید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جس میں دور دراز مقامات مصر و شام تک کی مطبوعہ کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ۱۸۸۳ء میں مثنوی صبح اُمید کا ستارہ مولانا کے افق تصنیف پر جلوہ گر ہوا۔ جس میں اسلام کی شان و شوکت

بقیہ حاشیہ: سب لوگ اس سیر میں مشغول مگر مولانا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلے میں جو کسی کاتب سے لکھائی تھی، اس قدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے، یہاں تک کہ پوری کتاب ایسی حالت میں دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم۔

موجودہ مسلمانوں کی نکبت و فلاکت اور ان کے اُبھارنے کے لئے سرسید کی کوششوں کا ذکر نہایت پُرزور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں اس قدر مقبول اور علیگڈھ کالج کے طلبار کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" جو ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پڑھی گئی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ جس سے لوگوں کو مولانا کی تاریخی معلومات اور تبحر علمی کا پورا پتہ معلوم ہوا۔ اب دنیائے تصنیف میں ان کی شہرت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتب کی جائے اور اس کا نام "ہیروز آف اسلام" "مشاہیر اسلام" انگریزی کی تقلید میں رکھا جائے اس سلسلے میں انہوں نے "المامون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی اور "الفاروق" شروع کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۲ء میں سفر روم و شام اختیار کیا۔ جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے اور انہوں نے قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر یہ غرض تھی کہ "الفاروق" کی تیاری کے واسطے صحیح اور معتبر ماخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سفر سے واپسی کے بعد ان کا "سفرنامۂ روم و شام" نکلا جس میں پورے سفر کے حالات نہایت دلچسپ طریقے سے قلم بند ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب کہ سرسید کا انتقال ہو گیا تو مولانا بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کر لیا اور اعظم گڑھ گئے۔ اب وہ "الفاروق" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی جس کا افتتاح ۱۸۸۳ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں سفر کشمیر پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہاں مولانا بیمار ہو گئے اور اسی حالت میں "الفاروق" اختتام کو پہونچی۔

قیام حیدرآباد مولانا کا سفر حیدرآباد نواب وقار الامرا کی وزارت کے زمانے میں ہوا تھا سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمۂ تعلیم بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے جو بعد کو تین سو روپیہ ہو گیا تھا۔ مولانا یہاں چار برس رہے اور اس زمانے میں انہوں نے محکمۂ تعلیم میں بہت کچھ ترقیاں کیں اور اس کے ساتھ اپنا سلسلۂ تالیف و تصنیف بھی برابر جاری رکھا۔ سید علی بلگرامی نے جو سلسلہ "کتب آصفیہ" کا جاری کیا تھا اس میں مولانا کی بھی بعض کتابیں شامل ہیں۔ اسی قیام حیدرآباد کے عرصہ میں جب کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا۔ مولانا نے حیدرآباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کی اسکیم تیار کی تھی۔ اور "الغزالی" "سوانح مولانا روم" "الکلام" "علم الکلام" اور "موازنۂ انیس و دبیر" یہ سب

اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔

ندوۃ العلماء | ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ہوا تھا اس کے قیام کی غرض اصلی یہ تھی کہ عربی مدارس کے لئے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر بنایا جائے۔ نیز یہ کہ مسلمانان ہندوستان کے آپس میں یا ان کی جماعتوں میں جو جو اختلافات ہیں وہ رفع کئے جائیں۔ اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبد الغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری، خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور ناظم اول تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبد الحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کئے اکابر قوم مثلاً سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک سو روپیہ ماہوار ندوہ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت میں ایک مدرسہ کھولا جائے جو ضروریات وقت کا لحاظ رکھ کے طلباء کو تعلیم دے سکے چنانچہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں اسی تجویز کے موافق دار العلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھول دیئے گئے۔ اور ۱۸۹۹ء میں رؤسائے شاہجہاں پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطریق وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی جس کو ندوۃ العلماء نے ٹھیکہ پر دیدیا ہے اور مبلغ سات سو روپیہ سالانہ اس کی آمدنی سے ملتا رہتا ہے ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی۔ جس میں تقریباً دس

لہ مقاصد ندوۃ العلماء جو مسودہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔

(۲) علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے رد و قدح کا پورا پورا انسداد۔

(۳) عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کے تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہیں۔

(۴) ایک عظیم الشان اسلامی دار العلوم قائم کرنا جس میں علوم و فنون کے سوا عملی صنائع کی بھی تعلیم ہوگی۔

(۵) دینی امور میں فتوے دینے کے واسطے محکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہوں گے۔ ۱۲

ہزار کتابیں داخل ہو چکی ہیں اور علاوہ مطبوعات یورپ، مصر، قسطنطنیہ، ٹونس، طہران وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابیں قلمی اور اکثر نادر الوجود ہیں جو مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا مصنفین کے قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں اور ان پر نامور علمار کے دستخط موجود ہیں۔ اس نوبت پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ سر انٹونی میکڈانل جو اس وقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ ندوہ کے سخت مخالف ہو گئے اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر نگاہ شک سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے اسی وقت نکلے اور ندوہ کے مقابلے پر ایک جنگجو جماعت جدیدہ قائم کی گئی جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔ بوقیکہ جب لاٹ صاحب ولایت چلے گئے تو مولانا شبلی حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلمار کے ابتر انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دل میں جو بدگمانیاں اور شکوک اس کی طرف سے پیدا ہو گئے تھے ان کے رفع کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اس کام میں کرنل عبدالمجید خان صاحب نے بھی ان کی بڑی مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اس وقت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا نے اس کو درست کرنے کے لئے اکثر دیسی ریاستوں کا سفر کیا اور رام پور سے مبلغ پانچ سو روپیہ سالانہ اور بھوپال سے مبلغ ڈھائی سو روپیہ سالانہ اعانتی رقمیں مقرر ہوئیں اسی طرح ہز ہائینس آغا خان نے پانچسو روپیہ سالانہ اور نواب صاحب بہاول پور کی جدۂ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت کے واسطے عنایت کئے[ل] گورنمنٹ نے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ آراضی دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں دار العلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انگریزی زبان اور علوم دنیوی کے لئے دینا منظور فرمایا۔ سر جان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دار العلوم کا سنگ بنیاد

[ل] "دار العلوم ندوۃ العلمار کی گزشتہ تاریخ" مطبوعہ ۱۹۰۲ء میں ندوۃ العلمار کی جو مالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے ندوۃ العلمار کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے:-

(۱) بھوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جو ماہ بماہ ملتا ہے۔

(۲) بہاولپور سے وظائف کی مد میں تین سو روپیہ سالانہ۔

(۳) مسلمانان مدراس سے تقریباً دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلبار غیر مستطیع کو مدد دی جاتی ہے۔

(۴) دولت آصفیہ حیدرآباد دکن سے تقریباً سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لئے۔ ۱۲

۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کو رکھا۔ اس طرح مولانا کی کوششیں بارور ہوئیں مگر آپس کی نزاعیں ہنوز قائم رہیں کیونکہ علماء کا آپس میں متحد الخیال ہونا سخت مشکل کام تھا۔ وہ لوگ مولانا پر بوجہ ان کی آزاد خیالی کے پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا کچھ بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ سے چلے گئے اور اعظم گڈھ میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اسی اثنا میں ایک نہایت افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا کی ٹانگ ایک اتفاقیہ گولی کے لگ جانے سے زخمی ہوئی اور آخر کار مجبور ہو کر اس کو کاٹنا پڑا۔

ندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دیں گو کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی وہ تکمیل کو پہونچیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بہت قابل تعریف ہیں۔ سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا کہ قدامت پسند عالموں میں جو ضروریات زمانہ سے بے خبر تھے ایک بیداری پیدا کر دی اور ان کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان کا قدیم نصاب بدل کر موجودہ زمانے کی ترقیوں کے حسب حال بنایا جائے۔ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کی جائے۔ غیر مفید کتابیں اور علوم موقوف کئے جائیں اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ندوہ نے یہ کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قیمتی قلمی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت

لہ عزیز محترم عالیجناب نواب صفی الدولہ سید علی حسن خان بہادر عرف علی میاں صاحب جن سے مولانا مرحوم سے ربط محبت و یگانگت بہت بڑا ہوا تھا اور جن کی نظر سے یہ مضمون گزر چکا ہے فرماتے تھے کہ قیام دار المصنفین کے متعلق میں نے مولانا کو نیم راضی کر لیا تھا کہ لکھنؤ میں کھولا جائے مگر ان کی خواہش تھی کہ اس کا تعلق ندوہ سے نہ ہو اور یہ ایک بالکل علیحدہ چیز رہے۔ اس کے واسطے بعض مواقع لکھنؤ میں دیکھے گئے اور مولانا نے دو ایک جگہوں کو پسند بھی کیا۔ پھر مولانا بمبئی تشریف لے گئے میں بھی وہاں موجود تھا وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سن کر دفعتاً الہ آباد ان کو آنا پڑا یہاں سے وہ بضرورت اعظم گڈھ گئے اور مجھ کو لکھا کہ دار المصنفین یہاں قائم کرنے کا ارادہ ہے اس کے افتتاح میں تم بھی شریک ہو میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اس کے واسطے وقف کر دیا ہے اور بعض اور لوگوں نے اپنی جائدادیں دی ہیں میں نے کہا کہ بہت بہتر ہوتا کہ دار المصنفین لکھنؤ میں قائم ہوتا۔ ہنس کر فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے یہاں اس کو بالفعل رہنے دیجئے جب موقع آئے گا تو لکھنؤ میں منتقل ہو جائے گا۔ (مترجم)

ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں میں مشہور ہو گئی ہیں، ان کو رفع کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے قانون وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر پیش آ جاتے ہیں ان پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا جس کا اثر ممالک دور دراز تک پر پڑا۔ ایک خاص رسالہ "الندوہ" بہ ادارت مولانا شبلی و مولوی حبیب الرحمن صاحب شیروانی نکالا گیا جس میں نہایت عمدہ اور قابلیت کے مضامین شائع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم پہونچا اس کی تلافی اب بہت مشکل ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ[1] لکھنؤ سے واپسی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوب اور مایۂ ناز تصنیف "سیرۃ النبی" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور شعرالعجم کا پانچواں حصہ بھی اسی وقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقوں میں تھے نیز مصنفین کی ایک جماعت قائم کرنے کا خیال جو بہت عرصہ سے ان کے دل میں جاگزیں تھا خدا خدا کر کے وہ اب پورا ہوا۔ جس کے واسطے انہوں نے اپنی ذاتی جائداد یعنی ایک مکان اور باغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اس کے علاوہ ندوہ میں ایک درجۂ تکمیل بھی کھولا جس میں عربی و فارسی کے منتہی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

قابلیت اور خدمات کا اعتراف ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی ان کو عنایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے ایک معزز رکن تھے۔ مثلاً ترقی علوم مشرقیہ کی کمیٹی جو بہ مقام شملہ سرہارکورٹ بٹلر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اردو

---

[1] ندوہ سے الگ ہونے کے بعد شبلی نے دارالمصنفین کا خاکہ تیار کیا مگر اپنی زندگی میں اسے عملی طور پر تشکیل نہ دے سکے۔ ادارہ کا کام ان کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ ۴ جون ۱۹۱۵ء کو ادارہ رجسٹرڈ ہوا اور عمادالملک اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ادارہ کی منصوبہ بندی اور تنظیم شبلی کے نظریات اور پروگرام کے مطابق کی گئی۔ اسلامی علوم کی تعلیم کے علاوہ یہاں طلبہ کو فن تصنیف و تالیف کی تربیت دینے کا انتظام بھی کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا، بلند پایہ کتب کی تصنیف و تالیف اور ان کی اشاعت، اسلامی علوم و فنون پر تحقیق، مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت پر تحقیق اور فارسی و عربی انشاء پردازی کی تاریخ مرتب کرنا اس کے مقاصد میں تھا۔ ادارہ کے انتظامی امور کے لئے مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ بنائی گئی۔ دارالمصنفین آج بھی بڑی تندہی سے مذکورہ بالا مقاصد کے مطابق اشاعتی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ (مرتب)

ہندی اور کمیٹی اتحاد ہندو مسلم جس کو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات مولانا شبلی ایک نہایت سچے اور راستباز خلیق و متواضع آدمی تھے ان کی ایک زبردست شخصیت تھی۔ گفتگو نہایت شیریں اور دلچسپ اور دلچسپ اور پر از معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اور جو کچھ ملتا تھا نہایت آزادی سے خرچ کرتے تھے ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں۔ جن میں حسب ذیل مشہور ہیں:-
سیرۃ النبی (صرف دو جلدوں کی تکمیل کر سکے) شعر العجم پانچ حصے۔ الفاروق۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الغزالی۔ الکلام۔ علم الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنۂ انیس و دبیر سفرنامۂ روم و مصر و شام۔ اورنگ زیب عالمگیر۔ الجزیہ۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ تاریخ اسلام و فلسفۂ اسلام۔ حیات خسرو۔ تنقید جرجی زیدان۔ مقالات شبلی۔ مکاتیب شبلی۔ رسائل شبلی۔ (نظم میں) دیوان شبلی اور دستۂ گل۔ مثنوی صبح امید۔ مجموعۂ نظم اردو۔

مولانا بحیثیت مورخ کے مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں پیش کیا اور ایسے دلچسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں اور ہر نظر میں وہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ اس کی تالیف میں انتہا کے تجسس و تلاش اور عمیق مطالعہ سے کام لیا اور جدید طریق تنقید کے موافق غیر معتبر اور بیکار چیزوں کو ترک کیا۔ الفاروق۔ المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ اور علی الخصوص ان کی معرکۃ الآرا تصنیف یعنی سیرۃ النبی جس کو انہوں نے ناتمام چھوڑا۔ ایسی یادگار تصانیف ہیں جو اُن کے تبحر علمی، وسیع تحقیق، عمیق مطالعہ اور بیحد کد و کاوش کا پتہ دیتی ہیں۔

مولانا بحیثیت ناقد کے مولانا علاوہ جلیل القدر مورخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے۔ شاعر شیریں مقال ہونے کے ساتھ قوت انتخاب۔ ذوق سلیم۔ رائے صائب بھی اعلیٰ درجے کی رکھتے تھے۔ اگر کسی شخص کو زمانۂ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے۔ تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہیئے۔ جس کی یکتائی پر پروفیسر براؤن ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں۔

اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحرّ علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔ "موازنہ انیس و دبیر" بھی ایک بہت بیش بہا تصنیف ہے اور گو کہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ضرور ہیں۔ آرٹیکل اور مضمون نگاری میں بھی مولانا ایک ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی اس قسم کی تحریریں نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس میں نہایت مفید اور کارآمد باتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہیں جن سے ان کے ذاتی حالات اور نیز ان کے معاصرین اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ "مقالات شبلی" اور "رسائل شبلی" ان کے اخباری مضامین کا اور "مکاتیب شبلی" ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

طرز تحریر مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی عبارت میں کبھی گنجلک نہیں ہوتی۔ اس میں ایک خاص چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔ سرسیّد مرحوم مولانا کو ان کے طرز تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دلّی دونوں کے لئے باعث رشک ہو۔ مولانا کے یہاں صنائع بدائع اور عبارت میں تکلیف بہت کم ہوتا ہے اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت اور زور بیان مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مختلف انواع تحریر کے لئے مولانا اسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں۔ بعض تکلیف پسند طبیعتوں کو مثلاً وہ جن کی زبان کو آزاد کی اردو کا چٹخارہ ہے ممکن ہے کہ مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے۔ جو کہ دور موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ بحیثیت ایک مورخ اور ناقد کے بہت بلند ہے۔ انہوں نے اسلامی تمدن کی توسیع و اشاعت میں بڑا حصّہ لیا۔ ان میں ہم نیشنلزم کی نئی روح جلوہ گر دیکھتے ہیں اور یہ ان میں سب سے بڑا کمال ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے روح رواں اور دارالمصنفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانے کی نمایاں ہستیوں اور بلند شخصیتوں میں تھے۔ اور دراصل انہیں کی روحانی برکت ہے جو دارالمصنفین کی مساعی جمیلہ کی کامیابی کا باعث ہے۔ اُن کے لائق شاگردوں سے ابدالآباد تک اُن کا نام روشن رہے گا۔

سید سلیمان ندویؒ | مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے جید فاضل ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم ان سے اپنی زندگی میں بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظر شفقت و عنایت اُن پر رکھتے تھے اور اسی وقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے اُن کے اور شاگردوں سے ممتاز تھے۔ انہوں نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور بالفعل انہیں کی نگرانی اور اہتمام میں حلقہ دار المصنفین عربی اور فارسی کی نایاب کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہیں جو زبان اُردو کا مشہور مجلّہ علوم اہل اسلام کی اشاعت کے لئے مخصوص ہے اور اس کے مضامین سے اُن کی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق علمی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا دار المصنفین اور معارف دونوں کی روح رواں ہیں۔ انہوں نے بلاد اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے اور سیرۃ النبی کا بقیہ حصہ اُسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے۔ سیرۃ العائشہ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہیں۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین۔ مولانا عبد الباری۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی۔ پروفیسر نواب علی اور مولانا عبد السلام۔ دار المصنفین کے پرجوش اور معزز ارکین ہیں۔ مولانا حمید الدین صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن اور ادب عربی میں ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ مولوی عبد الباری نے برکلے کے فلسفہ کا بہت سلیس ترجمہ اُردو میں کیا ہے اور بعض اور فلسفیانہ تصانیف بھی ان کی ہیں۔ مولوی عبد السّلام اور مولوی عبد الماجد کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں:-

اس موقع پر یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ شعبۂ دار المصنفین اپنے سامنے ایک درخشندہ مستقبل رکھتا ہے اور اگر اس نے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اُردو کی تکمیل میں یہ بہت بڑا حصہ لے گا۔ مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف

ؔ سلیمان ندوی ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء کو دیسنہ ضلع پٹنہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں اسی دار العلوم میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد رہے۔ ۱۹۱۳ء میں پونہ میں السنہ شرقیہ کے استاد مقرر ہوئے۔ شبلی کی وفات کے بعد دار المصنفین کے امور میں مصروف ہوئے۔ جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے آئے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو انتقال ہوا۔ (مرتب)

میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات سے احتراز کرے تاکہ تمام بہی خواہاں اُردو کو اس سے سچی ہمدردی رہے۔ اور اسی طرح یہ بھی نہ چاہتے کہ تمام مغربی و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کرکے اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشرو اشاعت پر محدود رکھے۔

مولوی عبدالسّلام ندوی[1]

مولوی عبدالسلام صاحب کی ذات پر دارالمصنفین کو جس قدر ناز ہو کم ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً معارف میں اعلیٰ درجے کے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ اسوۂ صحابیات۔ شعرالہند حصہ اول و دوم۔ ابن یمینؒ۔ وغیرہ ان کی تصانیف[2] ہیں۔ سُنا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے۔ شعرالہند میں جو نظم اُردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے ان اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظم اُردو پر مترتب ہوئے ہیں مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کرکے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا نام اسم غیر مسمّٰے ہے نیز اس میں بعض ضروری باتوں میں فروگذاشتیں بھی ہو گئی ہیں۔ اور اکثر اُن لوگوں کا ذکر بھی نہیں جنہوں نے زبان اردو کی ترقی میں بہت کوششیں کی ہیں۔ ان اعتراضات کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں نظم اردو کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ بہرحال کچھ بھی ہو کتاب کارآمد اور مفید ضرور ہے اور مثل مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کے "گلِ رعنا" کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے اس میں بعض

---

[1] عبدالسلام ندوی ۱۶ر فروری ۱۸۸۳ء کو پیدا ہوئے، ۱۹۱۰ء میں ندوہ سے سند فضیلت حاصل کی۔ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنفین کے رفقاء میں شامل ہوئے، تمام عمر یہیں تصنیف و تالیف میں گزار دی ۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو فوت ہوئے۔ (مرتب)

[2] عبدالسلام ندوی کی مکمل فہرست کتب:

(۱) اسوۂ صحابہ دو جلد
(۲) اسوۂ صحابیات
(۳) سیرۃ عمر بن عبدالعزیز
(۴) شعرالہند دو جلد
(۵) انقلاب الامم
(۶) تاریخ فقہ اسلامی
(۷) ابن خلدون
(۸) القضاۃ فی الاسلام
(۹) تاریخ اخلاق اسلامی
(۱۰) امام رازی
(۱۱) اقبال کامل
(۱۲) حکمائے اسلام دو جلد

(مرتب)

خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔

مولوی عبدالماجد دریاآبادی مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے دریاآبادی خلف الصدق
مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر مرحوم۔ ۱۸۹۲ء آپ کا سال ولادت ہے۔ ابتدائی عربی اور
فارسی تعلیم سے گھر پر فراغت کرکے زبان انگریزی سیتاپور ہائی سکول میں پڑھنا شروع
کی اور انٹرینس پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۹۱۲ء
میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر درجہ تکمیل (پوسٹ گریجویٹ اسٹیڈینٹ) کے لئے
علیگڈھ کالج میں داخل ہوئے۔ مگر والد کے انتقال کے سبب سے وہاں زیادہ عرصہ تک
قیام نہ کرسکے۔ لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں مشغول ہوگئے
۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے تعلق ہوگیا تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ تعلق
ترک کردیا گو اب بھی گورنمنٹ نظام کے وظیفہ خوار ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے
کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہیں۔ مولانا سیاسیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور
سیاسی حلقوں میں ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار "سچ"
آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

مولانا کو ادبی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور
ہیں (فلسفہ جذبات، فلسفہ اجتماع، تاریخ اخلاق یورپ، مکالمات برکلے یعنی برکلے کی مشہور کتاب "ڈائیلاگز"
کا اردو ترجمہ، پیام امن، بحرالمحبت (مثنوی مصحفی)، زود پشیمان (ناٹک)، سائیکالوجی آف لیڈرشپ
(انگریزی میں) تصوف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین (اس میں وہ کچھ مضامین داخل ہیں
جو الناظر میں چھپے تھے)۔ مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے اور فلسفیانہ کتابیں اور
مضامین نہایت سلیس اور دلچسپ اردو میں لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے آپ
کے انگریزی کے ترجمے نہایت صاف بامحاورہ اور متین ہوتے ہیں۔ مصحفی کی مثنوی
"بحرالمحبت" جو غیر مطبوعہ تھی آپ نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے چھپوائی اور
اس پر ایک مفید اور بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ مسلک یعنی فلسفہ اور
تصوف اور سنگین اصناف سخن سے ہٹ بھی جاتے ہیں اور تفنن طبع کے طور پر ہلکی
اور سبک چیزوں کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اسی آخرالذکر صنف میں آپ کا
ڈراما "زود پشیمان" ہے جو ہر چند کہ سٹیج کے لائق نہیں مگر پڑھنے میں بہت لطیف
اور دلچسپ ہے۔ آپ کو شعر گوئی میں بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے ہیں۔ مگر
جس قدر کہتے ہیں زیادہ تر متصوفانہ رنگ میں ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف

الناظر۔ اُردو۔ ہندوستان ریویو۔ ماڈرن ریویو۔ وغیرہ یہ سب آپ کے اعلیٰ مضامین کے مرہون منت ہیں آپ کے مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتدال پسندی اور تحلیمی اور علمیت آپ کے کلام کا خاص جوہر ہیں۔ قوت تنقید آپ کو خدا تعالیٰ نے آپ کو بہت اعلیٰ درجے کی دی ہے سُنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ ملفوظات مولانا روم کو شائع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ کی ذات ادب اردو کے لئے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہونچتے رہتے ہیں

جدید علوم کی ترویج | دلی کالج کا قیام

دلی کالج کے قیام سے جدید علوم وفنون کی ترویج و ترقی میں خاص مدد ملی۔ بقول مسٹر اینڈ ریوز کے "انیسویں صدی" کے شروع میں جو ایک عجیب وغریب علمی روشنی چمکی تھی اُس کی وجہ زیادہ تر انئے نئے انگریزی علوم وفنون تھے جن کی تعلیم نے ہندوستانیوں کے واسطے ایک بالکل طلسمی منظر پیش کر دیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوگا۔ دلی کالج میں جو کیمسٹری اور فزکس (کیمیا و طبعیات) کے نئے نئے تجارب طلباء کو دکھائے جاتے تھے اُن سے وُہ نہایت مسرور بلکہ مبہوت ہو جاتے تھے اور نہیں کہہ سکتے تھے کہ آئندہ وُہ کیا دیکھیں گے۔ وُہ بے تکلف خیال کرتے تھے۔ اس جدید علمی نور نے اُس عہد کو منور کر دیا تھا۔ جس میں سلطنت مغلیہ کے دَور آخر کا کروفر اور شان وشکوہ بھی کچھ شامل تھے۔ مگر یہ روشنی تھوڑے عرصہ قائم رہ کر بجھ گئی۔ اور اُس کے فنا ہونے کے اسباب میں غدر ۱۸۵۷ء کو بڑا دخل ہے۔"

دلی کالج میں ۱۸۲۷ء میں ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور باوجود انگریزی سے مخالفت کے طلباء کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۸۳۱ء کے رجسٹروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کالج میں تین سَو طالب علم انگریزی پڑھتے تھے۔ اسکول اجمیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب وُہ ترقی کرکے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دریائے جمنا کے قریب آگیا۔ ۱۸۴۳ء میں اسکول اجمیری دروازہ سے منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا۔ چونکہ جدید تعلیم سے لوگوں میں منافرت اور مخالفت پھیلی ہوئی تھی لہٰذا اس وقت طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ بلکہ اچھے اچھے وظائف اُن میں انگریزی کا شوق پیدا کرنے کے واسطے اُن کو دیئے جاتے تھے۔ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ایک مشرقی صیغہ بھی تھا ریاضی کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبان انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ تعلیم زیادہ تر لیکچروں کی مدد سے ہوتی تھی۔ نہ کہ کتابوں سے کیونکہ کتابیں دور دراز مقامات سے آتی تھیں اور دقت سے ملتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اسوقت جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکچروں کو طلباء نہایت شوق سے سُنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے مسائل سیکھ کر اور جدید تجارب کیمیا دی و برقی و مقناطیسی اپنی آنکھوں سے

دیکھ کران کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم بالکل ایک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ پروفیسر رام چندر جو ایک زبردست شخصیت رکھتے تھے اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج اور پنڈت اجودھیا پرشاد جو دلی کے کشمیری پنڈت اور اسسٹنٹ پروفیسر تھے طلبہ کی تعلیم و ترقی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیغہ میں عربی و فارسی کی تعلیم زبان اُردو کی وساطت سے ہوتی تھی اور یہ صیغہ طلبا میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے زباندان اور ماہر کالج میں پڑھاتے تھے۔ ٹیلر صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی دونوں غدر میں مارے گئے۔

دلی کالج سے پڑھ کر مشہور مشہور لوگ نکلے جنھوں نے زبان اُردو کی آئندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ مثلاً مولوی نذیر احمد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی ذکاءاللہ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دنیاوی ترقیاں بھی ان میں سے بعض نے بہت کی ہیں چنانچہ مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہو گئے اور ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند میں نہایت مشہور و معروف زمانہ حال کے طرز کے ڈاکٹر گزرے ہیں، ڈاکٹر چمن لال عیسائی ہو گئے تھے اور غدر میں مارے گئے۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں دلی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی مجلس کھولی گئی جس کے روح رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اس انجمن کی قابل ستائش کوششوں سے اکثر مفید کتابیں تیار ہوئیں جو دلی میں چھپیں اور طلبہ کے بہت کام آئیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی سے اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں دلی کی تقلید میں اور شہروں میں بھی مثلاً آگرہ اور لکھنؤ اور بنارس میں بھی اسی قسم کی کتابیں تیار ہوئی تھیں جو انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں اور اُن کے نام بلومہارٹ نے اپنی مرتبہ فہرست میں دیئے ہیں اسی قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا کہ نثر اُردو بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو کر اس قابل ہو گئی کہ اُس میں کاروباری دنیا کی باتیں لکھی جائیں اور غیر زبانوں سے کار آمد ترجمے کئے جاویں۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے دلی میں ایک اور ادبی سوسائٹی بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سیکرٹری تھے[1] اس سوسائٹی کے انتظام میں بہت سے مفید لکچر دیئے اور نثر اُردو کا چراغ گو کہ ٹمٹماتا رہا مگر بجھا نہیں۔ آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انھیں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کر کے دیں تاکہ وہ اُن کو اُردو کا جامہ پہنائیں۔ پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

---

[1] آشوب سنہ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ دلی کالج میں تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں دلی سوسائٹی قائم ہوئی تو آپ اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سوسائٹی میں مرزا غالب۔ سر سید احمد خاں۔ علاء الدین خاں علائی اور ماسٹر رام چندر جیسے اکابرین شریک ہوتے تھے۔ سوسائٹی کے پیش نظریہ مقاصد تھے کہ ادبیات و تاریخ۔ آثار قدیمہ۔ اور دوسرے مفید علوم کی اشاعت کی جائے۔ سوسائٹی میں سرکاری احکام بھی شامل تھے۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ء تک آشوب نے سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں وہ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور کے ملازم ہوئے۔ "سرکاری اخبار" اور "اتالیق پنجاب" کے مدیر رہے۔ ۲۰ رمئی سنہ ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا۔ (حیات آشوب۔ امداد صابری)۔ (مرتب)

پروفیسر رامچندر[1] یہ قدیم دلی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے جنھوں نے قدیم دلی کالج کے انگریزی اسکول میں سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین تھے انہوں نے ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے اُن کو اہلِ یورپ کے مشہور جہندسوں میں شہرت حاصل ہوگئی تھی[2]۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا آزاد۔ مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ایسے مشہور لوگ اُن کے شاگرد تھے۔ مولوی ذکاءاللہ کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی اس وجہ سے وُہ پروفیسر رامچندر کے بہت محبوب شاگرد تھے اور اسی وجہ سے ان دونوں میں ایک فنی محبت اور ارتباط عمر بھر قائم رہا۔

پروفیسر رامچندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خوف۔ راست باز۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کے عیسائی ہوئے تھے لہذا تمام تعلقات برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں اور اسی وجہ سے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہوگئی تھی جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی رحم دل اور معاملے کے سچے تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے ان کو مطلع کیا۔ چنانچہ وہ کچھ دن ایک مکان میں چھپے رہے بعد کو بھیس بدل کر نکل گئے۔ کچھ دنوں بعد جب شہر میں امن وامان ہوگیا تو واپس آئے اور اپنی کوشش سے اپنے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلوالیا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے تھے وہ "تذکرۃ الکاملین" کے مصنف ہیں جس میں روم اور یونان کے مشہور فلاسفروں اور شعراء کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں چھپی تھی بعد کو ۱۸۸۸ء میں مطبع منشی نولکشور میں چھپی۔ اس میں بعض انگریزی شعراء اور فلسفی بعض فارسی شعراء اور بعض مشہور اہلِ ہند مثلاً والمیک شنکر اچارج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہیں۔ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت" اور "عجائب روزگار" کے بھی مصنف ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۴۷ء و ۱۸۴۸ء میں تیار ہوئی تھیں ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے اور ان کے نثر کے نمونے مولوی غلام یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" میں دیے ہیں۔

---

[1] ۱۸۲۱ء میں دہلی کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد رائے سندر لال ماتھر تحصیل دار تھے۔ رام چندر نے دلی کالج میں تعلیم پائی۔ قابلیت کی بنا پر سینئر سکالرشپ حاصل کیا۔ اسی کالج میں ۲۰ فروری ۱۸۴۴ء کو ریاضی کے ٹیچر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۸۴۵ء میں فوائد الناظرین ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالا۔ ستمبر ۱۸۴۷ء میں خیر خواہ ہند جاری کیا۔ بعد میں اس کا نام محب ہند رکھ دیا۔ انہی رسائل کے ذریعے رام چندر نے سائنٹیفک نثر کا آغاز کیا۔ ۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو عیسائی ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۸۶۶ء میں راجہ پٹیالہ کے اتالیق اور ۱۸۷۰ء میں سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر بنے ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء کو انتقال کیا

[2] ۱۸۵۰ء میں رام چندر کا رسالہ مسائل کلیات و جزئیات A TREATISE ON THE PROBLEMS OF MAXIMA AND MINIMA شائع ہوا۔ جسے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آگسٹس ڈی مارگن نے بے حد سراہا (باقی اگلے صفحہ پر)

مولوی امام بخش صہبائیؒ صہبائی قدیم دلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاق جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا اور اس زمانے میں بھی جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا ایک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے سر سید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف میں بہت مددری تھی۔ طلبہ میں بہت ہر دلعزیز تھے اور ان کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فن شعر میں استاد مشہور تھے۔ اور قلعہ کے اکثر شہزادے اور متوسلین اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ متعدد کتابیں اُن کی یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے اور اُن کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

مولوی غلام امام شہیدؒ مولوی غلام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے نام بر ورآوردہ شاعروں میں ہیں چونکہ نعت بہت کہتے تھے اس وجہ سے مداح نبیؐ اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور ہیں قتیل و مصحفی سے اصلاح لیتے اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ الہ آباد میں پیش کار تھے۔ ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد ریاست حیدر آباد سے ایک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر عمر تک ملتی رہی۔ نواح لکھنؤ۔ حیدر آباد دکن۔ مراد آباد۔ رام پور اور آگرہ میں کثرت سے شاگرد چھوڑے۔ سر سالار جنگ اول۔ نواب کلب علی خاں اور دیگر روسا عہد اُن کی بڑی عزت کرتے تھے "مجموعہ میلاد شریف" "انشائے بہار بے خزاں" اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں: تاج گنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر میں انھوں نے خوب لکھا ہے۔

منشی غلام غوث۔ بیخبرؔ خواجہ غلام غوث بے خبر کا اصل وطن کشمیر تھا جہاں ان کے بزرگ معزز عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان کے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت اور وہاں سے نیپال آئے جہاں خواجہ غلام غوث کی ولادت سنہ ۱۲۲۴ھ میں ہوئی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی میں جبکہ ان کی عمر صرف چار برس کی تھی بنارس آئے یہاں کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے سنہ ۱۸۴۰ء میں اپنے ماموں خان بہادر مولوی سید محمد خاں کی ماتحتی میں جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہو گئے وہ لارڈ النبرا گورنر جنرل کی ہمراہی میں قلعہ گوالیار کی جنگ میں بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ ایک اعزازی خلعت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے ماموں کے انتقال کے بعد

(بقیہ حاشیہ)

انھی کی سفارش پر ۱۲ فروری ۱۸۵۹ء کو دلی کی ایک خاص تقریب میں رام چند کو خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپیہ نقد ملا۔ یہ رسالہ مسٹر مارگن کے مقدمہ کے ساتھ لندن سے ۱۹۵۸ء میں دوبارہ چھپا۔ (مرتب)

۱؎ وفات ۱۸۵۷ء

۲؎ وفات ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء (مرتب)

۳؎ اشاعت ۱۸۹۹ء۔

ان کے عہدۂ میر منشی پر فائز ہوئے جہاں عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام انجام دے کر ۱۸۸۵ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے بہت سے انعامات اور خلعت اور طلائی تمغۂ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بہت سے

انعامات اور خلعت اور طلائی تمغۂ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بڑے دوستوں میں تھے چنانچہ مرزا کے اکثر دلچسپ خطوط ان کے نام "اُردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں موجود ہیں۔ "فغان بیخبر" اور "خونناب جگر" اُن کی گراں بہا تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں کبر سنی میں انتقال ہوا۔ ان کی تقریظ شہید کی "بہار بیخبران" پر پرانے طرز اور خوشامدانہ رنگ میں ہے۔ خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ مگر تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برتتے تھے۔

شمس العلماء سید علی بلگرامیؒ | شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ بلگرام کے ایک مشہور خاندان کی آپ یادگار تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں ایک نمایاں شہرت [illegible] علیگڑھ سے تعلیم ختم کر کے تکمیل کے لئے انگلستان گئے۔ جہاں آپ نے ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت اور ناموری حاصل کی۔ آپ کے اخراجات سفر کے متکفل سر سالار جنگ بہادر تھے آپ کو مختلف زبانیں سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ عربی و فارسی و سنسکرت میں کامل مہارت حاصل کرنے کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانیں اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانیں مثلاً بنگلہ مرہٹی تلنگی خوب جانتے تھے آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی مشہور کتب "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" سے ہے۔ جس میں اول الذکر فرنچ، مستشرق لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک ڈاکٹری کی کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علی گڑھ کالج کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ آپ مذکورہ

دونوں کتابوں کی وجہ سے مصنفین زبان اُردو کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپ کی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہیں۔

سید حسین بلگرامی | آنریبل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مذکورۂ بالا کے برادر بزرگ ہیں اور گو کہ علمی اور ادبی قابلیت میں چھوٹے بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہوں مگر پبلک اور سیاسی زندگی میں نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہے آپ

ولادت ۱۸۵۱ء
وفات مئی ۱۹۱۱ء۔ (مرتب)

ایک عرصۂ دراز تک حیدر آباد دکن میں دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدوں پر ممتاز رہ کر سکریٹری آف سٹیٹ ہند کی کونسل میں منتقل ہو گئے۔ افسوس ہے کہ آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی معرکۃ الآرا یادگار نہیں چھوڑی۔ صرف چند مضامین اور وہ ایڈریس جو علیگڈھ ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھے گئے تھے اور "رسائل عماد الملک" کے نام سے چھپ گئے ہیں ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں یہ کتاب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اس کے اکثر مضامین سے علی الخصوص ترقی تعلیم کے مضامین سے آپ کی قیمتی رائیں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ "ہوا اور پانی" کا مضمون علی الخصوص بہت عمدہ اور قابلِ قدر ہے اور سائنٹفک ہونے کے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہے۔ دائرۃ المعارف کا قیام جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابوں کا شائع کرنا ہے آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے آپ نے بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمے پر بھی صرف کیا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا۔

مولوی عزیز مرزا | مولوی عزیز مرزا بی۔ اے۔ اس زمانے کے نہایت قابل اور مشہور جانثاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں علیگڈھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدر آباد میں ملازمت اختیار کی۔ یہاں مختلف جگہوں پر رہنے کے بعد ہوم سیکرٹری کے جلیل القدر عہدے کے فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی اتنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغل علمیہ میں صرف ہوتا تھا۔ تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کے انگریزی سفر نامہ انگلستان کا ترجمہ جو "گلگشت فرنگ" کے نام سے مشہور ہے (۲) شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں کے حالات زندگی موسوم بہ "سیرۃ المحمود"[1] (۳) کالی داس کا مشہور ڈراما "وکرم اروسی" کا اُردو ترجمہ جس کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے۔ جس میں سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں۔ ان کو پرانے سکّے جمع کرنے کا بھی شوق تھا چنانچہ اُن کا مجموعہ سکہ جات بہت اعلےٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد اور اخبارات میں جو مضامین لکھتے تھے وہ "خیالات عزیز" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ ان کو بھی علیگڈھ کالج کی ترقی بلکہ عموماً مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہو گئے تھے تھے۔ جس میں نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ طرز تحریر نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا لفاظی اور تطویل سے بہت بچتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور نثر نگاروں میں خیال کئے جاتے تھے۔

---

[1] اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عکسی تصاویر اور نقشوں کے ساتھ مصنف مرحوم کے لائق فرزند کی طرف سے نظامی پریس بدایوں سے حال میں شائع ہوا ہے۔ (مرتب)

مولوی عبدالحق[له] سکریٹری انجمن ترقی اُردو	زمانہ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب قابل مدیر رسالہ "اردو" اور آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا اسم گرامی خاص طور

له مولوی عبدالحق ۲۰؍ اگست ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ جہاں سے آپ نے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ فلسفہ و تاریخ آپ کے مضمون تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچے، جہاں مدرسہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ بعد ازاں اُن کی خدمات ریاست کی معتمدی اور امور عامہ کو منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۰۱ء میں ناظم تعلیم کے مددگار اور چند ماہ بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں آپ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری بنے۔ اس وقت انجمن کس مپرسی کے عالم میں تھی۔ مولوی عبدالحق کے علمی شوق اور اُردو کی خدمت کے بے لوث جذبہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں انجمن کی کایا پلٹ ڈالی اور اُردو میں تحقیق و تنقید کا درخشاں دور شروع ہوا۔

پروفیسر وحید الدین سلیم کی وفات کے بعد ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ اور سر اکبر حیدری کے بے حد اصرار پر پروفیسر اردو کی خدمات انجام دینے کے لئے حیدر آباد چلے آئے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں انجمن کی مجلس مشاورت نے فیصلہ کیا کہ انجمن کا دفتر دکن سے دلی منتقل ہونا چاہئے۔ مولوی صاحب دلّی آ گئے۔ تقسیم ہند تک یہیں رہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں کراچی آنا پڑا، یہاں نئے سرے سے انجمن کا کام شروع کیا۔ مگر اندرونی سازشوں کے باعث خاطر خواہ کام نہ کر سکے۔ ملک میں اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہوا تو مولوی صاحب کو سکھ کا سانس نصیب ہوا اور انجمن کو مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق سازشوں سے پاک کر دیا گیا۔ یہ اُن کی عمر کے آخری سال تھے۔ سرطان کا عارضہ لاحق ہوا۔ اس بیماری سے ۱۶؍ اگست ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا۔

(قومی زبان بابائے اُردو نمبر ۱۹۹۳ء - ۱۹۶۴ء - ۱۹۶۶ء

(اُردو عبدالحق نمبر ۱۹۶۲ء مجلس عبدالحق نمبر ۱۹۶۱ء الشجاع بابائے اُردو نمبر)

تصانیف:—

۱۔ قواعد اردو ۲۔ اردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ ۳۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ قدیم اُردو۔ نصرتی۔ مرحوم دلی کالج۔ سر سید احمد خاں حالات و افکار۔ تنقیدات عبدالحق۔ ادبی تبصرے۔ مقدمات عبدالحق دو جلد۔ خطبات عبدالحق دو جلد۔ مکتوبات بابائے اُردو مرتبہ محمد امام امامی۔ اُردو نے [illegible] سید ابو تمیم فرید آبادی۔ مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔

چند ہم عصر بابائے اُردو نے یہ کتب مرتب کیں۔

دریائے لطافت ۱۹۳۵ء گل عجائب ۱۹۳۶ء چمنستان شعرا ۱۹۲۸ء مخزن شعرا ۱۹۳۳ء تذکرہ ریختہ گویاں ۱۹۳۳ء مخزن نکات ۱۹۲۹ء تذکرہ ہندی ۱۹۳۰ء ریاض الفصحا ۱۹۳۴ء عقد ثریا ۱۹۳۴ء خواب و خیال انتخاب کلام میر انتخاب داغ ۱۹۴۶ء رانی کیتکی کی کہانی ملا وجہی باغ و بہار ذکر میر ۱۹۲۸ء (انتخاب)

نمایاں ہے۔ سچ پوچھیے تو جس قدر اُردو کی ترویج و ترقی اس وقت دکن میں ہے وہ آپ ہی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ آپ ہی انجمن مذکور کے روح رواں اور آپ ہی کے ہاتھ میں اس کے کل کاروبار کی عنان ہے۔ انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت و سرپرستی نہایت مفید اور عمدہ کتابیں خواہ از قسم تالیفات یا تراجم بکثرت شائع کی ہیں اور اکثر مطبوعات انجمن پر مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہیں وہ آپ ہی کے رشحات قلم کے نمونے ہیں جن سے آپ کی تحقیقات علمیہ اور معلومات کا پورا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ جو مضامین آپ رسائل وغیرہ میں لکھتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت موقر اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ الحق آپ کی ذات ہمارے لئے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت زبردست ہے۔ آپ نے تمام عمر ادب اُردو کی خدمت میں صرف کردی اور اسی کی بدولت ہم کو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صدہا پرانے قلمی نسخے جو گوشۂ گمنامی میں پڑے پڑے ضائع ہو جاتے آج زیب قرطاس ہو کر ہماری آنکھوں کو روشن کر رہے ہیں اور قدیم تاریخ نظم و نثر اُردو سے جس قدر ہم اس وقت بہرہ مند ہیں وہ بھی زیادہ تر آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے ایک عرصہ دراز تک آپ نے نظام گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم میں کام کیا۔ مثل اکابر سلف کے آپ حد درجہ منکسر المزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں ہیں اور اسی وجہ سے اپنی زندگی کے حالات دینے سے گریز فرماتے ہیں۔ قوت نقد آپ میں بہت زیادہ ہے۔ اور آپ کی تنقیدات ہمیشہ جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی ہیں۔ اُردو نثاروں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی خوبی آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہیں چھوڑتے بلکہ ان کو اپنی عبارت میں نہایت خوبی اور استادی کے ساتھ کھپاتے جاتے ہیں۔ البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہیں۔ جو لوگ آزاد کے طرز اور اُن کی شوخیوں کو پسند کرتے ہیں اُن کو ضرور آپ کی عبارت روکھی اور بے مزہ معلوم ہوگی۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ آپ کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کا رنگ اگر کسی میں ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہیں۔ بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیوں کا لحاظ رکھا جائے تو اُن پر سبقت لے گئے ہیں۔ علاوہ دیگر کمالات کے جس پر آپ متصف ہیں۔ سب سے بڑی صفت آپ میں یہ ہے کہ آپ اس عہد میں اپنے اثر سے لوگوں کے دلوں میں زبان کا شوق پیدا کر دیا ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم [1] مثل مولوی عبدالحق صاحب کے مولوی سید وحیدالدین صاحب سلیم بھی

---

[1] سلیم: پیدائش ۱۸۶۷ء تقریباً۔
وفات ۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء۔ (مرتب)

زمانہ موجودہ کے نامور نثاروں اور محسنین زبان اُردو میں ہیں۔ آپ مشہور خاندان سادات سے ہیں جنھوں نے پانی پت میں توطن اختیار کرلیا تھا جہاں آپ کے پدر بزرگوار حاجی مولوی فریدالدین صاحب کو شاہ شرف بو علی قلندر کے مزار پُر انوار کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے۔ جہاں آپ نے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھا۔ زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور فارسی میں منشی فاضل کا درجہ حاصل کیا۔ ابتداء میں قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بھاولپور میں صیغہ تعلیم میں کوئی جگہ حاصل کی جہاں کچھ عرصہ قیام کر کے رام پور ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کے قدر دان و مربی جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک تعلق کر دیا۔ کچھ دنوں اپنے وطن پانی پت میں مطب بھی کھولا تھا اور ایک دواخانہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا حالی کی وساطت سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ سلیم صاحب سرسید کے پرائیوٹ سیکرٹری ہو گئے اور عام طور پر اُن کی تصنیفات اور مضمون نگاری میں اعانت کرنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ اُن کے مرتے دم تک رہے اُس کے بعد اپنا رسالہ "معارف" نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علیگڈھ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ علالت کے اس کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر ہوئے مگر مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی وجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار زمیندار کے اسٹاف میں بحیثیت چیف ایڈیٹر داخل ہوئے لیکن جب اس کی ضمانت ضبط ہو گئی تو اُن کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ اُن کی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدرآباد کے دارالترجمہ کی طرف ان کو گھسیٹا جہاں اُن کی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" تصنیف ہوئی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اُردو مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر مقرر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز تھا۔ کہیں کہیں آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے تھے۔ آپ اس زمانے کے اکثر مشہور جرائد اور رسائل میں مفید مضامین لکھتے رہتے تھے علی الخصوص آپ کے مضامین "تلسی داس کی شاعری" اور "دیومالا" اور "عرب کی شاعری" جو رسالہ "اُردو" میں چھپے تھے نہایت اعلیٰ درجہ کے اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ ایک بڑی صفت آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شائق

نہیں بلکہ مثل مولانا حالی کے ہندی کے شیریں اور رسیلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی قابل قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور اعلیٰ درجے کی کتاب ہے جس سے آپ کے تبحر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں زبان اردو کی اصل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جدید سائنٹفک اور ٹکنیکل الفاظ اور محاورات وضع کرنے کے لئے نہایت مفید قواعد قائم کئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر[1]

شیخ عبدالقادر صاحب زبان اور ادب اردو کے مخلص محسنوں میں ہیں۔ اب سے تقریباً باون ۵۲ ترپن ۵۳ برس پیشتر لدھیانہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے اسلاف قانون گویوں کے معزز خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت ناموری اور کامیابی سے ختم کر کے سنہ ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری اول درجے میں حاصل کی جس کے بعد پنجاب "آبزرور" کے اڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۸۹۸ء میں چیف اڈیٹر ہوئے سنہ ۱۹۰۴ء میں اخبار سے تعلق ترک کر کے بیرسٹری کے واسطے انگلستان روانہ ہوئے جہاں حسب معمول تین برس رہے اور اسی عرصہ میں ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور پبلک معاملات کو بغور مطالعہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ بعد حصول ڈگری اکثر ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آ کر پہلے دہلی میں کام شروع کیا تھا مگر دو سال بعد لاہور آ گئے سنہ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل اور پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوئے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ عہدہ ترک کر کے لاہور میں پھر بیرسٹری شروع کی اور اب ان کا شمار درجہ اول کے
میں ہونے لگا سنہ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک سال تک ایڈیشنل جج بھی رہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹیو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۲۶ء میں لیگ اقوام کے ساتویں اجلاس مقام جنیوا میں ہندوستان کی طرف سے بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ ان مناصب جلیلہ اور ادبی خدمات سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر امیدیں آپ کے کامیاب زمانہ تعلیم میں آپ کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب پوری ہوئیں۔

---

[1] پیدائش ۱۸۷۲ء
وفات فروری سنہ ۱۹۵۰ء

شیخ صاحب کو زبان اُردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈر گریجویٹ تھے تو آپ نے اُسی زمانے میں ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی میں زمانہ حال کے اُردو شعرا اور نثاروں پر دینا شروع کیا تھا جو ۱۹۰۸ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا اور پبلک میں بہت مقبول ہوا۔ پنڈت بشن نرائن در آنجہانی نے بھی اُس کی بڑی تعریف کی تھی گو کہ اُس کے بعض نتائج اور راویوں سے اُن کو اختلاف بھی تھا۔

۱۹۰۱ء میں اُردو کا مشہور و معروف ماہواری رسالہ "مخزن" جاری ہوا جس نے ادب اُردو کی نہایت بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دیں اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اُس نے اپنا سکہ جما دیا اس رسالہ کے اکثر مضمون نگاروں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء تک شیخ صاحب ہی اُس کے ایڈیٹر تھے بلکہ ۱۹۲۰ء تک وہی اُس کے آنریری ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شائع ہو کر داخل کورس ہوئے ۱۹۱۷ء میں شیخ صاحب نے "اُردو کانفرنس" کے اجلاس کلکتہ میں صدارت کی تھی اور بالفعل آپ "انجمن ارباب علم لاہور" کے صدر ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی پنڈت صاحب ۱۸۷۶ء بمقام فیض آباد پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد پنڈت کنہیا لال زتشی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ آپ کے والد کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہو گیا ۱۸۹۴ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری کیننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کر کے ۱۸۹۷ء میں امتحان ایم۔ اے سے فراغت کر کے (جس میں آپ اوّل ہوئے تھے) ۱۹۰۲ء سے پھر ۱۹۱۰ء تک ٹریننگ کالج الٰہ آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ میں آپ اکثر مضامین انگریزی ہندوستان ریویو کو اور اُردو مضامین میں زمانہ، ادیب، اور کشمیری درپن کو بھیجتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہیڈ ماسٹری کے بعد انسپکٹر بنارس ہوئے ایک سال انسپکٹر رجسٹرار بنارس یونیورسٹی اور ایک سال پرنسپل ٹریننگ کالج الٰہ آباد بھی آپ رہ چکے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے انڈر سیکرٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے واسطے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغہ تعلیم رہے۔ بالفعل آپ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ "گلدستہ ادب" اور "ایجوکیشن ان برٹش انڈیا" (تعلیم برٹش انڈیا میں) آپ کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مرزا غالب اور چکبست وغیرہ پر نہایت فاضلانہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اکثر ادبی مباحثوں میں نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے آپ کو کتب بینی کا بے حد شوق ہے اور ناقد بھی آپ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ آپ کے ریویو نہایت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی آپ نظم اُردو کے پرانے رنگ سے ناراض ہو کر زمانۂ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خوب خبر لیتے ہیں۔

منشی دیانرائین نگم دنیائے جریدہ نگاری میں منشی دیانرائین نگم کے نام سے کون ناواقف ہے۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام کانپور ایک معزز کالستھ خاندان میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیو سہائے صاحب ایک مشہور وکیل اور وائس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے۔ نگم صاحب ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی سال اپنا مشہور پرچہ "زمانہ" نکالا جو اب تک بفضلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے۔ ۱۹۱۲ء میں "آزاد" جاری کیا۔ جو چند روز روزانہ رہ کر اب ہفتہ وار ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

بالفعل آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری غرضکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل رفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال۔ اور سیاسیات میں آپ اعتدال پسند ہیں۔ تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاص کر آپ کو توغل ہے اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانوں کیلئے خضر طریقت ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں۔

آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی میں صرف کر دی اسی وجہ سے وہ عرصہ زائد بیس سال سے اس نمایاں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ "زمانہ" ہمارے صوبہ کا بہت پرانا ماہوار رسالہ ہے اور اس کا شمار اب اردو کے ان مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب و ملت مضامین لکھتے ہیں۔ اس کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت رائے کے واسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت نپے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو افسوس اور شکایت ہے کہ ان کے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فیض یاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب ہندوستانی اکاڈیمی کے ایک پرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی ایم۔اے[2] لالہ سری رام صاحب ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی شہرت اور عظمت کے واسطے یہ کیا کم ہے کہ اس کا سلسلہ جا کے اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل سے مل جاتا ہے۔ لالہ صاحب کے آباد اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد میں ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہیں۔ آپ کے پدر بزرگوار آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم۔اے بیرسٹرایٹ لا کے اسم گرامی سے دلی اور لاہور کا بچہ بچہ واقف ہے اور آپ کے عم نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کو کون نہیں جانتا کہ ایک مشہور و معروف استاد

---

[1] ولادت ۱۸۸۲ء وفات ۱۹۴۲ء [2] ولادت ۱۸۷۵ء - وفات ۱۹۳۰ء

اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب میں گزرے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے۔ لالہ صاحب موصوف ۱۸۷۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے بارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ لاہور گئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۹۸ء میں ایم، اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے اور لاہور امرتسر دلی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک زینت دیتے رہے مگر دمہ کے موذی مرض میں مبتلا ہو جانے سے ۱۹۰۰ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی مشاغل اور اپنی وسیع ریاست کے اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں اور آپ کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل امارت و سخاوت اور پبلک خدمات کے واسطے ضرب المثل ہے اور اس پر مولانا جامی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ایں سلسلہ از طلائے ناب ست
ایں خانہ تمام آفتاب ست

تذکرۂ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید — لالہ سری رام صاحب اس عدیم المثال تذکرہ کے مصنف ہیں جو افسوس ہے کہ اب تک اتمام کو نہیں پہونچا یعنی اس کی چار ضخیم جلدیں چھپ گئی ہیں اور تقریباً چار ہی ابھی باقی ہیں۔ یہ شعراء اردو کے حالات کا خزانہ اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کے ترتیب اور تدوین میں کس قدر وقت اور روپیہ صرف ہوا ہوگا اور کس قدر تحقیق و تلاش اور کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اس کی ابتدا کے حالات فاضل مصنف نے جلد اول کے دیباچہ میں مفصل طور پر بیان کئے ہیں اس کی چار جلدیں سنین ذیل میں شائع ہوئیں یعنی جلد اول ۱۹۰۶ء جلد دوم ۱۹۱۰ء جلد سوم ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم ۱۹۲۶ء میں اس لاجواب تذکرہ کو اگر معلومات کی کان کہیں تو بجا ہے اور اگر اس کو تاریخ الشعراء کی جان سمجھیں تو زیبا ہے اس نے صدہا بھولے بھٹکے شاعروں کو روشناس خلق کیا جس میں بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جن کا کلام ہم تک نہ پہونچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اس قدر متین اور مہذب ہے کہ اچھوں کا تو ذکر کیا بروں کو بھی اچھا کر دکھایا ہے بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہو گئی ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو شاعر دکھایا ہے اور ان کا تخلص اشتیاق بنایا ہے۔ جس کی غلطی سے مولانا حالی نے متنبہ کر دیا۔ اسی طرح نعش کو انس کا بیٹا بتایا اور اس غلطی کو منشی احسن مرزا شرر لکھنوی نے اپنی فاضلانہ تقریظ میں درست کر دیا۔ مگر انسان انسان ہے اور "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" مشہور ہے۔ فاضل مصنف نے انتخاب کلام میں واقعی کمال دکھایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کئے جو ان کی بڑی سلامتی مذاق اور اصابت رائے کی دلیل ہے۔ عبارت اس قدر سلیس اور بامحاورہ فصیح بلیغ کہ چشم بددور کہنے کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلیٰ واقع کہ نور علیٰ نور

کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اتمام و اختتام کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر و بے عدیل الحق ہوگا اور نظم اردو
کا انسائیکلوپیڈیا یعنی ناموس الاعظم کہلائے جانے کا بے شک مستحق ہوگا اور کیوں نہ ہو یہ قابل
مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے تمام
تذکرہ نویس اس زمانے کے ان کے مرہون منت اور خوشہ چین ہیں اور سب سے بڑھ کر مولف
کتاب ہذا بالتخصیص ہے۔ اگر کسی کو تقریظوں کی بہار اور ریویو کے لآلی آبدار دیکھنا ہو تو وہ اس کی
جلدوں کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگوں نے کس کس انداز اور کس کس ادا سے
نظم و نثر دونوں میں کیا کیا گلفشانی اور سحر بیانیاں کی ہیں۔ ہمارے نزدیک اتنی کثرت سے
اور اتنے اعلیٰ درجے کے ریویو کسی ایک کتاب پر ہرگز نہ ہوئے ہوں گے لالہ سری رام صاحب
نے ۱۸۹۸ء میں دیوان انور اور ۱۹۰۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمۂ یادگار داغ بھی نہایت
عمدگی سے شائع کیا تھا ظاہر ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کے واسطے کتنی کتابیں صرف کثیر
سے جمع کرنی پڑی ہونگی۔ ع درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا
اسی وجہ سے موصوف کا کتب خانہ جس میں اکثر نادر قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں۔ دیکھنے
کے قابل ہے اور آپ بالفعل اسی ادبی فضا میں بکمال فراغت ایک رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔
اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم ازکم دوسرے مصرع کے ضرور مصداق ہیں ؎

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے　　　فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

دیگر نثاران اردو | موجودہ زمانے میں اردو نثاروں اور ناقدان سخن کی اتنی کثرت ہے کہ
ان تمام اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہوگا۔ لہٰذا یہاں بعض ارباب
ادب کے صرف نام بتائے جاتے ہیں۔ ان کے مفصل حالات مع موجودہ شعرا کے ذکر کے
ایک دوسری کتاب میں جو ہم تیار کر رہے ہیں انشاء اللہ ضرور جگہ پائیں گے۔

(۱) پنڈت بشن نرائن در آنجہانی۔ اردو کے بڑے مبصر ہونے کے علاوہ شاعر شیریں
سخن بھی تھے۔ ادب اردو پر اردو اور انگریزی دونوں میں نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین
لکھتے رہتے تھے۔ علی الخصوص وہ مضامین جو سرشار کے متعلق ہیں اور شیخ عبدالقادر کی
کتاب "نیو اسکول آف اردو لٹریچر" (جدید ادب اردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت
دلچسپ اور معلومات سے پر ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خاں صاحب[۲] اثر لکھنوی ڈپٹی کلکٹر زمانہ حال کے نہایت خوشگو
شاعر اور قابل سخن سنج ہیں۔ ان کے مضامین میر و سودا سے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ
اٹھایا۔ کلام نہایت سلیس صاف اور زوردار ہوتا ہے۔

۱؎ وفات ۱۹۱۶ء۔ (مرتب)　۲؎ پیدائش ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء۔ وفات ۶ر جون ۱۹۶۷ء (مرتب)

(۳) احسن مارہروی[1] فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں دیوان ولی کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا کتاب "اُردو لشکر" بھی ان کی تصنیف ہے جس میں نظم اُردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے خیالات آزاد اور زبان زوردار ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہمارے نزدیک احتراز کرنا چاہیئے۔

(۴) حامد اللہ[2] افسر رشید احمد[3] صدیقی۔ سید مسعود حسن[4] رضوی اور جلیل احمد قدوائی یہ سب زبانِ اُردو کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور ناقد ہیں۔

(۵)۔ اسی طرح پروفیسر ناسی۔ پروفیسر ضامن علی الہ آباد یونیورسٹی کے لکچرار اور اُردو بھی ادب اُردو میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں۔

(۶) حسرت موہانی[5]۔ نظم اُردو اور فن تنقید کے ایک استوار ستون ہیں۔ مضامین گوکہ مختصر لکھتے ہیں مگر اوریجنل اور بہت طبیعت داری کے ہوتے ہیں۔

(۷) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہیں۔ مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست سے مگر عام رنگ میں لکھتے ہیں۔

(۸) سلطان حیدر[6] جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں جن کے مضامین سے الناظر کے صفحات کو زیب وزینت ہوتی ہے۔

(۹) سید سجاد حیدر یلدرم[7]۔ نثر افسانہ نہایت خوب لکھتے ہیں۔ عبارت دلفریب اور اس میں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں اور ایک ترکی ناول اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بہ خوارزم شاہ کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کا مجموعہ مضامین "خیالستان" مشہور ہے۔

---

[1] پیدائش ۲۱ رشوال ۱۲۹۳ھ / ۹ نومبر ۱۸۷۶ء - وفات ۱۹۴۰ء

[2] پیدائش ۱۸۹۸ء

[3] پیدائش ۱۸۹۶ء

[4] پیدائش ۹ جولائی ۱۸۹۳ء

[5] پیدائش ۱۸۷۸ء، وفات مئی ۱۹۵۱ء

[6] پیدائش ۱۸۸۶ء، وفات ۱۱ مئی ۱۹۵۲ء

[7] پیدائش ۱۸۸۰ء - وفات ۱۲ اپریل ۱۹۴۳ء

(مرتب)

(۱۰) مولانا ظفر علی خاںؒ ادبی اور اخبار نویسی کی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہیں۔ ان کے اکثر تصانیف انجمن ترقی اردو کے ذریعہ سے چھپ چکی ہیں۔ سیاسی مضامین لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فرید آبادیؒ۔ ادبائے دکن میں خاص طور سے ممتاز ہیں۔ تصانیف بہ کثرت رکھتے ہیں۔

(۱۲) مہدی حسنؒ بہت اچھے لفظی مصوّر اور صاحب طرز تھے۔ اُن کی کتاب افادات مہدی مشہور ہے۔ افسوس کہ نوجوانی کی موت نے ان کی ہونہار زندگی کو قطع کر کے آئندہ امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔

جدید نثر اُردو کے دو طرز زمانۂ حال میں نثر اُردو کو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ادیبوں نے اس قدر علیحدہ علیحدہ طرز انشار اختیار رکئے ہیں کہ ان سب کا استقصا اور ان پر رائے زنی کرنا دشوار ہے۔ لہٰذا ہم یہاں صرف دو طرزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طرز۔ عربی اردو اور اس کے مقابلہ میں بھاشا آمیز اُردو اکثر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کئے جائیں تاکہ عبارت شاندار اور وتیع معلوم ہو۔ ممکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سرسیّد اور ان کے رفقا اور مقلدین ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادھی مگر زوردار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بعد کو بعض جدت پسند طبایع کو جب وہ روکھی پھیکی بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اس میں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنے کے لئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سرسیّد کے طرز کا ردّ عمل کہنا چاہیئے۔ ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے اپنے مشہور اخبار الہلال میں اس کو بہت برتا۔ مولانائے موصوف مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والوں میں ہیں اور خود ان کی تحریروں میں اس قسم کی خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں۔ جو ان کے مقلدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جن کی عبارتیں سوائے تسلسل الفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں۔ یہ طرز تحریر اس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہیں کہ

لہ۔ پیدائش ۱۸۷۳ء وفات ۱۹۵۶ء

ٹہ پیدائش ۱۸۹۰ء وفات ۲۰ جولائی ۱۹۶۴ء (مرتب)

تہ پیدائش ۱۸۷۱ء وفات ۱۹۲۱ء (مرتب)

اہل اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر و اشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بالمقابل اور اسی کے جواب میں ایک فرقہ نے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کئے۔ مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریریں خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر محمول ہوں۔ ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں اور بہی خواہانِ اردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

دوسرا طرز۔ خیالی یعنی ٹیگوری اردو

طرز مذکورہ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہے جو خیالی اردو کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹیگوری اردو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ رابندرا ناتھ ٹیگور کے اس طرز کا تتبع ہے جو انہوں نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ میں اختیار کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ٹیگور اور بعض مشہور انگریز انشاپردازوں کا حقیقی تتبع نہیں بلکہ ان کے کلام کی محض نقل ہے۔ جس میں ان لوگوں کے محاسن کلام مطلق نہیں پائے جاتے۔ یہ نقال نہ تو اصلی تصوف سے واقف ہیں اور نہ ان میں حقیقی تخیل کی روح ہے۔ ایسے لوگوں کی انشا پردازی سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر بالکل خام ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا ادبی حسن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر مبالغہ آمیز اور مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے اور بعض اوقات تو وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ان غیر منسلک پوتوں کو بسا اوقات ان کے صناع قیمتی سچے موتی خیال کرتے ہیں۔ بعض وقت اس قسم کی تحریریں غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس قسم کی نثر کی ابتدا افسانہ نویسی سے ہوئی۔ اس سے لوگوں کو بہت لطف آنے لگا اور نئی معلومات کے راستے کھل گئے۔ مضامین میں وسعت اور تنوع اور عبارت میں ایک خاص شان اور رنگینی اس سے پیدا ہوئی۔ صاحب تحریر بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شاعرانہ خیالات اور شاعرانہ انداز کو بلا عروض کے جھنجھٹ کے نثر کی صورت میں اکڑ اکڑ کر دکھانے لگے تاکہ لوگ ان کو نثار شاعر سمجھنے لگیں۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ بن گئی کبھی جدت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی گئیں اور کبھی ایک خاص زور دار انداز پیدا کرنے کے واسطے معمولی صرفی نحوی ترکیبیں الٹ پلٹ کر عبارت ایک طرفہ معجون بنائی گئی۔ مضامین میں بھی علی ہذا القیاس عجیب و غریب تغیرات ہوئے۔ کبھی ان میں جدت اور رنگینی پیدا کرنے کے واسطے مشرقی اور مغربی (رومی اور یونانی) دیومالا چھانی گئی کبھی نیچر کی بے جان چیزیں جاندار تصور کر کے اس قدر جوش و خروش اور ایسے مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ ان سے تخاطب کیا گیا کہ بعض اوقات اس کو پڑھ کر یا سن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ

ایک جھوٹی نمائش اور شعبدہ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ایسے مضامین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے تو فی الواقع رنگ و حسن و موسیقیت کا جلوہ زار بن سکتی ہے مگر نوآموزوں کے ہاتھ میں وہ محض ایک گھروندا بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں سوائے الفاظ کے معنی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

پرانی اخباری دنیا[۱] ۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۸ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین نے اردو اخبار دلی سے جاری کیا جو حقیقت میں اخبار یعنی خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک ادبی پرچہ تھا جس میں اکثر اوقات ذوق و غالب و مومن اور دیگر معاصر شعرا کی غزلیں اور کبھی کبھی ہم طرح غزلیں بھی درج ہوتی تھیں۔ کبھی اس میں زبان اور محاورات کی بحث ہوتی تھی۔ ذوق کی وفات کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اس میں چھپا تھا۔ گورنمنٹ اس کی سرپرستی کرتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے جو ایک بہت نگری کایستھ تھے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستیں دونوں میں بہت مقبول تھا مہاراجگان کشمیر و پٹیالا اس پرچہ کی اور نیز اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتہ میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلنے

۱؎ جدید تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا، جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا یہ اخبار ۲۳ر جنوری ۱۸۲۸ کو بند ہوا۔

سکینہ نے جن اخبارات کا ذکر کیا ہے ان کے سنین اشاعت یہ ہیں:-

دہلی اردو اخبار دلی ۱۸۳۷ء	قاسم الاخبار بنگلور ۱۸۶۱ء
سید الاخبار دلی ۱۸۳۷ء	کشف الاخبار بمبئی
کوہ نور لاہور ۱۸۵۰-۱۹۰۴ء میں بند ہوا۔ اس کے آخری مدیر محمد دین فوق تھے۔	کارنامہ لکھنؤ ۱۸۶۵ء
	جریدہ روزگار مدراس ۱۸۶۵ء
شعلۂ طور کانپور ۱۸۶۰ء	اردو اخبار لکھنؤ ۱۸۵۹ء- ۱۹۵۰ء میں بند ہوا۔ علمی اجالے صـ۵۹
مطلع نور کانپور ۱۸۶۹ء	
پنجابی اخبار لاہور ۱۸۶۵ء	شمس الاخبار مدراس ۱۸۵۹ء
نجم الاخبار لاہور	اخبار عام لاہور ۱۸۷۱ء
اشرف الاخبار دلی ۱۸۶۷ء	رفیق ہند لاہور ۱۸۸۴ء
وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ ۱۸۵۲ء	پیسہ اخبار لاہور ۱۸۸۷ء
	(مرتب)

لگا۔ آخر میں اس کا زوال ہوگیا اور انہیں لوگوں کے ہاتھوں، ہوا جنہوں نے اس میں کام سیکھ کر اس کے رقیب دوسرے پرچے نکالنا شروع کئے۔ منشی نولکشور صاحب بھی اس کے اسٹاف میں کام کرتے تھے۔ پھر شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دلّی سے۔ دکٹوریہ اخبار سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدہ روزگار مدراس سے نکلے اور چند دنوں کے بعد اکثر ان میں سے بند ہوگئے۔ اودھ اخبار جس کو منشی نولکشور صاحب نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے بلکہ اس کا شمار ہمارے صوبے کے اعلیٰ درجے کے اور مشہور روزانہ اخباروں میں ہے۔* شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانے میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر ان خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں یا نوٹوں سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھیں اور اس کی کوئی معینہ پالیسی بھی نہ تھی سوائے اس کے کہ سیاسی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اس کے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان اور سٹاف اعلیٰ درجے کا تھا۔ اسی کا ہمعصر شمس الاخبار تھا جو مدراس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسلمان کے واسطے مخصوص تھا یہ کوئی مشہور پرچہ نہ تھا اور تھوڑے عرصے کے بعد بند ہوگیا۔ ایک دوسرا مشہور پرچہ اخبار عام لاہور ہے جس کو پنڈت مکند رام نے نکالا تھا جو کوہ نور میں ملازم تھے اور ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار اس کے معاون تھے۔ یہ ایک خاص خبروں کا پرچہ تھا اور نہایت ارزاں تھا۔ کچھ دنوں گورنمنٹ اس کی سرپرست رہی اور ہر سکول میں اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرستی اب موقوف ہوگئی۔ پہلے یہ بھی ہفتہ وار تھا اس کے بعد سہ روزہ اور دو روزہ ہوا۔ اس کی زبان اخباری زبان تھی۔ یعنی اس میں کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ اس کی ارزانی قیمت نے لوگوں کے دل میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء میں وجود میں آیا یہ ایک ظرافت کا پرچہ تھا اور اپنے عنفوان شباب میں نہایت کامیاب۔ لوگوں کو اس کا انداز اس قدر پسند آیا کہ ملک میں اس کے اکثر نقال پیدا ہوگئے۔ اس کی خاص خوبیاں یہ تھیں کہ آزادی سے لکھتا تھا ظریفانہ رنگ میں لکھتا تھا۔ جس کی ملک میں بڑی ضرورت تھی۔ انشاپردازی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی خاص فرقہ جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم

---

* اودھ اخبار ۱۹۵۰ء میں بند ہوا۔ (مرتب)

اس کے قابل ایڈیٹر تھے اور اکثر اس کے عہد کے قابل ظریف الطبع اصحاب اس کے نامہ نگار تھے۔ ہندوستانی کی ابتدا لکھنؤ میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی یہ سب سے پہلا اردو پرچہ تھا جس نے سیاسیات اور واقعات حاضرہ پر بالاستیعاب بحث کی۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی مناقشوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اس کی زبان میں ادبیت نہ تھی ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہو اسی شان کا پرچہ رفیق ہند تھا جو لاہور سے نکلتا تھا پیسہ اخبار ۱۸۸۷ء میں نکلا منشی محبوب عالم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کی ارزاں قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں اشتہارات بکثرت نکلتے تھے۔

ادبی اردو رسائل[1] اس قسم کے رسالوں میں مولانا شرر مرحوم کا دلگداز بہت پرانا رسالہ ہے۔ جو اب بھی نکل رہا ہے۔ زمانہ کانپور کا ذکر منشی دیا نرائن صاحب نگم کے ذکر میں گزر چکا۔ ادیب الہ آباد بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ تھوڑے دنوں میں اس کی عمر ختم ہوگئی۔ الناظر جس کے قابل ایڈیٹر مولانا ظفر الملک صاحب علوی ہیں نہایت آزاد خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔ ہزار داستان لاہور میں صرف چھوٹے افسانے اور ناول نکلتے ہیں ہمایوں لاہور اور شباب اردو لاہور بھی اپنی صنف میں عمدہ پرچے ہیں۔ نگار لکھنؤ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجے کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے فاضل ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ معارف اعظم گڑھ اور اردو اورنگ آباد یہ دونوں زمانہ موجودہ کے بہترین ادبی رسالے ہیں جن کے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ سہیل علیگڈھ گو کہ حال ہی میں طلوع ہوا۔ نہایت ہونہار رسالہ ہے اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور اگر ترقی کرتا رہا تو اس کا شمار بہترین اردو رسائل میں ہوجائے گا۔ مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ

---

[1] ان رسائل کے سنین اشاعت یہ ہیں:-

۱۔ دلگداز	۱۸۸۷ء	۶۔ معارف	۱۹۱۶ء
۲۔ زمانہ	۱۹۰۲ء	۷۔ اردو	۱۹۲۱ء
۳۔ الناظر	۱۹۰۹ء	۸۔ سہیل	۱۹۲۷ء
۴۔ ہمایوں	۱۹۲۲ء	۹۔ اردوئے معلیٰ	۱۹۰۳ء
۵۔ نگار	۱۹۲۱ء	۱۰۔ مخزن	۱۹۰۱ء

(مرتب)

ایک زمانے میں بہت مشہور تھا مگر اب ویسا نہیں ہے۔ "مرقع" لکھنؤ اور "اکبر" الٰہ آباد سے نکلتے ہیں۔ مخزن ادب اردو کی بہت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مختصر یہ کہ سب رسائل کو نام بنام گنوانا بہت مشکل ہے۔ مگر ان پرچوں میں جو ایک زمانے میں شہرت رکھتے تھے اور اب بند ہوگئے دکن ریویو۔ حسن اور العصر قابل ذکر ہیں۔

اکثر اخبار نویسوں کے حالات ان کے تحت میں درج کئے گئے ہیں۔ مولانا ظفر الملک مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اور تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ حضرات ادب اردو کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر کسی کو اردو روزانہ اخبارون کے ایڈیٹروں کے نام دیکھنا ہوں تو ایک مختصر کتاب "اخبار نویسوں کے حالات" مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کریں۔

باب ۱۷

اُردو ناول کی اِبتدا

شرر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پرانے قصے "افسانہ گوئی کا شوق دنیا میں بہت قدیم اور انسان کے دل میں اس کا بہت گہرا اثر ہے"۔ پرانے اُردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی تراجم کے لئے گئے یا انہیں دونوں چیزوں کو گھٹا بڑھا کر کچھ نئے قصے گڑھ لئے گئے تھے۔ یہ سب اپنی نوعیت میں مختلف ہیں۔ بعض ہمت و شجاعت کے قصے ہیں بعض میں دیووں اور پریوں کا قصہ ہے۔ بعض اخلاقی ہیں اور بعض نہایت مخرب الاخلاق۔ اندازِ بیان سب کا وہی ٹکا بندھا معمولی ہے۔ واقعات کا بیان قریب قریب یکساں ہے۔ جن کو بار بار پڑھ کر طبیعت اکتا جاتی ہے عجائب و غرائب کا ذکر عام ہے۔ انسان دیووں اور پریوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں طلسم سحر جادو وہر قصے میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دار ومدار ہوتا ہے اندازِ بیان عام طور پر سادہ اور سبق آموز ہوتا ہے۔ مگر کیرکٹر نویسی کا کسی میں پتہ نہیں اور نہ کوئی داخلی دلچسپی نہ کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے زیادہ تر حسن و عشق کے حالات، ساحروں اور جادوگروں کی لڑائیاں، جادوگروں کے شہزادوں سے مقابلے، اور آدمیوں کا جانوروں کی صورت میں بدل جانا دکھایا جاتا ہے یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہیں۔

اقسام قصص خاص اقسام قصص حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) الف لیلیٰ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ مع اس کے فروعاتِ طلسم ہوشربا وغیرہ کے (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے جیسے بیتال پچیسی۔ کلیلہ دمنہ سنگاسن بتیسی۔ گل بکاؤلی طوطا کہانی وغیرہ۔

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ اکثر اس قسم کے قصے مطبع منشی نولکشور میں چھپے ہیں جس کے بانی خود منشی نول کشور سی۔ آئی۔ ای تھے۔ اس مطبع نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی

ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر قدیم کتابوں کی اشاعت ، مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیاری ۔ اور نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اُردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی صاحب موصوف ۱۸۳۶ء میں بسنوئی ضلع علیگڈھ میں پیدا ہوئے[1] اُن کے دادا منشی بالمکند آگرہ میں سرکاری خزانچی تھے اور والد منشی جمنا داس بھی کاروبار کرتے تھے ۔ منشی نولکشور ایک خود ساختہ آدمی تھے ۔ اور بچپنے ہی سے تجارت کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے ۔ ان کو اخبارات سے بڑا شوق تھا ۔ منشی ہر سکھ رائے کی ماتحتی میں اخبار کوہ نور لاہور میں کچھ عرصہ تک رہے ۔ جہاں اُن کو چھاپہ خانہ وغیرہ کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہو گیا غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے جہاں ۱۸۵۸ء سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں اپنا مطبع کھولا ۔ تقدیر نے یاوری کی اور ان کے کام کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی ۔ اُن کی قابلیت اُن کی دیانتداری اُن کی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار ہونے لگا ۔ منشی صاحب نے زر کثیر قیمتی نادر کتابوں کی خرید میں صرف کیا جن میں سے اکثر کو شائع کر کے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا[2]۔ اودھ اخبار میں بھی ۱۸۵۸ء میں انھوں

---

[1] ۔ ایک روایت کے مطابق نول کشور دسمبر ۱۸۳۶ء میں متھرا کے نزدیک ریڑھا گاؤں میں پیدا ہوئے (آجکل یکم جون ۱۹۴۵ء)۔ (مرتب)

[2] ۔ ۱۸۸۴ء میں ایک امریکی صحافی نے مطبع منشی نولکشور کے عظیم کام کو دیکھ کر ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا تھا۔ "منشی نولکشور ایک عالی دماغ اور بلند حوصلہ شخص اور پبلشر کی حیثیت سے بالکل بے تعصب ہیں اور گو ان کے مطبع میں اسلامی مذہبی کتابیں بہت کثرت سے طبع ہوتی ہیں، لیکن وہ برہمن اور بدھ مت والوں کی کتابیں بھی ایسی مستعدی سے شائع کرتے ہیں جس مستعدی سے اسلامی کتب اور رسالے کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مطبع نول کشور حضرت گنج بخش کے متعلق بے شمار عمارتیں ہیں، جو ایک وسیع رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور صدہا آدمی اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مطبع میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ٹرکی، افغانستان، عرب اور یورپ سے فرمائشیں آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی۔ منشی نولکشور ایک ایسے ہوشیار شخص ہیں کہ ولایت سے ٹائپ تک نہیں منگواتے، بلکہ حروف ڈھالنے کا ایک ایسا کرتب سیکھ لیا ہے کہ خود تیار کرا لیتے ہیں۔ اس بڑے کارخانہ کا بہت بڑا کام پتھروں سے ہوتا ہے۔ پریسوں کے چلنے کے متعدد کمرے ہیں۔ میں نے ایک کمرے میں اکسٹھ پریس شمار کئے، جو ہاتھوں سے چلائے جاتے ہیں اور ہر شخص کو اپنے اپنے کام میں مصروف پایا۔ پتھروں کی تعداد بے شمار تھی جن کے چالان جرمن وغیرہ سے برابر چلے آتے ہیں۔ البانی واقع پیرس کے کارخانے کی طرح کارخانہ نولکشور میں تصنیف و تالیف کا بہت بڑا کام کارخانہ کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اس کارخانہ کا گودام عجائبات میں سے ہے اس مطبع میں بارہ سو آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔"
صحیفہ زریں ص۵ (مرتب)

نے جاری کیا تھا کہ اخبارات کے ذکر میں بیان ہوا۔ اُن کی موت ۱۸۹۵ء میں واقع ہوئی اور وفات کے وقت انہوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی جائداد اور کاروبار چھوڑا۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب آنجہانی نے اُردو و ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اور اب ان کے ہونہار فرزند منشی بشن نرائن صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ اور نولکشور پریس آپ کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

داستان امیر حمزہ صاحبقران | ایک جسیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں شیخ ابو الفضل فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جن کی مجموعی تعداد سترہ اور صفحات سترہ اٹھارہ ہزار سے کم نہ ہوگی سب سے مشہور دفتر اوّل مسمّٰے بہ نوشیرواں نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوشربا سات جلدوں میں ہے۔ اور موخرالذکر بہت مقبول عام ہے طلسم ہوشربا کی اوّل چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایان نے بھی کیا تھا۔ نوشیرواں نامہ کا ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمائش سے شیخ تصدق حسین داستان گو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے۔ جو پیغمبر اسلام صلوٰۃ اللہ علیہ والسلام کے عم بزرگوار تھے جس میں ایک قصہ سے سیکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔[۱]

ص[۱] داستان امیر حمزہ کی اشاعت مطبع منشی نولکشور کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ کل داستان کا ترجمہ ۴۶ جلدوں میں ہے۔ ہر جلد کے اوسطاً ایک ہزار صفحات ہیں۔ اس طرح کل داستان تقریباً ۴۶ ہزار بڑے سائز کے صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر داستان کے ۲۰ صفحات بھی روزانہ پڑھے جائیں تو چھ سال دس ماہ ۲۵ دن میں ختم ہوگی۔

داستان کے ترجموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔ جو ڈاکٹر گیان چند کی کتاب شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔

۱۔	نوشیرواں نامہ	۲ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۸۹۳ء
	ہرمز نامہ	۱ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۹۰۰ء
	ہومان نامہ	۱ جلد	مولفہ احمد حسین قمر	۱۹۰۱ء
۲۔	کوچک باختر	۱ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۸۹۲ء کے بعد
۳۔	بالا باختر	۱ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۸۹۲ء کے بعد
۴۔	ایرج نامہ	۲ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۸۹۲ء کے بعد
۵۔	طلسم ہوشربا	ابتدائی ۴ جلد	مترجمہ محمد حسین جاہ	جلد اوّل ۱۸۸۳ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بوستان خیال | اس کی نو ضخیم جلدیں ہیں اور اس کے مصنف میر تقی خیال[1] سمجھے جاتے ہیں جو اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے۔ مگر آخر میں دلی آ گئے تھے۔ یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستان امیر حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ اُنہیں کے زمانے میں اور اُنہیں کے حکم سے اختتام کو پہنچی۔ اس کے تقریباً چار ہزار

بقیہ ح

			دوئم	
			سوئم	۱۸۸۹ء
			چہارم	
	آخری تین جلدیں	مترجمہ احمد حسین قمر	پنجم	۱۸۹۱ء
			ششم	۱۸۹۱ء
			ہفتم	۱۸۹۲ء
	صندلی نامہ	اجلد	مترجمہ سید اسمٰعیل اثر	۱۸۹۵ء
۷-	تورج نامہ	جلد اوّل	مترجمہ پیارے مرزا بہ اعانت تصدق حسین	
		جلد دوئم	مترجمہ تصدق حسین بہ تصحیح اسمٰعیل اثر	
۸-	لعل نامہ	۲ جلد	مترجمہ تصدق حسین	۱۸۹۶ء
	آفتاب شجاعت	۵ جلد	مصنفہ تصدق حسین	۸-۱۹۰۳ء
	گلستان باختر	۳ جلد	مصنفہ تصدق حسین تصحیح اسمٰعیل اثر دو جلد	۱۹۰۹ء
			تیسری جلد	۱۹۱۷ء
	بقیہ طلسم ہوشربا	۲ جلد	مصنفہ احمد حسین قمر	۱۹۱۱ء
	طلسم فتنۂ نور افشاں	۳ جلد	مصنفہ احمد حسین قمر	۱۸۹۶ء
	طلسم ہفت پیکر	۳ جلد	مصنفہ احمد حسین قمر	۱۳۱۵ھ
	طلسم خیال سکندری	۳ جلد	مصنفہ احمد حسین قمر	۱۹۰۰ء
				۱۸ء
	طلسم زعفران زار سلیمانی	۲ جلد	مصنفہ احمد حسین قمر و تصدق حسین و ترتیب شیخ اسمٰعیل اثر	(مرتب)

ص[1] خیال کا سن وفات ۳، ۱۱ھ / ۶-۰-۹۵، ۱ء ہے۔ (مرتب)

ص[2] خواجہ امان نے حدائق الانظار کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ خیال نے ابھی داستان کا حصہ زمردی نام اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

صفحات ہیں۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اُردو میں خواجہ بدرالدین معروف بہ خواجہ امان[۲] دہلوی نے اور دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظرثانی بھی کی۔

ان سب کتابوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور کیرکٹر نویسی ان میں مفقود ہے۔ کوئی معین پلاٹ بھی نہیں ہے چند مشہور لوگوں کے بعید از قیاس افسانے ہیں جن میں جنات اور دیوزادوں سے لڑائی اور ساحروں سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ کبھی کبھی وہ سحر و طلسم میں پھنس بھی جاتے ہیں مگر آخر میں فتح یاب نکلتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلاتے ہیں۔ قصّہ کے تمام واقعات میں ایسی یکسانی ہے کہ جی اُکتا جاتا ہے کوئی تنوع اور جدت نہیں اور روزانہ واقعات زندگی کا تو کہیں ذکر نہیں ہے۔ اکثر یہ قصّے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوتے اور اب منشی نولکشور کے مطبع میں بڑے آب و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور نے ناول کی آفرینش میں بہت کچھ مدد دی یعنی اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب کی تصنیف سے لوگوں کے دلوں میں افسانہ کا شوق پیدا کر دیا یہ ضرور ہے کہ اس کی مصنوعی مقفیٰ اور مسجع عبارت نے کہیں کہیں مطلب کو گنجلک کر دیا۔ اور تسلسل بیان میں فرق ڈال دیا ہے۔ واقعات معمولی اور زبان نہایت پر تصنع اور پیچیدہ ہے۔

البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصّے موجودہ ناول کی حدود تک پہونچ جاتے ہیں گو کہ ان

بقیہ حاشیہ:۔

اور اسمٰعیل نامہ لکھا تھا کہ محمد شاہ فوت ہو گیا۔ ۱۱۶۱ھ کے بعد وہ بنگال چلے گئے۔ یہاں خیال نے جعفر خاں ناظم بنگال کے لڑکوں کی درخواست پر بوستان خیال کی تکمیل کی۔ سکسینہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ بوستان خیال محمد شاہ کے حکم سے اختتام کو پہنچی۔ داستان ۴۲ء میں شروع ہوئی تھی اور ۵۵ء میں مرشد آباد میں مکمل ہوئی۔ (مرتب)

صـ۲ـ۔ خواجہ امان کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہوا۔ (معاصر نمبر ۲)۔ (مرتب)

خواجہ امان کے سنین تراجم اور طباعت کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند کی تصنیف سے تیار کی ہے

		ترجمہ	سن اشاعت	
جلد ۱	حدائق الانظار	۱۲۷۵ھ	۱۲۸۲ھ	
۲	ریاض الابصار	۱۲۸۳ھ	۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء	
۳	شمس الانوار	۱۲۸۵ھ	۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء	
۴	بدر الآثار	۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء	۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء	
۵	نجم الاسرار	۱۲۹۲ھ	۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء	
۶	مصباح النہار	۱۸۷۹ء	۱۸۷۹ء	(مرتب)

میں بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پوری پیروی نہیں پائی جاتی۔ وہ اول سے آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مضمون یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست وعظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رویائے صادقہ، توبۃ النصوح، مراۃ العروس وغیرہ میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہے۔ جو بہت زور کے ساتھ سکھایا گیا ہے۔ بےشک مولوی صاحب نے یہ بہت کمال کیا کہ مافوق العادت اور حیرت انگیز چیزوں کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خارج کر دیا اور معمولی واقعات زندگی کو ایک منظم پلاٹ کی صورت میں دلچسپی سے بیان کیا۔ ان کی قابل قدر تصانیف جو اُس زمانے کے رسم و رواج اور طرق و عادات کی چلتی جاگتی تصویریں ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی قوت استدلال و مشاہدہ کے شاہد عادل ہیں زبان پر اُن کو پوری طرح قدرت حاصل ہے اور گو کہ اُس میں کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی سلاست و روانی ان کے ناولوں کی خاص مابہ الامتیاز چیز ہے سلسلۂ واقعات بھی وہ خوب قائم رکھتے ہیں گو کہ کہیں کہیں اس قاعدے کی خلاف ورزی سے قصّے کے تناسب میں فرق پڑ جاتا ہے کیرکٹر دلچسپ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔

اودھ پنچ اور اُس کی ادبی خدمات منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اُردو پر احسان عظیم کیا۔ نثر کی ایک خاص شان پیدا کی مذاق ظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا۔ داخل نثر ہوئے۔ زبان میں بلیغ الفاظ شامل کر کے گرانقدری پیدا کی۔ پُرزور طریقہ سے کتابوں کی تنقید کی۔ ناول نویسی میں ترقی کی۔ اودھ پنچ سب سے پہلا اخبار ہے جس نے ایک مقرر اور معیّن پالیسی اختیار کی۔ وہ محض خبر رسانی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ پبلک معاملات میں اپنی آزادانہ رائے رکھتا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رؤسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا وہ اصول کانگریس کا حامی، ہندو مسلم اتحاد میں ساعی، البرٹ بل کی تحقیر اور ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے کا سخت مخالف تھا لیکن اسی کے ساتھ سوشل معاملات میں بہت قدامت پرست سرسید اور ان کی تجاویز کا دشمن اور تعلیم نسواں اور پردہ کے توڑنے کا بھی مخالف تھا۔ غرض کہ اس اعتبار سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ اُس کے اکثر نامہ نگار نہایت قابل اور فاضل لوگ تھے۔ مثلاً علاوہ خود منشی سجاد حسین مرحوم کے مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں مضامین لکھتے تھے) تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد۔ جن میں سے بعض کے کچھ حالات علیحدہ بھی لکھے جائیں گے۔

اودھ پنچ[1] یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اُس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور

---

[1] - اس زمانے میں لوگ اس قدر ٹھس ہو گئے ہیں اور مذاق و ظرافت کا اُن میں اس قدر فقدان اور

وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اُتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً جو فسانہ آزاد۔ حالی

بقیہ حاشیہ: اور اس شئے لطیف کی اُن میں اتنی کمی ہوگئی ہے کہ اودھ پنچ ایسا بے مثل ہنسنے ہنسانے والا پرچہ جو مذاق کے پیرایہ میں نصیحت اور ظرافت کے ساتھ عبرت سکھاتا اور انشا پردازی کا بھی بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اپنے سابق ایڈیٹر کے ساتھ خود بھی مر گیا تھا مگر خدا بھلا کرے حکیم ممتاز حسین عثمانی موجودہ ایڈیٹر کا کہ انھوں نے اس کو زندہ کیا اور اس کے تن بے جان میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ ایک معنی میں تو ہم حکیم صاحب موصوف کو منشی سجاد حسین مرحوم پر ترجیح دیں گے۔ اس وجہ سے کہ منشی صاحب مرحوم کے وقت میں تو بہت سے قابل اہل سخن اُن کے ہم مذاق اور یار و مددگار موجود اور اُن کا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت تیار تھے۔ پبلک بھی قدرداں تھی۔ حساس تھی۔ باحمیت تھی۔ اودھ پنچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسی طرح ڈرتے تھے جیسے شوخ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنما چہرہ صفحاتِ اودھ پنچ کے مجلے آئینے میں دیکھتا تو اپنی ڈراؤنی صورت سے ڈر کر بُرے افعال سے توبہ کر لیتا اور اودھ پنچ کا سالانہ خریدار بن جاتا۔ اس طرح ہم خرما ہم ثواب کے اصول پر خود اودھ پنچ کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو جاتے تھے ع وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب اُلٹا مگر اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ لوگوں کے اخلاق بدل گئے اطوار متغیر ہو گئے۔ ظرافت کے قدرداں اور اس سے فائدہ اُٹھانے والے باقی نہ رہے۔ لوگوں سے حس اور اثر پذیری کا مادہ جاتا رہا اور ظرافت کا انداز بھی بدل گیا۔ مگر پھر بھی بُری بھلی جیسی ہے۔ ایسی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں اودھ پنچ کا نظیر و عدیل نہیں وہ اپنی آپ مثال اور قلمرو ظرافت میں حاکم علی الاطلاق ہے۔ ہزار آفریں ہے۔ اس کے فاضل ایڈیٹر کو انھوں نے اس کی روایات قدیمہ کو قائم رکھا بلکہ زمانہ حال اور ضروریات کے مطابق مضامین کا معیار بلند کر دیا۔ پورا پرچہ بیچارے تن تنہا نکالتے ہیں اور ٹھیک وقت پر نکالتے ہیں۔ جو ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کے لئے قابل فخر اور قابلِ تقلید ہے۔ اس موقعہ پر ہم ایک بات اپنے مکرم فاضل دوست سے ضرور گذارش کریں گے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے پرچہ سے "بوالفضین" کا ذکر خیر اور اُن کی بات چیت کا انداز ذرا کم کردیں بلکہ اگر بالکل خارج کر دیں تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مقامات پر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس جنس کی بھی مانگ ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مولانا سابق مسٹر محمد علی اپنی مکہ شریف والی عبا اور عمامہ دارم چرا نپوشم کے قاعدے سے پہن کر اسمبلی کے اجلاس میں تشریف لے گئے۔ پنڈت مدن موہن مالوی اُن کی اس نئی وضع کو دیکھ کر کہنے لگے۔ کہ "اخاہ" مولانا محمد علی ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ بیگم صاحب بھوپال آ رہی ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اُس جگہ جہاں عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ اگر آپ مجھ کو بیگم صاحب سمجھے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بہر طور یہ اصول کہ اودھ پنچ کے بعض ناظرین عورتوں سے کم یا زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

داغ۔ گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر بھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں۔ مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اُس کے صفحات درج ہوتے رہے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں محرم۔ چہلم۔ عید۔ بقر عید۔ شب برات۔ ہولی۔ دیوالی۔ بسنت۔ عیش باغ کے میلے۔ ناچ رنگ کے جلسے اور دعوتیں۔ مشاعرے۔ اجلاس ہائے عدالت۔ مرغ و بٹیر کی پالیاں۔ الکشن کے مقابلے وغیرہ۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ | منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ سے پنشن لے کر حیدرآباد دکن گئے اور وہاں سول جج ہو گئے تھے۔ منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کیننگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنوں مختلف ملازمتیں کر کے ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار "اودھ پنچ" نکالا۔ ان کی ذاتی تاہیت طبیعت داری اور وسیع الاخلاقی سے اُن سے اُن کے بہت سے دوست ہم مذاق و ہم مشرب پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اُن کے اخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب سے کہ وہ خود اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے اودھ پنچ کی نامہ نگاری چھوڑ دی جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آگے آئے گا۔ منشی سجاد حسین پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک ظریفانہ رنگ کا اردو اخبار نکالا[۱] جس نے ملک اور زبان دونوں کی معقول خدمت انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیک دل صاف

بقیہ حاشیہ:۔ لہٰذا اُن سے ہمکلام ہونے کے لئے بھی "نُوالنصیبین" کی ضرورت پڑتی ہے ایک حد تک تو صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اس میں تجاوز ہو جاتا ہے اور سیاسی و علمی و معاشرتی جملہ معاملات میں حجاو بے حجاب نوالنصیبین یا اُن کی ہیلی منطق آرا بیگم دریائے لطافت کی بی نورن کی طرح آن کر کود پڑتی ہیں اور وسیرائے لارڈ اروں سے لے کر شیخ حبیب اللہ صاحب تک سے سیاسی اور علمی مسائل میں اپنے خاص انداز میں ہمکلام ہونے لگتی ہیں تو سمجھ نہیں آتا کہ یا اللہ ان باتوں کے واسطے کیا کوئی مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا کہ عورتوں کی طرف سے اور ان کی زبان میں یہ مطالب ادا کئے گئے اور اس سے قسن مسئلہ اور اخبار کے ظریفانہ انداز میں کیا اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں ابھی اس درجے کو نہیں پہنچی کہ ایسی عورتیں پیدا ہو گئی ہوں جو سیاسی یا علمی معاملات میں کوئی صائب رائے رکھتی یا اس کا اظہار کر سکتی ہوں پھر اس نئی اُپج سے اور اخبار پر ریختی منثور کا الزام عائد کرنے سے کیا فائدہ (مترجم)

صہ[۱] یہ درست نہیں کہ منشی سجاد حسین نے پاک و ہند میں پہلا مزاحیہ اخبار جاری کیا۔ اودھ پنچ سے پہلے بھی مزاحیہ اخبار جاری تھے۔ پہلا مزاحیہ اخبار مذاق رام پور تھا جو ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ اودھ پنچ

(باقی اگلے صفحہ پر)

بقیہ حاشیہ:-

سے مزاحیہ صحافت کا عروج شروع ہوتا ہے اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس میں پنچ کا لفظ مزاحیہ اخباروں کے نام کا جزو بن گیا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک شائع ہونے والے پنچ اخبارات کی فہرست سے ان اخبارات کے فروغ کا اندازہ ہو سکے گا۔ ڈاکٹر احراز نقوی نے اردو نامہ جنوری ۱۹۶۴ء میں ۳۰ پنچ اخبارات کی فہرست پیش کی تھی۔ مرتب نے ۵۰ پنچ اخباروں کی فہرست بنائی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱- مدارس پنچ ۱۸۵۹ء
۲- بہار پنچ پٹنہ ۱۸۷۶ء
۳- پنجاب پنچ لاہور ۱۸۷۶ء
(۱۸۷۶ء میں جاری ہوا۔ کچھ عرصہ بند رہ کر ۱۸۷۸ء میں پھر نکلا)
۴- روہیل کھنڈ پنچ ۱۸۷۶ء
۵- اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء
۶- سرپنچ ہند لکھنؤ ۱۸۷۷ء
۷- جالندھر پنچ ۱۸۷۸ء
۸- کلکتہ پنچ کلکتہ ۱۸۷۹ء
۹- دہلی پنچ لاہور ۱۸۸۰ء
۱۰- بنگال پنچ کلکتہ ۱۸۸۰ء
۱۱- انڈین پنچ لکھنؤ ۱۸۸۰ء
۱۲- بادۂ آدم پنچ بنارس ۱۸۸۱ء
۱۳- بنارس پنچ ۱۸۸۱ء
۱۴- راجپوتانہ پنچ ۱۸۸۱ء
۱۵- میرٹھ پنچ ۱۸۸۱ء
۱۶- سرپنچ سیدپور ۱۸۸۲ء
۱۷- سرپنچ ۱۸۸۳ء
۱۸- لکھنؤ پنچ ۱۸۸۳ء
۱۹- کٹھیر پنچ ۱۸۸۳ء
۲۰- سرپنچ بمبئی ۱۸۸۳ء
۲۱- ہریانہ پنچ ۱۸۸۴ء
۲۲- کرناٹک پنچ ۱۸۸۴ء
۲۳- جھجر پنچ ۱۸۸۴ء
۲۴- الپنچ پٹنہ ۱۸۸۵ء
۲۵- کڑا پنچ الہ آباد ۱۸۸۵ء
۲۶- دکن پنچ مدارس ۱۸۸۵ء
۲۷- قنوج پنچ ۱۸۸۵ء
۲۸- فتح گڑھ پنچ ۱۸۸۵ء
۲۹- برار پنچ ۱۸۸۶ء
۳۰- گجرات پنچ ۱۸۸۶ء
۳۱- فیروزپور پنچ ۱۸۸۶ء
۳۲- سرپنچ میرٹھ ۱۸۸۶ء
۳۳- شاہجہان آباد پنچ ۱۸۸۷ء
۳۴- صدر پنچ دہلی ۱۸۸۷ء
۳۵- دکن پنچ ۱۸۸۷ء
۳۶- آگرہ پنچ ۱۸۸۹ء
۳۷- لاہور پنچ ۱۸۹۱ء
(پہلے اس اخبار کا نام پاٹے خاں تھا۔ نیا نام جنوری ۱۸۹۱ء کو اختیار کیا)
۳۸- بے مثل پنچ ۱۸۹۲ء
۳۹- بندھیل کھنڈ پنچ جھانسی ۱۸۹۴ء

(باقی اگلے صفحہ پر)

باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور کبھی مذہبی رنگ کے مضامین کو اپنے اخبارات میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ اُن کی التحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقفیت اور معلومات کے ساتھ مذاق و ظرافت اور لطائف و ظرائف بکثرت ہوتے تھے۔ عبارت میں سیاختگی اور شستگی بہت نمایاں تھی۔ اُن کے وہ فرضی خطوط جو ہندوستانی روسائے کے نام ہیں ایک عجیب انداز کے ہیں اور اُن میں ایک خاص طریقہ سے نصیحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار بھی تھے۔ چنانچہ اُن کے ناول حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، پیاری دنیا، احمق الذین، میٹھی چھری، کایا پلٹ، حیات شیخ چلی مشہور ہیں[۱] اور ان سب کی عبارات نہایت بلیغ اور دلچسپ ظریفانہ انداز میں ہیں ۱۹۰۱ء میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک جسمانی تکالیف اور آلام و مصائب میں مبتلا رہ کر ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا اور اودھ پنچ سابق ۱۹۱۲ء میں اُن کی زندگی میں بند ہو گیا تھا[۳]

| مرزا مچھو بیگ[۴] عاشق | مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشق تخلص مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے |

شرفائے لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ بچپنے میں ورزش کا بڑا شوق تھا اور بانک پٹا وغیرہ اپنے نانا سے سیکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نسیم دہلوی سے تلمذ تھا۔ بہت خوشگوار اور رنگین طبع شاعر تھے۔ مگر نظم سے زیادہ نثر میں ان کو شہرت حاصل ہوئی۔ جس میں وہ صفائی زبان صحت محاورہ اور بذلہ سنجی کے لئے مشہور تھے۔ آخر عمر تک "ستم ظریف" کے لقب سے اودھ پنچ میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ اُن کے مضامین پڑھنے کے قابل ہیں اور محاورہ اور صفائی کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔ مطبوعہ تصانیف نظم و نثر حسب ذیل ہیں (۱) گلزار نجات میلاد شریف (منظوم) (۲) آفتاب قیامت (لکچر کے انداز میں ایک ظریفانہ نظم جو الہ آباد میں پڑھی گئی۔) بہار ہند (اُردو محاورات کی ایک ناتمام لغت) مثنوی نیرنگ خیال۔ بعض مضامین جو اودھ پنچ میں نکل چکے تھے اور "چشم بصیرت" کے

بقیہ حاشیہ

۴۰۔ دہلی پنچ دہلی	۱۸۹۵ء	۴۳۔ پنچ بہادر بمبئی جون ۱۹۰۰ء سے قبل بند ہو گیا	
۴۱۔ پنچ امرتسر	۱۸۹۵ء میں جاری تھا	۴۴۔ نوشاہ پنچ	۱۹۰۰ء میں جاری ہوا
۴۲۔ بمبئی اودھ پنچ بمبئی	۱۸۹۶ء	۴۵۔ ہندی پنچ بمبئی (مرتب)	

[۱] حیات شیخ چلی منشی سجاد حسین کی تصنیف نہیں۔ اس کے مصنف منشی سجاد حسین کسمنڈوی ہیں۔ (مرتب)

[۳] اودھ پنچ کا دوبارہ اجرا ۱۹۱۸ء میں حکیم ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں ہوا۔ اودھ پنچ کا یہ دور غالباً ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ (مرتب)

[۴] وفات ۱۸۹۵ء (مرتب)

نام سے علیحدہ شائع ہوئے ہیں۔ اُن کا اُردو دیوان اُن کے صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوا۔ منشی بالمکند گپتا سابق ایڈیٹر بھارت متر کلکتہ اُن کے مشہور شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نہایت ہشاش بشاش، خلیق و متواضع اور وسیع الاحباب تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خودداری اور آزادی یہاں تک تھی کہ ملازمت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ اس وجہ سے اس میں پابندی عائد ہوتی تھی۔ سیاست سے بھی شوق تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کانگریس میں شریک ہوئے تھے مختصر یہ کہ صفائیٔ زبان اور بذلہ سنجی آپ کے خاص جوہر ہیں۔

ترلوک ناتھ ہجر[1] پنڈت ترلوک ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر پنڈت بشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے تعلیم انگریزی سے فراغت کر کے اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا، کچھ دنوں تک لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی، نہایت شریف الطبع، ملنسار اور ہردلعزیز تھے۔

نواب سید محمد آزاد[2] نواب سید محمد آزاد۔ آئی۔ ایس۔ او ۱۸۴۶ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولت مند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی اور یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب "برہان قاطع" کے بارہ میں معرکے رہے ہیں۔ انگریزی گو کہ پرائیوٹ طور پر پڑھی تھی۔ مگر اس زبان میں ان کو مہارت کامل حاصل تھی۔ ابتدا سے ملازمت سب رجسٹراری سے ہوئی اور اسی لائن میں ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل رجسٹری کے معزز عہدہ تک پہنچے۔ بنگال کونسل میں دو دفعہ کرسیٔ ممبری کو زینت بخشی اور امپیریل سروس آرڈر (آئی۔ ایس۔ او) کا نشان اعزازی آپ کو عطا ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے پہلے آپ ایک فارسی اخبار "دوربین" میں بزبان فارسی مضامین لکھتے تھے۔ مگر اس کے بعد اودھ اخبار، اودھ پنچ، آگرہ اخبار وغیرہ مختلف اخبارات و رسائل میں زبان اردو میں لکھتے رہے ۱۸۷۸ء میں ان کا ناول "نوابی دربار"[3] نکلا جس میں مذاق کے پیرایہ میں پرانے رنگ کے فاقہ مست نوابوں کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا اور بہت مقبول عام ہوا۔ آپ انگلستان بھی گئے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ آپ کی کتاب موسوم بہ "نئی لغت" ظریفانہ رنگ

---

[1] وفات ۱۸۹۲ء (مرتب)

[2] وفات ۱۹۲۶ء

[3] نوابی دربار ڈرامہ ہے، ممتاز منگلوری نے مکتبہ خیابان ادب لاہور کی طرف سے شائع کیا۔

کی مقفیٰ نہایت دلچسپ کتاب ہے[1]

جوالا پرشاد برق | منشی جوالا پرشاد متخلص بہ برقؔ ایک نہایت ذہین اور قابل شاعر و نثار دونوں تھے ۱۸۶۳ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کر کے ۱۸۷۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں بی۔ اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی ۱۸۸۵ء تک وکالت کر کے منصف ہو گئے جس میں ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ و سشن جج کے درجے تک پہونچے۔ ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں بعارضہ پلیگ اس دار فانی سے کوچ کیا۔ نہایت طبیعت دار اور ذہین شخص تھے۔ فسانۂ آزاد کی عبارت کے اس قدر دلدادہ تھے کہ خود بھی وہی طرز ایک حد تک اختیار کیا آپ کی مثنوی بہار ایک نہایت اعلےٰ درجے کی تصنیف ہے جو سر سید مرحوم کو بہت پسند تھی۔ برق علاوہ شاعر خوشگوار ہونے کے مترجم بھی اعلےٰ درجے کے تھے۔ بنکم چندر چٹرجی کے اکثر مشہور ناولوں کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہیں۔ مثلاً بنگالی دلھن، پرتاپ، اروہنی، مرنالنی، مار آستین وغیرہ۔ آپ کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس بامحاورہ اور شیریں ہوتا ہے کہ مطلق ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شکسپیئر کے ڈراماؤں کا بھی ترجمہ آپ نے کیا تھا۔ مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر شائع نہ ہو سکے[2]

احمد علی شوق[3] | منشی احمد علی شوق قدوائی امیر مرحوم کے معزز شاگردوں میں تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ چند نا تک نثر و نظم بھی آپ کی یادگار ہیں جس میں "قاسم و زہرہ" اور "میکفرسن و لوسی" زیادہ مشہور ہیں۔ مثنویاں آپ کی بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں۔ علی الخصوص "عالم خیال" جس کی زبان نہایت لطیف و شیریں ہے بیحد مقبول ہوئی، یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی واپسی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اس کی

---

[1] - آزاد کی ایک اہم تصنیف خیالات آزاد ہے۔ یہ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۰۰ء میں قومی پریس لکھنؤ نے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۱ء میں رضوانی پریس کلکتہ سے چھپا، پہلے ایڈیشن میں سولہ مضمون اور دوسرے میں اضافہ کے ساتھ ۲۰ مضامین تھے۔ ۱۹۶۷ء میں خیالات آزاد ڈاکٹر غلام حسین نے مرتب کی جسے مکتبہ خیابان ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

[2] - سکینہ نے شکسپیر کے جن تراجم کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں سے دو ڈراموں کے ترجموں کا پتہ چلتا ہے جو شائع ہوئے۔ ۱۔ معشوقۂ فرنگ عرف گلزار فیروز۔ ترجمہ رومیو اینڈ جیولٹ مطبع منشی نولکشور ۱۸۹۶ء۔

۲۔ اوتھیلو ۱۸۹۶ء۔ (مرتب)

[3] - ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ کے مضافات جگور میں پیدا ہوئے، ۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو مرض استسقاء انتقال فرمایا

مرتب

عبارت فارسی اضافتوں سے خالی ہے۔ دیوان بھی آپ کا شائع ہو گیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے آپ فن عروض اور نکات ادبیہ سے پوری طرح واقف تھے اور نثر کے مضمون میں بھی صفائی اور صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ممتاز شعرائے اردو کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی جس کو پُر کرنا مشکل ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ پنڈت رتن ناتھ ور متخلص بہ سرشار گزشتہ صدی کے آخر میں ایک عجیب زندہ دل باکمال شخص گذرے ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے[1] صرف چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی پنڈت نرنجن ناتھ سرکاری

---

[1] سرشار کے سن پیدائش میں اب تک اختلاف موجود ہے سنہ پیدائش معلوم کرنے کا واحد ماخذ ذریعہ چکبست کا سرشار پر مقالہ ہے۔ جس کی مدد سے سبھی ناقدین سن پیدائش بتاتے رہے ہیں۔ چکبست لکھتے ہیں۔

"اندازاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے، تو محمد علی شاہ کا آخری عہد تھا" (مضامین چکبست ص ۳۳)

چکبست سرشار کی وفات کے وقت عمر کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"۲۱؍جنوری ۱۹۰۳ء کو اس دارفانی سے رحلت کی۔ تقریباً پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔"

(مضامین چکبست ص ۹۴)

تاریخی اعتبار سے ان دونوں بیانوں میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے بیان کے مطابق سرشار محمد علی شاہ کے آخری عہد میں پیدا ہوئے۔ محمد علی شاہ کا زمانہ ۸؍جولائی ۱۸۳۷ء سے ۷ مئی ۱۸۴۲ء تک ہے۔ آخری عہد واضح سن کی صراحت نہیں کرتا۔ اگر سرشار ۱۸۴۲ء میں بھی پیدا ہوئے ہوں تو وفات کے وقت ۱۹۰۳ء میں اُن کی عمر ۶۰ برس ہونی چاہیئے۔ جبکہ چکبست ۵۶-۵۵ برس بتاتے ہیں۔ ۵۶-۵۵ برس کے حساب سے اُن کی پیدائش ۴۷-۱۸۴۶ء بن جاتی ہے۔ لطیف حسین ادیب نے اپنی کتاب "سرشار کی ناول نگاری" میں یہی سن وفات کے وقت عمر کا حساب لگا کر مقرر کیا ہے۔ اور یہ سن چکبست کے اپنے بیان میں تضاد کے باعث غلط ہو جاتا ہے۔ اگر چکبست کا ۵۶-۵۵ برس کا مفروضہ صحیح مان لیا جائے کہ اس حساب سے سن پیدائش ۴۷-۱۸۴۶ء بنتا ہے۔ مگر چکبست کے بیان کے بموجب یہ محمد علی شاہ کا آخری عہد تھا اور تاریخی اعتبار سے یہ بات غلط ہے محمد علی شاہ کا عہد ۴۲-۱۸۳۷ء ہے۔ ۴۷-۱۸۴۲ء امجد علی شاہ کا عہد ہے۔ چکبست سرشار کی تاریخ وفات بھی غلط درج کر گئے ہیں۔ سرشار کی صحیح تاریخ وفات معلوم کرنے کے لئے دبدبہ سکندری ۱۷؍فروری ۱۹۰۲ء کا حوالہ ضروری ہے۔ اس کے مطابق ۲۷؍جنوری ۱۹۰۲ء کو فوت ہوئے۔ چکبست نے اپنے مضمون میں عمر ۵۵-۵۶ برس اور سن وفات ۱۹۰۳ء لکھا ہے۔ گویا انہوں نے عمر ۱۹۰۳ء تک شمار کی ہے۔ اس طرح پیدائش ۴۷-۱۸۴۶ء

(باقی اگلے صفحہ پر)

خزانے میں ملازم تھے مگر جوانی میں انتقال کر گئے۔ سرشار عربی فارسی انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے انگریزی انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی۔ مگر اس میں کوئی ڈگری نہیں حاصل کی۔ سب سے پہلے ضلع سکول کھیری میں ٹیچر ہوئے اور یہیں سے وہ "مراسلہ کشمیری" میں جو اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کا ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا اور "اودھ پنچ" میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ یہ آرٹیکل گو کہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی اُن کی آئندہ تصانیف اور شہرت کا ایک سنگ بنیاد ضرور تھے۔ سرشار ترجمہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور اپنا اس قسم کا کام سررشتہ تعلیم کے کسی رسالہ میں بھیجا کرتے جہاں وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم اس کو بہت پسند کرتے اور اُن کی قابلیت کی داد دیتے تھے۔ سرشار کبھی کبھی "مرآۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں بھی اپنے مضامین بھیجتے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں اُنھوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں انہوں نے اکثر سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ عمدہ اور سلیس اُردو میں کیا ہے۔ اسی سال وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور یہ اس طور پر ہوا کہ ڈاکٹر گریفتھ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے ان کا تعارف منشی نولکشور صاحب مالک اخبار سے کرایا جن کو اس وقت اخبار کے لئے ایک قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ سرشار نے اپنی مشہور و معروف تصنیف فسانہ اخبار کا سلسلہ اسی اودھ اخبار میں شروع کر دیا جو دسمبر سنہ ۱۸۷۹ء تک قائم رہا اور سنہ ۱۸۸۱ء میں "فسانہ آزاد" بصورت ایک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اسی عرصہ میں اودھ پنچ اور اودھ اخبار میں وہ مشہور معرکہ شروع ہوا جو عرصہ دراز تک قائم رہا۔ "اودھ پنچ" اودھ اخبار اور اس کے ایڈیٹر کو اپنے ظریفانہ انداز میں سیکڑوں صلواتیں سناتا تھا اور اس کا جواب بھی ترکی بہ ترکی پاتا تھا۔ آخر بعض دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہوگئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ سرشار دو اور مباحثوں میں بھی شریک ہوئے تھے ایک بیان یزدانی میرٹھی ایڈیٹر "طوطی ہند" اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ[1]

بقیہ حاشیہ:-

میں درست ہے۔ مگر سرشار کا سنہ وفات ۱۹۰۲ء ہے اس لئے عمر ۵۵-۵۴ برس ہوئی۔ اس طرح سنہ پیدائش ۴۶-۱۸۴۵ء متعین ہوتا ہے۔ لطیف حسین ادیب، پریم پال اشک اور دیگر لکھنے والوں نے چکبست کے مفروضے کے مطابق سرشار کی عمر کو بنیاد بنا کر سن پیدائش نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چکبست کے مفروضے ہی کو ماننا ہے تو پھر سن پیدائش ۴۶-۱۸۴۵ء ہوگا، نہ کہ ۴۷-۱۸۴۶ء۔ (مرتب)

[1] ہم کو یاد پڑتا ہے کہ یہ مباحثے سرشار سے نہیں بلکہ اودھ پنچ سے ہوئے تھے کیونکہ اودھ پنچ میں ایک سلسلۂ اعتراضات حالی پر ایک عرصہ دراز تک اس سُرخی سے چھپتا رہا "اے اسٹر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے"۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

سرشار کی تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں آخر الذکر ایک انگریزی ناول ڈان کوئی زوٹ کا ترجمہ ہے ۱۸۹۳ء میں انھوں نے ایک سلسلہ موسوم بہ خمکدہ سرشار شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں اُن کے ناول کڑم دھم، بچھڑی دولہن[1]، طوفان بے تمیزی، بی کہاں اور ہشو بھی شائع ہوئے مگر ان میں اُن کا زور بیان کم ہے۔ حیدر آباد جانے سے قبل کچھ دنوں وہ الٰہ آباد ہائیکورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے۔ مگر قواعد دفتر کی سختی کے وہ متحمل نہ ہو سکے اور تھوڑے ہی دنوں میں ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدر آباد گئے۔ اپنے قیام حیدر آباد کا حال ایک خط میں جو "کشمیری درپن" مارچ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پنڈت برج نرائن چکبست صاحب نے اُسی سے نقل کیا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"تقریباً چار برس ہوئے کہ میں ممبر کانگرس کی حیثیت سے مدارس آیا تھا۔ میری خوش نصیبی مجھ کو حیدر آباد لائی۔ جہاں ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمجوشی سے مجھ کو لیا اور میرے اوپر بڑی عنایتیں کیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اپنے کلام ظفر دثر کی اصلاح کے لئے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا ہے اس کے علاوہ خلعت خوشنودی اور ہر شعر پسند خاطر ہو جاتا ہے۔ ایک اشرفی عنایت فرماتے ہیں۔ حضور نظام مجھ سے پہلے ہی واقف تھے۔ پہلے دن جب میں حاضر خدمت ہوا تو نذر گزرانی اور اپنی کچھ کتابیں بھی پیشکش کیں اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی کہ ایک ٹکڑا دربار کے بیان کا میرے سیر کہسار سے اور ایک مقام جام سرشار سے سماعت فرمایا۔ میں نے ایک تاریخ شاہزادے کی ولادت کی مبارکباد میں بندگان عالی کی خدمت میں پیش کی جس کو اعلیٰحضرت نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے چاہا تو میرا جدید ناول "گور غریباں" ایک ہفتہ کے عرصہ میں شائع ہو جائے گا[2]"

بقیہ حاشیہ:۔ میدان پانی پت کی طرح پامال ہے اور آخر میں کچھ مضامین حالی کی تعریف میں بھی اس سُرخی سے نکلے تھے ؎ عیب حالی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ : اشک شوئی کر دو چار ہنر بھی کہہ دو از ترجم

[1] ۔ بچھڑی ہوئی دلہن ۔ (مرتب)

[2] ۔ گور غریباں سرشار کی ان تصانیف میں سے ہے۔ جو اب تک دستیاب نہیں ہو سکیں۔ اس ناول کی شہادت ۸ر جون ۱۸۹۹ء کے اودھ پنچ میں بھی ملتی ہے کہ سرشار کا یہ ناول پریس میں ہے، اودھ پنچ ہی میں اس کے جستہ جستہ اقتباسات چھپے تھے۔ یہی اس ناول کی یادگار رہ گئے ہیں۔ نادم سیتاپوری نے کچھ اقتباسات اپنے مضمون "گور غریباں۔ سرشار کا ایک المیہ ناول" میں شائع کئے تھے۔ یہ مضمون مرتب کی ترتیب دی ہوئی کتاب "نقد سرشار" میں دیکھئے (مرتب)

کچھ عرصہ تک سرشار دبدبۂ آصفیہ[1] کی ادارت کرتے رہے۔ اُن کا ناول چنچل نار[2] اسی اخبار میں نکلتا تھا۔ مگر پورا نہیں ہوا۔ "گورِ غریباں" جس کا ذکر ان کے خطوں میں ہے شائع نہ ہو سکا اور چنچل نار کوئی باوقعت تصنیف نہیں ہے۔ آخر عمر میں سرشار نے مے نوشی کی بڑی کثرت کر دی تھی اور یہی اُن کی قبل از وقت موت کا باعث ہوئی چنانچہ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

سرشار نہایت خوشگوار شاعر تھے اسیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے اپنا ایک قصیدہ کشمیری کانفرنس میں پڑھا تھا اور ایک مثنوی تحفۂ سرشار بھی لکھی ہے۔ جو اُس موقع پر کہی گئی تھی۔ جبکہ پنڈت بشن نرائن در کی واپسی انگلستان پر پرانے خیال کے کشمیری پنڈتوں میں ایک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کی معقول باتوں سے لوگوں کی برہمی سفرِ ولایت کی نسبت ایک حد تک رفع ہو گئی۔

عام عادات و اخلاق سرشار حقیقی معنے میں آزاد مزاج تھے۔ قوتِ حافظہ بہت قوی پائی تھی اور تعصّب اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ باتیں بہت دلچسپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبعاً ظریف واقع ہوئے تھے۔ شراب خواری نے اُن کے ساتھ وہی کیا جو درگا سہائے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک ہونہار زندگی کا جلد خاتمہ کر دیا۔ اُردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر اُنھیں کو حاصل ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ، ایک مشہور مصنف، اُردو کے زبردست زباندان، ظریف اور بذلہ سنج اور ایک طرزِ خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی شہرت کو کچھ تو لوگوں کے تعصب نے اور کچھ اُن کی ذاتی بے پروائی اور لاابالی پن نے کم کر دیا۔ اُن کی فسانۂ آزاد اور دیگر تصانیف میں اکثر جگہ جو رطب و یابس اور درجہ سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں اس کی وجہ زیادہ تر ان کے مزاج کی جلد بازی اور بے پروائی کہی جا سکتی ہے اتنی شراب نوشی کبھی اُن کے تخیل میں پراگندگی اور کبھی اُسکے خمار سے ان کا دماغ معطل اور بیکار ہو جاتا تھا۔ انہی وجوہ سے وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظرِ ثانی کرتے اور نہ کبھی پروف پڑھتے کے علاوہ تھے ہمیشہ برجستہ اور قلم

---

[1] اس رسالہ کا نام دبدبۂ آصفی تھا۔ سرشار ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ذیلقعدہ ۱۳۱۶ھ تک اس کے مدیر رہے۔ (مرتب)

[2] چنچل نار ایک متنازعہ فیہ تصنیف ہے۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے۔ اس پر کشن پرشاد شاد کا نام درج ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۴ء میں مطبع شمسی دکن سے شائع ہوئی تھی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ سرشار کی تصنیف ہے۔ مرتب نے اس کتاب کی اولین چھ اقساط دبدبۂ آصفی میں پڑھی ہیں۔ ناول کے اسلوب بیان اور بعض دیگر شہادتوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول سرشار کا لکھا ہوا ہے۔ یا اصلاح کے بعد بالکل بدل دیا گیا ہے اس تنازعہ پر بحث کے لئے دیکھئے "نقدِ سرشار"۔ (مرتب)

برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے اُن کے قائم کئے ہوئے پلاٹ اُن کے دکھائے ہوئے کیرکٹر اُن کے بیان کئے ہوئے واقعات میں اکثر جگہ حد درجہ بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی اُن سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور وہ اُس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ ان میں خودداری اور آزادہ روی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی۔ اور اپنی شہرت کے واسطے کسی دوسرے کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ خود ان کی قابلیت اور طباعی اور ذہانت اُن کی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔ آخر عمر میں البتہ وہ زمانے کے ہاتھ سے تنگ آ کر حیدرآباد گئے، تاکہ دولت آصفیہ کے زیر سایہ کچھ دنوں بفراغت زندگی بسر کریں۔ مگر بدنصیبی نے پُرانی عادتوں کی طرح وہاں بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور آخر کار وہیں پیوند خاک اور غالب کے اس قطعہ کے مصداق ہوئے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

تصانیف اُن کی حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں؛ فسانۂ آزاد، سیر کوہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کڑھم دھم، بچھڑی دولہن، ہشو، طوفان بے تمیزی، رنگے سیار[1]، پی کہاں، شمس الضحیٰ والیس[2] کی کتاب رشیا، کا ترجمہ اُردو میں۔ لارڈ ڈفرن کی کتاب "لیٹرز فرام ہائی لیٹی ٹوڈس" کا ترجمہ اُردو میں[3]۔

فسانۂ آزاد جیسا کہ اوپر بیان ہوا فسانۂ آزاد شروع میں اودھ اخبار کے کالموں میں نکلتا تھا۔ اس کی اشاعت نے دنیائے اُردو میں ایک عجیب ہلچل ڈال دی۔ جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اتنا اشتیاق ہوتا تھا کہ دوسرے پرچہ کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ پنڈت بشن نرائن در آنجہانی اس کتاب کی نسبت یوں رقم طراز ہیں۔

---

[1] رنگے سیار کو سکسینہ نے غلطی سے ناول کی فہرست میں داخل کر دیا ہے۔ دراصل یہ ایک قصہ ہے جو فسانۂ آزاد جلد اول سے اخذ کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] سر ڈونلڈ میکنزی والیس۔ لارڈ ڈفرن اور مارکوئس آف لینسڈون کے پرائیویٹ سیکرٹری نہایت قابل اور صاحب تصنیف اور بڑے سیاح تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کی دسویں ایڈیشن کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔

[3] سرشار کی تصانیف کی یہ فہرست نامکمل ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مرتب کی کتاب "نقد سرشار"۔ (مرتب)

قصّہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جائیے ذرا بدمزہ نہیں ہوجیے گا۔ بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا۔ محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرزِ ادا نہایت بے تکلف اور آسان۔ تازہ اور نیچرل۔ تمثیلی اور روا منیح پھر اُس کے ساتھ جا بجا پُر لطف ظرافت۔ پھڑکتے ہوئے فقرے۔ مزیدار شوخیاں۔ ترکی بہ ترکی جواب۔ حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ آزاد اصل قصّہ کا ہیرو ایک دولت مند نوجوان دنیادار شخص بہت حسین اور طرحدار، تعلیم یافتہ۔ کئی زبانوں سے واقف۔ سپاہی پیشہ۔ ظریف۔ شاعر۔ عاشق مزاج۔ لچھے دار باتیں کرنے والا اور ہر اچھی صورت پر مرنے والا۔ ایک اعلیٰ سوسائٹی کی زیب و زینت۔ دوسری طرف ایک بھٹیاری کا عاشق جاں باختہ۔ بیگمات کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میاں آزاد ایک حسین دولتمند حسن آرا نام پر لٹو ہوتے ہیں۔ اُس سے عشق بازیاں کرتے ہیں۔ آخر وہ اُن کے ساتھ اس شرط پر عقد کرنے کے لئے راضی ہوتی ہے کہ پہلے وہ ٹرکی جائیں۔ لشکرِ اسلام میں نام لکھائیں روسیوں سے نبرد آزمائی کریں۔ آزاد اپنی معشوقہ کے احکام کی بجا آوری خوشی کرتے ہیں۔ اور بقول شخصے بندھا خوب مار کھاتا ہے، ہل ہانکتے کو دوں بھاگتے ٹرکی جاتے ہیں۔ روسیوں سے لڑتے ہیں اور مظفر و منصور واپس آتے ہیں۔ اپنی جانبازیوں کے بدلے اپنی معشوقہ سے ایفائے عہد چاہتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اصل قصّہ اور جہاں تک قصّہ کے پلاٹ کا تعلق ہے۔ اس سے بدتر اور بے مزہ تر شاید ہی کوئی قصّہ انسانی دماغ سے نکلا ہوگا۔ مگر اسی قصّہ کو رتن ناتھ در کی زبان سے سنیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نگارخانۂ چین میں چلے جارہے ہیں۔ جس کی دلکش جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جادو و تخیئل کی کثرت مناظر کی چونچالی ایسی ہے کہ جب اس آئینہ خانہ سے گذرتے ہیں تو کچھ یقین کچھ شک کرتے ہوئے ایک طلسم کوہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بازیگر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے یہ سارا سماں ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے۔

مندرجہ بالا ریویو لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ فسانۂ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کیرکٹر نگاری کے اسلوب اور قصّہ کی تدریجی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہئے۔ اصل قصّہ کو ایک کھونٹی سمجھنا چاہئے جس پر ہزاروں واقعات ٹنگے ہوئے ہیں اور انہیں علیحدہ علیحدہ واقعات کے پڑھنے میں سارا لطف آتا ہے اُن کا مذاق و ظرافت، وہ دلچسپ کیرکٹر وہ شوخیاں اور حاضر جوابیاں یہی سب کتاب کی جان ہیں۔ فسانۂ آزاد میں مثل ڈوما[1] کے ناولوں کے ساری عمدگی اور دلچسپی اشخاصِ قصّہ کی باتوں میں ہے نہ کر

---

[1] اس نام کے دو ناولسٹ باپ اور بیٹے فرانس میں گزشتہ صدی میں بہت مشہور و معروف گزرے ہیں ان کے اکثر ناول نہایت دلچسپ ہیں۔ ۱۲

نفسِ قصہ کے بیان میں۔ سرشار مکالمہ کے استاد ہیں اور کیرکٹر نگاری کی خوبیاں طول طویل بیان سے نہیں بلکہ خود اُن اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی سے دکھلاتے ہیں

سرشار کی مرقع نگاری | سرشار مثل مرزا رجب علی بیگ سرور کے پُرتکلف اور مقفیٰ عبارت نہیں پسند کرتے نہ وہ برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو چمکاتے ہیں بلکہ ہو بہو تصویریں کھینچتے ہیں اور علی الخصوص اشخاص لکھنؤ اعلیٰ اور ادنیٰ امیر و غریب سب کے بے مثل مرقعے اپنے اس لاجواب کتاب میں کھینچ دیئے ہیں اُن کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرتے، بلکہ وہ ہمارے آپ کی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ پنڈت بشن نرائن در اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"اگر تم ان مجمعوں کے اندر جاؤ، غل غپاڑے والے طوفان بے تمیزی کے مجمعے تو تم کو بڑی احتیاط سے جانا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی دھکا دھکی سے تم خود نہ گر پڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی۔ کہ تمہاری گھڑی یا کوئی اور چیز جو تمہاری جیب میں ہے کہیں نکل نہ جائے۔ یہی حال اُن کے محرم، جہلم اور عیش باغ کے میلوں کا ہے کہ تم وہاں اپنے تئیں ایک عجیب بھیڑ میں پاتے ہو۔ جس میں بٹیر باز، پتنگ باز، افیمی، زرق برق نواب مع اپنے ڈیڑھ ٹھے زرد رو مصاحبوں کے۔ رنڈیاں گاڑیوں میں سوار کسی بڈھے فیل سوار تماشبین سے آنکھیں لڑا رہی ہیں۔ فقیر گاڑیوں کے پیچھے دعائیں دیتے جا رہے ہیں اور اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو چپکے چپکے سیکڑوں صلواتیں سناتے ہیں۔ نماقہ مست عاشق، رنگیلے بیکار، عورتیں خوبصورت بدصورت۔ کوئی اپنے کھوئے ہوئے بچے کو آواز دے رہی ہے۔ کوئی اپنے یار سے لڑ رہی ہے۔ کوئی کسی نواب کے مصاحب خاص سے ناز و انداز کی باتیں کر رہی ہے۔ پولیس کانسٹیبل، چور، اُچکے، چنگی کے محرر، ریلوے بابو، ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤں سے میلا دیکھنے آئے ہیں۔ لالہ بھائی کسی تنبولی یا تنبولن سے فارسی لغت چھانٹ رہے ہیں۔ انگریز نما گریجویٹ سگریٹ منہ میں دیا ہوا، نیو فیشن کے مسلمان لڑکے ترکی ٹوپی ڈاٹے۔ بنگالی بابو مہین نرم دھوتیاں ہواؤں میں اڑاتے ہوئے۔ یہ ہے وہ مجمع جس کی سرشار تم کو سیر کراتے ہیں، جس میں ہزاروں مختلف آوازیں تمہارے کانوں میں آ رہی ہیں اور چاروں طرف زندہ، چلتے پھرتے باتیں کرتے غل مچاتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہے اور پھر ان سب پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع میں ہر آدمی کو اُس کی بات چیت اور اُس کے حرکات و سکنات سے تم بخوبی پہچان سکتے ہو۔"

فسانۂ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر ناولوں کی خصوصیات یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنی (۱) لکھنؤ کی اس زمانے کی سوسائٹی کی ہو بہو تصویریں کھینچنا اور (۲) شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا نثر نے اس سے قبل لکھنؤ کے آخری تمدن اور سوسائٹی کی صحیح تصویریں اس قدر جزئیات کے ساتھ کبھی نہ کھینچی ہوں

گی۔ سرشار پرانے رنگ کے نوابوں اُن کے افعال واشغال اُن کے مصاحبوں اور ہم جلیسوں کے سچے نقشے کھینچنے میں کمال رکھتے تھے اور باوصف اس کے کہ وہ ہندو تھے مگر سخت حیرت[1] ہے کہ مسلمانوں کے بڑے گھرانوں کے اندرونی حالات اور بیگمات کی طرز معاشرت اور بول چال سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ کوئی مسلمان بھی اس سے بہتر نہیں جان سکتا۔ انہوں نے ہماری آنکھوں سے پردہ اُٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان سراؤں کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہیں۔ اُن کو مختلف پیشہ وروں کی خاص خاص اصطلاحیں مختلف جماعتوں کی خاص خاص بولیاں اور اُن کا طرز ادا، دیہاتی بولی۔ بیگمات اور اُن کی مغلانیوں اور پیش خدمتوں کی بات چیت۔ بھٹیارے اور بھٹیاری۔ افیمی۔ چنڈو باز۔ شرابی۔ چور اُچکوں کی زبان۔ دیہاتی گو کھے ٹھاکروں اور پڑھے لکھے لالہ بھائیوں کا طرز تکلم۔ ان سب پر اُن کو کامل عبور حاصل ہے۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت | اُن کا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اس میں غالب کی سی لطافت اور نمکینی نہیں ہوتی اور الفاظ کی رَو میں اور محاکات کے شوق میں کبھی وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور اُن کا سمند طبع اس قدر بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ فحش سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مگر باوجود اس کے اس خاص چیز یعنی شوخی اور ظرافت میں کوئی ان کے قریب تک نہیں پہونچتا۔ مکالمات لکھنے میں وہ کمال رکھتے ہیں۔ علی الخصوص ادنیٰ طبقہ کی بول چال اُن کے ٹکے بندھے فقرے اُن کے ضلع جگت کو من وعن ادا کر دیتے ہیں۔ اس رنگ زمانہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت پنڈت لشن نرائن در، اپنے اُسی مضمون میں جس سے بعض مقامات اوپر نقل کئے گئے اس طرح رقم طراز ہیں:۔

"بے ادبی وگستاخی، پرانے رسوم وخیالات کا استیصال، دنیاوی لذتوں سے تمتع۔ موجودہ چیزوں کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات ان کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں کو مسخر کئے ہوئے تھے اور خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ پس کوئی شخص اُن کی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ میں ڈبوتے ہیں اور اس کو طرح طرح کی خوبیوں سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اس آزادانہ تحریک کے بڑے حامی ہیں کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم ورواج

---

[1] یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ اُس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور دلی اتحاد کا بیّن ثبوت ہے۔ دوسری مثال اس کی نظیر اکبر آبادی کی ہے جنھوں نے ہندوؤں کے تہوار میلے ٹھیلے یہاں تک کہ اُن کے مذہبی معتقدات تک کو کس قدر واقفیت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جبکہ دونوں قوموں کے درمیان نفسانیت اور تعصب کی ایک آہنی دیوار قائم ہے۔ تو یہی باتیں تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۲۔

کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے منازلِ ارتقا میں ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہے کہ جب عیوب اور غلطیوں کی اصلاح کے واسطے ظرافت اور استہزا مثل وعظ و نصیحت کے مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بدکاری کی بُرائی دکھانے کا یہی بہترین طریقہ ہے کہ وہ عُریاں کر کے دکھائی جائے بہت سی غلطیاں جو وعظ و نصیحت سے اصلاح نہیں پا سکتیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک مذاقیہ جملہ سے بالکل دب جاتی ہیں اور ایک طنز آمیز قہقہہ کی گولی عیوب کی تیز پرواز چڑیا کو فوراً گرا دیتی ہے۔ رتن ناتھ سے جب کسی اخلاق آموز واعظ یا مولوی سے۔ کسی پرانے خیال کے چھوت چھات ماننے والے سے کسی دولتمند پر گھمنڈ کرنے والے یا حسب و نسب پر فخر کرنے والے سے مڈبھیر ہوتی ہے۔ اور وہ اُن کی پند و نصیحت کو، اُن کی ڈینگوں اور شیخی کی باتوں کو سُنتے ہیں تو وہ اُن سے بحث و مباحثہ نہیں کرتے نہ کبھی اُن سے لڑنا جھگڑنا چاہتے ہیں۔ بلکہ صرف اُن کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور گو کہ متانت پسند لوگ اُن کی اس ادا کو ناپسند کریں مگر باقی اور لوگ جو اس تماشے کو دیکھتے اور اُن کی باتوں کو سنتے ہیں۔ ہنسی کے مارے لوٹ جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتوں سے اُن اپنی باتوں سے اُن کے دلوں کو موہ لیا اور اس کے بعد سے وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ ہنس چکے پھر کسی واعظ کی تعلیم و تلقین پر نہیں رُوتے۔ بس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ وہ تمسخر کرنے میں بنتے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم اُن کو سوسائٹی کی برائیوں کا ایک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں مگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے انہوں نے کسی پیغمبر یا مصلح قوم کی طبیعت نہیں پائی تھی وہ دل سے مسخرے اور ہنسی میں اُڑا دینے والے تھے۔"

سرشار کی کیرکٹر نگاری | سرشار کیرکٹر نگاری کے اُستاد ہیں مگر وہ ہو بہو نقشے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے کیرکٹروں میں ڈکنس اور تھیکرےؔ[1] دونوں کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیرکٹروں میں جو خاص اور ممیز باتیں ہوتی ہیں اُن کو چن لیتے ہیں اور اُنہیں میں وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہیں جن کو آدمی پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ ان کے کیرکٹروں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں۔ بس اُن کو پڑھو اور ہنسو اور یہی کافی ہے

خوجی | خواجہ بدیع الزماں معروف بہ خواجہ بدلیا مخفف خوجی[2]۔ وہ پُرانا بے وقوف، مسخرہ، آزاد کا ہمزاد

---

[1] انگلستان کے گزشتہ صدی کے دو مشہور ناولسٹ گزرے ہیں۔

[2] دنیائے افسانہ کے اس عجیب و غریب کیرکٹر کا سرشار نے جو خاکہ اپنے خاص رنگ میں کھینچا ہے حسب ذیل ہے۔ گیدیوں کے قبلہ گاہ، بدیوں کے پشت و پناہ، گاودیوں کی جان بلکہ روحِ رواں۔ دیوارِ حماقت کے پشتیبان، چھٹے پہلوان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع (آنجہانی) عزیق لجۂ نادانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی

(باقی اگلے صفحہ پر)

دیارِ خار، لکڑ ہڈوں کو دبانے والا، رنگیلا، عیاش، زنڈیا، بدمعاش، جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا پوٹ، ایُونا جو اپنے تئیں ہرگز لونا نہیں سمجھتا بلکہ لونا کہنے سے سخت بُرا مانتا ہے اپنے گزشتہ کارناموں پر جو سراسر لغو اور جھوٹ ہیں۔ ڈینگیں مارنے والا۔ جہاں جائے لوگ اُس پر آوازے کسیں اور پھبتیاں اُڑائیں۔ ہمیشہ اس خیال میں کہ دنیا جان بوجھ کر اُس کی بڑائیوں اور خوبیوں پر خاک ڈالتی ہے اُس کا مسخرا پن، اُس کی دل لگیاں، اُس کی آزاد کے ساتھ محبت و وفاداری، اُس کا اپنی چھوٹی سی تلوار لے کر بستر سے بدلنا، اُس

بقیہ حاشیہ:۔ سے دل ہی دل میں ..... ٹھنڈی سانسیں بھرتے شتہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاء اللہ ڈنڈیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے۔ یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیورانے لگے۔ اللہ ری طاقت۔ اول تو پستہ قامت۔ ماشر بھر کا قد دوسرے قطع شریف از بس موزوں۔ اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مدت کے بعد ایک چوبی قرولی جو کسی استاد نجار نے بیر مرد کو بطریق نذر دی تھی۔ زیب دست تھی۔ بقول مشہور ہے۔ "اچھے کے گھر تیتر۔ باہر رہے نہ بھیتر" کبھی دائیں ہاتھ میں لی بازار والوں کی طرف دیکھ کر چمکائی۔ کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور اکڑ کر چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پہ ہے۔ اللہ ری نخوت۔ اور کیوں نہ ہو۔ اللہ نے حُسن دیا تو گلو سوز۔ نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گراں ڈیل ڈول جوان دوسرے فن سپہگری میں طاق۔ کشتی کے پہلوان۔ بانک، پٹے، بانے، بنوٹ کے مشاق، اور خانہ جنگی میں شہرہ آفاق اور سب صفتوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ جنگ میں بھاگتوں کے مقدمۃ الجیش۔ سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی لڑ بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے۔ اللہ ری بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پر جس کی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ ماشاء اللہ کیا قطع ہے اور اس لونے پن پر اکڑنا اور تن تن کر چلنا اور اینڈنا اور شتہ گام جانا اور مصنوعی قرولی سے بیر کو ہٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانئے زمانے بھر کے بے فکرے ان کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے خوجی نکل جاتے تھے۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے چھرے چلتے جاتے تھے۔

(۱) ذری سنبھلے ہوئے حضرت دیکھئے کہیں ٹھوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کیا بیگو کا ماتحن ہے کیا کھٹ پٹ جا رہا ہے۔

(۳) ہم کو تو چنڈول معلوم ہوتا ہے (قہقہہ لگا کر)

(۴) کلجگ کے باون اوتار کے ذریات میں سے ہے۔

(۵) اکڑتے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے قرولی ورولی چھین لے۔

(۶) ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ کتنے سڈول ہیں۔

(۷) ارے میاں جمن ذری ادھر تو دیکھو یہ بھڑیئے کے بھٹ سے نکالے گئے ہیں سُنا ابھی تک آدمی کی بولی نہیں بول سکتے۔ ۱۴

کا بات بات پر قسم کھانا اُس کی اپنی بزدلی چھپانے کی ترکیبیں، انہیں سب باتوں سے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے اُس کے اکثر فقرے اور جملے اُردو میں ضرب المثل ہو گئے ہیں[1]۔ اس عجیب و غریب کیرکٹر کی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یاد رہیں گے۔ تمام اردو ادب اسکا مدمقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ اُس ظریفانہ کی سب سے زیادہ اوریجنل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہیں۔

ان غیر اہم چیزوں کو خارج کر دیا ایک خاص صفت ان کی تصانیف کی یہ ہے کہ انہوں نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں ایک دلچسپی پیدا کر دی ہے مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے۔ مگر اُن میں اور سرشار میں یہ فرق ہے کہ اُن کے قصّے صرف اخلاق اور نصیحت آموز ہیں جن کی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو عورتیں پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اور اسی وجہ سے ان میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری رائے میں سرشار سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصّے کے پیرایہ میں دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولوں کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

نقائص کلام سرشار کے قصّوں میں مندرجہ ذیل نقائص بتائے جاتے ہیں (۱) پلاٹ مربوط اور منتظم نہیں ہوتے۔ فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصّہ نہیں لہذا مصنف جب واقعات میں ایک ترتیب و نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں، وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور اُن سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی کمزوری اُن کے دوسرے ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔ اس کی وجہ بظاہر اُن کی بے پروائی اور بے قاعدگی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے کوئی مستقل باقاعدہ طور پر نہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح محنت اور شوق کے ساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے اور اخبار کی ایڈیٹری یا اُس کے واسطے قصّے تیار کرنا اُن کو ایک بارِ گراں معلوم ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے طبّاع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے اپنی خلقی طباعی و ذہانت سے پوری طرح نہ کام لیا اور اس کی قدر نہیں کی (۲) یہی سبب اُن کے واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بے ربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے اُن کے کیرکٹروں میں ہمواری اور یکرنگی نہیں ہے جو قصّے کے سلسلے میں سیکڑوں رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص اُن کے دماغ میں قائم نہیں رہتے اسی وجہ سے وہ ان کو نباہ نہیں سکتے۔ فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے اُن کا قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے وُہ لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُن کی فکر میں قوت پرواز

---

[1] جوجی کے جملے ضرب المثل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح فقرے بھی بولنے کا بہت شائق ہے ۱۲

نہیں رہتی تو وہ زمین پر گھسٹنے لگتے ہیں (۳) اُن میں فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے فسانۂ آزاد کی آخری جلد اور ہشو کے بھی آخری ابواب جن میں تعلیم نسواں، تھیاسوفی، اور ترک مے نوشی وغیرہ کے متعلق وعظ نما تقریریں ہیں نہایت بے مزہ اور بے اثر ہیں۔ جب وہ اس کوچے میں قدم رکھتے ہیں۔ تو پھر وہ سرشار نہیں رہتے (۴) اُن میں جذبات کی بھی کمی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی تصانیف میں تصاویر درد و غم کا کچھ پتہ نہیں۔ ان کی جذبات نگاری جہاں کہیں ہوتی ہے اور ادھر ادھر کے اقوال و اشعار سے اس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہیں (۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب باتوں کا بھی ان پر الزام لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت انھوں نے بعض جگہ غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہونچتا ہے۔ مگر اس کے جواب میں اُن کی طرف سے دو عذر پیش ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانہ کا جس میں وہ تھے رنگ ہی یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف اسی وقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے۔ جب اس کو بخوبی کر کے دکھایا جائے ورنہ لوگ اس کی اصلی حقیقت سے متاثر نہ ہوں گے (۶) اُن کے قصوں میں کیرکٹروں یعنی اشخاص قصہ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کے کھینچے ہوئے مرقعے اکثر کچھ پیچ ہو گئے ہیں اور واقعات کی بھی اتنی کثرت ہے کہ تناسب قائم نہیں رہتا اور پڑھنے والے کی طبیعت میں وفور واقعات سے پریشانی پیدا ہو جاتی ہے مگر سچ پوچھئے تو یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی مان لئے جائیں تو اُس عظیم الشان خدمت کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو انھوں نے اپنی تصانیف سے ادب اُردو اور سوسائٹی کی انجام دی۔ اور اُن کے جزوی نقائص سے ہم کو اغماض کرنا لازم ہے۔

سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے — سرشار کا بحیثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہے صاف سلیس، بامحاورہ اور زوردار عبارت لکھنے میں اُن کو اپنے ہمعصروں پر فوقیت حاصل ہے اور بحیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے نمبر پر ہوں مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ زبان میں وہ ضرور بے روک ٹوک ہیں اور کبھی ضرورت سے زیادہ محاورات و اصطلاحات کرتے ہیں مگر اس کی وجہ وفور خیالات اور قدرت زبان کہی جا سکتی ہے

سرشار اور سرور کا مقابلہ — مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں تکلف اور آورد بہت ہے اور سرشار کی کی عبارت واضح بے تکلف اور نیچرل ہوتی ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشار آدمیوں کا۔ سرور آئیڈیل (خیالی) تصویریں کھینچتے ہیں اور تصویروں کے محاسن کو ابھارتے اور معائب کو چھپاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرشار کی تصویریں بالکل سچی اور ہو بہو ہوتی ہیں اور اچھائیاں اور برائیاں سب وہ بے تکلف ظاہر کر دیتے ہیں۔ سرور کے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ایک باغ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ میں ایک خوبصورت نہر جاری ہے جس میں صاف موتی سا پانی بہتا ہے اور

اس کے کناروں پر گلاب اور ترشادے کے پھول جھک رہے ہیں۔ سرشار ہم کو ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کر دیتے ہیں جس پر ہوا کے زور سے لہریں اٹھ رہی ہیں اور دریا کے صاف پانی پر کوئی نجس اور خراب چیز بھی بہتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سرور کے مرقعے اس وجہ سے دلچسپ اور حسین ہیں کہ وہ ان چیزوں سے جن کو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محبت رکھتے تھے اور ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے۔ سرشار برخلاف اس کے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہیں اُس کو پسند نہیں کرتے بلکہ اکثر موقعوں پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس نفرت و ناراضی کو وہ کہیں چھپاتے نہیں۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرور قدامت پسند ہیں اور زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں اور سرشار اس نئی تحریک کے حامی ہیں کہ جو فنون لطیفہ کو تکلف اور قدامت پسندی کے پنجے سے چھڑا کر آزاد کرنا اور اس کو نیچر کا متبع بنانا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ زمانۂ حال اور مستقبل دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو دونوں کے رنگ طبیعت سے آگاہی ہو۔ منشی سجاد حسین کے مشہور ناول حاجی بغلول سے مقام لیا جاتا ہے جہاں "حاجی صاحب" اپنی معشوقہ کندہ بنے والی کو یاد کر کے اُس کے تصور سے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد جلد چہارم سے اُسی کے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جس میں خوجی بمبئی پہونچنے سے کچھ پہلے جہاز پر اپنی معشوقہ عتاب جان ورزن سے ملنے کے خیال میں بے چین ہو رہے ہیں اور اسی کے متعلق آزاد سے باتیں ہو رہی ہیں۔

(ماخوذ از حاجی بغلول) ناظرین ذرا چلئے اس وقت تنہائی میں حاجی صاحب پڑے کراہ رہے ہیں۔ کان لگا کر سنیے تو کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر دیکھئے دور ہی رہئے نزدیک گئے اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ کہہ رہے ہیں۔

اے نیک بخت افسوس تجھ کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے یوں دم توڑتا ہے۔ آپ تو کھیتی باڑی میں دل بہلاتی ہے یا گھر کے چکی چولھے میں پڑی ہوگی (اسے تو یہ معروف ہوگی) یا اُپلیاں پیاری پیاری بناتی ہوگی۔ مگر یہاں سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کنڈا ہوئے جاتے ہیں ہم کو کیا نام کر جانا چاہیے ہم ہوا کنڈے جس کی آنچ ایسی تیز ہوتی ہے کہ تپال جنتر میں عرق اور تیل اُسی سے نکل سکتا ہے، کیمیا کے نسخے اُسی سے تیار ہوتے ہیں۔ ہائے افسوس۔ کیا نام کہ حضور کی محبت میں کیسے کیسے صدمے اُٹھائے۔ لوگوں کا ارہر کے کھیت میں لے جانا۔ گھوڑی پر سے گرنا۔ عمل خوانی میں کڑی سہنا (یہ سب واقعات ہیں جن کا ناول میں ذکر ہے) مگر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم و رضا کی سپر لگائے سب چوٹیں کھاتا ہے۔ ورنہ کیا نام کہ مجال تھی۔ کسی کی ٹانگ تو دکھائے مارے جریبوں کے ستھراؤ کر

دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشقی کے ضابطہ کے خلاف یہ بات تھی۔ جس گاؤں کو تم اپنے جلوہ سے رشک ارم بنا دو وہاں کا گدھا اور سؤر براق اور دنبہ ہے اور آدمی تو ہماری آنکھ میں حور اور غلمان ہیں۔ دم بھر کو کوئی سسرال جاتا ہے جو چھتی کھیل جاتی ہے۔ بھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان میں جو عشق بازی میں آپ کے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے میں آج کوکوا ہوتا اور جہاں تم ہوتیں وہاں بیٹھ کے قاؤں قاؤں کی صدا سناتا۔ تم ہنکانے اٹھتیں اور تھابے سر پر آ بیٹھتے۔ ہائے تمنا ہے کہ تمہارے گائے بھینس ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے میں رسی باندھ کر چرانے لے جاتے۔ پیٹھوں پر تمہارے نازک ہاتھ پھرتے۔ تم دودھ دوہتی ہوتیں اور ہم تم کو چاٹتے ہوتے۔ کیا نام کہ اگر کہو تو بمبئی چلیں اب تو ہم آپ کے عاشقوں کے ہو گئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ نہیں اٹھائی۔ مگر قسمت کا لکھا ہوا اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے سب بھید کھل گیا۔ میرے دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم پہ تن زار گھٹ کر ٹھیرا ہوا ہے۔ آہ یہ کمر کا درد۔ تمہارے عشق کی چوٹ ہے جو سارے جسم وجان میں پھیلی ہوئی ہے؎

سوختیم و سوزشش ما بر کسی ظاہر نہ شد!

چوں چراغاں در شب مہتاب بے جا سوختیم

ہائے سینے میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔

(ماخوذ از فسانۂ آزاد جلد ۴) اتنے میں ملاحوں نے کہا اب بمبئی سامنے سے نظر آتی ہے۔ سنتے ہی خوجی کی باچھیں کھل گئیں۔ چلا کر کہا یار و ذرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی فنس تو نہیں آئی ہے۔ کرم بخش تا نہ مہری ساتھ ہوگی۔ اطلس کا چھکا ہے اور کہاروں کی پگڑیاں وردی رنگی ہوئی ہیں۔ مچھلیاں ضرور لٹک رہی ہوں گی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب۔ آزاد یا شتا آواز آئی۔ ارے یار آواز آئی ہو تو خدا کا واسطہ بتا دو۔ بی شتاب جان۔ اے کرم بخش مہری۔ مہری کیا بہری ہے۔

لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے بی شتاب جان اور کرم بخش یہاں سے کیوں کر سن لیں گی۔ کہا اجی ہشو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو۔ ارے نادان عشق کے کان دو کوس کی خبر لاتے ہیں اور کون کوس کڑی منزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی واہ بھلا کوئی بات ہے مگر جواب کیوں نہ دیا یہ پوچھو اس میں ایک الم ہے۔ پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ ع معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو۔ آدمی اگر آواز کے ساتھ ہی جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزا حبیب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں۔ کہ بی شتاب جان صاحب اجی بی صاحب اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تنک کر کہیں مونڈی کاٹا آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ غل مچاتا پھرتا ہے شتابہ جان شتاب جان اے بی صاحب تیری بی کو کیا کہوں۔ موئی کہیں چرخہ کات رہی ہوگی۔ اور

ہم دھول لگا کر کہیں کہ دیکھیے سرکار لب کی دھول لگائی تو خیر جواب دھول لگائی نہ تو بگڑ جائے گی۔ اور وہ جھلا کر ایک اور جمائیں کہ اینجانب کی ٹوپی گھوڑے پر جا کر گرے اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑ تڑ دو چار اور جما دیں۔ تب ہنس کر کہوں۔ جانِ من خدا گواہ ہے اس وقت پیٹ بھرا ہے۔ ورنہ مارے بھوک کے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ سفر اور پردیس میں ایسی چاند تارہ سر پارہ کہاں ملتی جو بے دھڑک دھول پر دھول جماتی۔ اور ابھی کیا ہے۔ پیاری ذرا تہ دل ہو کر بیٹھیں تو پھر چند ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے

آزاد۔ بالفعل کہیئے تو خاکسار ہی لگا دے۔

خوجی۔ (مسکرا کر) اے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہو گی۔

آزاد۔ واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ دو جوتوں میں آپ اس درجے کو پہونچ جائیں کہ پھر عمر بھر آرام سے سوئیے چہ تنے عمِ دُرز نے عم کالا۔ یا کہیئے فقط سنگھا ہی دوں۔ گو تکلیف ہو کچھ پروا نہیں۔ اس کا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی۔ میاں پہلے منہ دھو آؤ۔ دلگی نہیں ہے۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لئے پریوں کے ہاتھ چاہیئے نہ کہ تم ایسے دیوزادوں کے۔

آزاد۔ خدا کرے جس وقت آپ پر پاپوش کاری کریں۔ اُس وقت ہم بھی ہوں۔ کہا جاؤں کہ ہمارے خاطر سے ایک اور پھر پڑے۔ اب کی زنخک چاٹ گئی۔ اب کے خوب چٹاخے سے آواز آئی۔ ہاں ذرا ایک اور، اور ذرا دور تک آواز جائے ؎

ہاں صبح کے سر پہ ایک جمائی چٹاخ سے
پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی نہیں پڑی

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا تو خواجہ صاحب نے غل مچایا۔ شتاب جان صاحب اجی حضور کا غلام فرزندانہ آداب عرض۔ اس قدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہے آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے آپ کی حماقت اس کا سبب ہے۔ اگد جاین خود کرتے ہو اور اوپر سے ہم سے پوچھتے ہو کہ اس کا کیا سبب ہے۔ کیا فقرہ کہا تھا آپ نے ذرا پھر فرمایئے گا خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سنایا۔ اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد۔ تو آپ شتاب جان کے صاحبزادہ فرزند دلبند ہیں۔

خوجی۔ یہ کاہے سے۔ صاحبزادہ ہیں یا میاں ہیں شوہر خاص۔

آزاد۔ پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جورو کو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے تو آپ کی بیوی کیا آپ کی والدہ شریفہ ٹھہریں؟

خوجی۔ (گالوں پر تھپڑ مار کر) لاحول ولا غضب ہو گیا بُرا ہوا واللہ ستم ہو گیا۔ سخت مصیبت میں گرفتار ہو

گئے۔ ایسے خفیف ہوئے کہ توبہ ہی بھلی۔ اے ہے خفت سی خفت ہے۔ مگر چرچڑے کی زبان پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت جی۔ پھر دریں چہ مضائقہ باشد۔ اب تو صاف صاف نقش نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم برہم ہوئی جاتی ہے ؎

سمجھ کر چھیڑ دو مشاطہ اُس کی زلف پُرخم کو
خدا کے واسطے برہم نہ کر اسباب عالم کو

وہ مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ اُخاہ اب تو بی کرم بخش بھی بادِ شہ پر ہیں۔ سروقامت رشک شمشاد اس حور گردار کی مہری بھی پری زاد ہے۔ وہ ہنسی اُمو ہو۔ دُرِ دنداں نے مار ڈالا کیا پیارے دانت ہیں ؎

چمک لعل بدخشاں کی مٹادے | ترے ہونٹوں پہ ایسا رنگ پاں ہیں

یاران مژدہ باد کہ عروس مانوس من دنگار گلعذار من صبیہ من بی شتاب جان دامت حسنہا جلوہ گر و زنگار مرامی بیند وی گوید ؎

یار نام خدا ہے کشتی میں | ناخدا آج پار بیڑا ہے

آزاد۔ یار عمر بھر میں برجستہ شعر آج ہی سُنا حسب حال۔

خوجی۔ درست اور وہ شعر جو کانسل کے نام ہم نے لکھا تھا

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
(مصرع ثانی حذف شد) والائے تو

آزاد۔ مگر ایک غچہ پھر کھایا۔ پہلے شتاب جان کو مادر مہربان بنایا۔ اب کے ایک ایسا کلمہ کہا کہ پھر جھیپ جاؤ گے زبان سے لینا ہی نہیں۔

خوجی۔ کیا طاقت ہم نے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا نہ۔ کہ عروس من دنگار من وصبیہ من بی شتاب جان پھر کیا عروس نہیں یا صبیہ نہیں ہے۔

آزاد۔ اے لعنت خدا ارے کمبخت۔ عربی میں صبیہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ لے اب سر پیٹو۔ کبھی ماں بناتا ہے۔ کبھی لڑکی۔ اور پھر اوپر سے غراتا ہے۔

خوجی۔ (سر پیٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے۔ لیکن خیر گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط

آزاد۔ یار وہ دیکھو سامنے کیا نور کا بکا نظر آیا۔

خوجی۔ یہی ہماری شتاب جان ہیں۔ کیا صورت ہے ؎

چہرۂ گلگوں ہے گلشن۔ قامت موزوں ہے سرو
گوش نازک ہیں گل تر۔ غنچۂ گل ناک ہے

جلوہ گر خالِ سیہ ہے۔ روئے تابناک پر
چشمۂ خورشید میں زنگی مگر تیراک ہے

مولوی عبدالحلیم شرر | ایک دوسری زبردست ہستی جس نے اردو ناول کی اشاعت و ترقی میں بڑی اعانت کی مولوی عبدالحلیم شرر ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اُردو میں تاریخی ناول لکھے قصّے کے پلاٹ اور کیرکٹروں کی ترقی پر توجہ کی اور نیز اپنے طرزِ تحریر سے ثابت کر دیا کہ صاف بے آرائش کی ہوئی زبان ہی ناول نویسی کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ انھوں نے ناول کو غیر مہذب اور خفیف الفاظ و مضامین سے پاک کیا اور اپنی وسیع معلومات سے وہ مواد فراہم کیا جو اُن کی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف ناولسٹ ہی نہ تھے بلکہ مورخ۔ ڈرامہ نگار، ادیب اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

خود مولانا شرر صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالاتِ زندگی، جو انہوں نے بعد نظرِ ثانی بغرضِ اشاعت مجھ کو عنایت فرمائے تھے اور میرے پاس موجود ہیں درج کیے جاتے ہیں چونکہ یہی حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب نے بھی اس کتاب میں بیان کئے ہیں لہٰذا اصل مضمون کتاب کی بجائے اسی پر اکتفا کی گئی۔ (مترجم)

جمعہ کے دن ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے نانا چونکہ دربارِ اودھ میں رسوخ اور معزز حیثیت رکھتے تھے لہٰذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آکے مٹیابرج کلکتہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ تمام خاندان کو چونکہ اگلے شاہی دربار سے وابستگی تھی لہٰذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انھی رشتوں میں بندھے ہوئے مٹیابرج کلکتہ پہونچے۔ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کیلئے ساتھ ایک پختہ مغز طبیب تھے ۱۲۸۵ھ میں جبکہ ۹ سال کی عمر تھی کلکتہ گئے اور اُسی وقت سے گویا تعلیم شروع ہو گئی گو ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ میں بھی ابتدائی تعلیم ہوتی رہی تھی۔

مٹیابُرج میں ابتداً اپنے والد صاحب سے اور چند اور اساتذہ سے ابتدائی کتب فارسی و عربی پڑھیں مولوی سید علی حیدر صاحب اور مولوی محمد حیدر صاحب سے کچھ معقول و ادبی کتابیں پڑھیں مولوی مرزا محمد علی صاحب مجتہد سے چند اوپر کی منطق کتابیں پڑھیں حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیہ پڑھیں۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی مگر پرائیوٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں اودھ اخبار میں بہ حیثیت کارسپانڈنٹ خبریں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔

انیس ۱۹ سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی اور مولوی محمد عبدالحی صاحب مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کیں۔ بیس ۲۰ برس کی عمر میں ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ دہلی چلے گئے اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کے اور اُن کے مدرسے میں رہ کے حدیث کی تعلیم تکمیل کو پہونچائی۔ اب اس کے بعد انھیں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور انگریزی جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز میں بقدرِ ضرورت دستگاہ پیدا کر لی۔

اسی زمانے میں انھیں منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم سے صحبت ہوئی۔ جو بعض اخبارات اور خصوص اودھ پنچ میں مضامین لکھا کرتے تھے اور ان کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُن کے شوق دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ جن میں بجائے پالٹکس میں منہمک ہونے کے انشا پردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۰ء میں منشی نول کشور صاحب نے انھیں اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنیٰ آفرینی اور لٹریری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور شور سے لکھنا شروع کئے کہ ہر جگہ شہرت ہوگئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدر آباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کئے گئے مگر ناپسند کیا۔ سر سید سے گو شناسائی نہ تھی۔ مگر انھوں نے "روح" کے سبجکٹ پر مولانا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا۔ "میں اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش اور دلفریب تھا کہ ہر طرف دھوم پڑ گئی۔ اس میں اٹھارہ انیس نمبروں میں انھوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا جس نے تمام صاحب ذوق لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رنگ اردو میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اُس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات تھے۔ مگر بندشیں انگریزی تھیں۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی و اردو کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا کہ نثر میں جا بجا اشعار شامل کئے جائیں۔ ابتداً اس رنگ کے نباہنے میں اکثر جگہ عبارت الجھ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اردو نثر میں انگریزی کی طرح علامات اوقاف (پنکچویشن مارکس) نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولانا کا ایجاد کیا ہوا رنگ ابھی پختگی کو نہیں پہونچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ان کی عبارت نے خاص رنگ پکڑ لیا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اردو انشا پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ اسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا اور فوراً اُس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شرر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے علیحدہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے اُن کی زیادہ قدر کرتا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں منشی نول کشور کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے سپیشل کارسپانڈنٹ بنا کے حیدر آباد بھیجا تھا۔ مولانا گئے مگر چھ مہینے رہ کر واپس آنا چاہا۔ مطبع نے اس کی اجازت نہ دی اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں انھوں نے اپنا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" لکھا جس میں دقتوں اور حالتوں کا

ایسا سماں دکھایا ہے کہ اردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چونکہ اس رنگ کا پورا ڈولپمینٹ اور رواج ابھی تک نہیں ہوا تھا لہٰذا جابجا اُلجھا اور پیچیدہ ہے اور اخلاق پسندی کی شان دکھاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہے جس میں عشق کو دلچسپی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا جو انشاپردازی کے اُس نقص سے پاک تھا جو پہلے حصے میں ہے۔ اس میں نہایت پختگی حاصل ہوگئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول درگیش نندنی کو اُس کے انگریزی ترجمہ سے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اور اُس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا انشاپرداز ترجمہ کرے تو اُس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اب پبلک مولانا کے کلام کی بے انتہا مشتاق تھی۔ ہر طرف دست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی بشیرالدین صاحب ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین صاحب نثار مالک "پیام یار" کے اصرار سے ۱۸۸۷ء میں مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز جاری کیا۔ اُس کے شائع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان میں ایک سرگرمی پیدا کر دی اور اس کی اشاعت ہزار سے زیادہ ہوگئی۔ اس میں خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ لٹریچر میں مل سکتے ہیں۔ اُردو کا خزانہ اُس وقت تک اس سے خالی تھا۔ کسی خیال کو موثر بنانا اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دلفریب بنا دینا دلگداز کے معجز نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سر رشتہ تعلیم کو بھی بغیر اس کے کہ مولانا کو اس محکمہ سے کوئی بھی لگاؤ ہو آپ کے مضامین لینے پڑے۔ اور اب ہندوستان میں اردو کا کوئی کورس نہیں ہے جس میں دو ایک مضامین شرر کے نہ ہوں۔

۱۸۸۸ء میں دلگداز میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اور اُس وقت سے مسلسل وہ ناول شروع ہونے لگے جن کے نام ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا، منصور موہنا وغیرہ ہیں جن میں مورخانہ شان سے قدیم دلچسپ واقعات کو اعلیٰ لٹریچر کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور مانگ ویسی ہی باقی ہے۔ بلکہ زیادہ ہے۔

شرر کے ناولوں اور نیز مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کو خصوصاً اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا ہے اور اسی وجہ سے مضمون اور ناولوں میں روز بروز خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا۔ اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ صرف سادے الفاظ میں جوش پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنا دینے کی شان بڑھتی گئی۔ اُن کے آخری ناولوں

ہیں "ایام عرب" ہے جس میں جاہلیت عرب کی زندہ سوسائٹی ایسی عمدگی و خوبصورتی سے دکھائی
گئی ہے کہ زمانہ حیرت کرتا ہے "فلورا فلورنڈا" اور "فتح اندلس" وغیرہ میں اسپین کے اسلامی دور کو
ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا گیا ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا۔

انھیں آخری ناولوں میں ناول "فردوس بریں" بھی ہے اس کا پلاٹ ایران اور اس زمانے میں
دکھایا گیا ہے۔ جب کہ جبال طالقان اور التموت میں باطنیوں (اسمعیلی لوگوں) کا زور تھا۔
اور ہزارہا بندگانِ خدا اُن کے خنجر سے مارے جاتے تھے۔ اُن کے بادشاہ نے پہاڑوں
میں ایک جنت بنا رکھی تھی۔ جس میں وہ سب سامان فراہم کیا تھا جو مسلمانوں کے خیال میں
جنت میں ہونا چاہئے۔ اس ناول میں عجیب حیرتناک طریقے سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ
کیونکر لوگوں کو فریب دے کر اپنا گرویدہ بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریروں سے انسان
کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تاریخی مذاق کے بڑھنے کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ مولانا شرر نے ۱۸۹۰ء میں مہذب نام ایک
اخبار جاری کیا جس میں مسلسل علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے اس پرچے کی اشاعت
بڑھتی جاتی تھی۔ اور مسلمانوں میں نہایت مقبول تھا کہ یکایک ۱۸۹۱ء میں انہوں نے دلگداز
اور مہذب دونوں کو بند کر کے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور وہاں ریاست میں دو سو روپیہ
ماہوار کا تعلق پیدا کر لیا جس کی وجہ سے ایک مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے
اتفاقاً نواب وقار الامرا بہادر سابق مدار المہام مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب ولی
خاں انگلستان میں ایٹن کالج میں تعلیم پاتے تھے اور چونکہ بچپن سے بھیجے گئے تھے لہٰذا مذہب
سے بالکل آشنا نہ تھے۔ مولانا شرر کو وقار الامرا بہادر نے اس خدمت کے لئے منتخب
کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں وہ انگلستان گئے۔ جہاں چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ اور موسیو
کوربین نام ایک فرانسیسی محقق سے فرنچ زبان شروع کی۔ جس میں اتنی دستگاہ ہے کہ
ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے۔

۱۸۹۸ء میں آپ نے حیدرآباد سے دلگداز کو از سر نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینے
تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی
صاحبزادی جناب سکینہ کی لائف آپ نے شائع کرنا شروع کی تھی۔ اس میں چونکہ تاریخی تحقیقات
کر کے اصلی واقعات لکھے تھے وہ عام مسلمانوں میں خاصۃً شیعہ لوگوں کے خلاف ہوتے
اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔ بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پرائیوٹ طور
پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ روک دیں۔ مگر آپ نے جب یہ رنگ دیکھا
تو بجائے اس مضمون کے خود پرچہ بند کر دیا۔ اور اُسے ۱۹۰۰ء میں پھر لکھنؤ سے جاری

کیا۔ جس میں سب سے پہلے اُسی سکینہ بنت حسینؑ کی لائف کا بقیہ تھا۔

اس زمانے میں ریاست دکن سے تعلقات قائم تھے۔ صرف مدار المہام مرحوم کی فیاضی اور سابق ہوم سکریٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ۱۹۰۱ء کے درمیان میں آپ واپس طلب کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلگداز بند کر کے آپ پھر حیدرآباد گئے۔ اس مرتبہ جانے میں یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقات ریاست کو نقصان پہنچا۔ وقار الامرا بہادر وزارت سے علیحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیئے گئے تھے۔ مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو آپ سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے کے لئے آئے تھے ان کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے کے لیے آئے تھے اُن کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔ غرض ریاست سے جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق وقار الامرا بہادر کے صاحبزادے نواب سلطان الملک بہادر کی سرکار سے تھا اُسے آپ نے خود ہی چھوڑ دیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ واپس آ کے پھر پبلک کی خدمت شروع کر دی۔ جب سے دلگداز پھر جاری ہوا اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت۔ سٹڈی کیا جائے اور اس میں خاص حیثیت سے انسان منہمک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اُردو میں کیا چیز پیدا کی ہے۔ اردو کے پرانے نمونے دو وضع کے تھے ایک تو میر امن دہلوی کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سرور کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجع و مقفّٰی عبارت۔ اس کے بعد جو اُردو کے نئے مجتہد پیدا ہوئے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ سر سید احمد خاں۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ مولانا نذیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا محمد عبد الحلیم شررؔ۔ سر سید نے سادگی اور وہ شان اختیار کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ یعنی ہر مضمون اس طرح ادا کیا جائے عامی سے عامی شخص اُس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شان یہ تھی کہ زبان میں بے تکلفی و روانی ہو اور روانی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی معتدل حد تک ہوں۔ مولوی نذیر احمد صاحب صرف روانی چاہتے تھے اور بے تکلفی میں اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ زبان کو جب تتین بنانا چاہتے ہیں۔ تو سوا اس کے کہ عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کر دیں اُن کا کچھ زور نہیں چلتا۔ بندشیں وہی رہتی ہیں اور عبارت بھی

وہی باقی وہی باقی رہتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ میں کوئی ایجادی مادہ نہیں ہے اور اگر
ہے تو صرف اتنا کہ ان میں ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُن کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے ایک تو
وہ جہاں وہ خود کوئی سماں کھینچنا چاہتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کی عبارت
میں اور سرور کی عبارت میں کوئی فرق نہیں۔ وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پرانی
تشبیہات و استعارات ہیں۔ اور وہی جا بیجا اور ضرورت و بے ضرورت استعارہ کا بھرتی کرنا
ہے۔ بلکہ الفاظ بھی وہی پرانے فارسی شاعروں کے ہیں۔ دوسری عبارت وہ جہاں عورتوں کی زبان
سے وہ ان کے خیالات ادا کرتے ہیں۔ اس میں سوا خاص خاص لغزشوں کے وہ لکھنؤ کی عورتوں
کی زبان اچھی اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان میں کوئی جدت نہ تھی سوا اس کے
کہ خلاف قیاس مضامین کو چھوڑ دیا پرانی عبارت اور اُن کی عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔

شرر نے ان سب لوگوں سے علیحدہ ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پردازی کی
خوب صورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا۔ مگر تشبیہات و استعارات وہی پرانے ایشیائی
رکھے۔ انہوں نے خیالی مضامین کو لیا۔ اور اُن میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی
خیال آفرینیاں کیں۔ اور عجب خوب صورتی کے ساتھ انہیں اردو میں کھپا دیا۔ اردو پبلک
میں ابتداءً یہ نیا رنگ تھا۔ انگریزی دانوں کو اردو میں وہ چیز مل گئی جسے وہ ڈھونڈھ رہے
تھے۔ اور صرف اردو جاننے والوں کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اس کی چاٹ پڑی تو
ان کے نزدیک اس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔ سرشار کا رنگ
زیادہ تر ان کے مضامین میں نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اٹھانے
کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ شرر ہی نے درحقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق
ہے کہ وہی جدید اردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے اور
جوں جوں رنگ چمکتا اور ابھرتا جائے گا۔ اسی قدر زیادہ نمایاں طور پر شرر کا سکہ اردو لٹریچر
پر نظر آتا جائے گا۔ سادی حیثیت میں وہ متین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال آفرینی کی
حیثیت میں وہ شاعری کے رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ جس چیز کی تصویر کھینچتے
ہیں اسے اسکاٹ کی طرح ناظرین کی نظر کے سامنے لا کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات
پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں اپنے ناول پڑھنے
والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنا زور طبع دکھانے کے لئے انہوں نے ایسے
ایسے سبجکٹ لئے جن پر ان سے پیشتر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مثلاً غریب کا چراغ
صحبت بہم" "نہیں" "ہاں" "لالہ خود رو" "یادرفتگاں" "دیہات کی لڑکی" "خواب دوشیں"
وغیرہ وغیرہ ایسے مضامین کو اردو میں پہلے پہل انہیں نے یادرفتگاں" "دیہات کی

لڑکی "خواب ودشیں" وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مضامین کو اردو میں پہلے پہل انہیں نے انٹروڈیوس کیا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج تک ان سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔ سٹر سچ یہ ہے کہ اردو لٹریچر کی دنیا میں ایک چابکدست مصور ہیں اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ

تاریخی ذوق بڑھنے کی بدولت مولانا تا دلسٹ سے ایک مورخ بن گئے آپ نے دلگداز میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور اکثر ناموران سلف کی سوانح عمری لکھ کے آپ نے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑھادی ہے۔ مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخیں بھی لکھی ہیں جو بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ایک تاریخ سندھ جس میں آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور ہی ثابت کر دیا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت ورق گردانی کی ہے دوسری تاریخ ارض مقدس ہے جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے رسول آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔

مولانا کا کیرکٹر یہ ہے کہ رسم و رواج کے اکثر خلاف رہتے ہیں اور تحقیق و تنقید کی دھن ہے۔ تقلید سے گریز اور اہل حدیث کے اصول مذہب کی طرف رجحان ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث سے بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا خیال غالب ہے اور ہر چیز صحیح ثابت ہو جائے اسکے تسلیم کرتے اور علانیہ اس کا اعتراف کر دینے میں باک نہیں کرتے۔ علمائے زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ انہیں اسباب سے اکثر عوام الناس اُن سے سخت مخالفت رکھتے ہیں۔ پہلی ناراضی لوگوں کو ان سے یہ تھی کہ مستند تاریخوں سے نقل کر کے شائع کر دیا کہ حضرت شہر بانو کا عقد جناب امام حسینؑ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے اپنے غلام زبید سے کر دیا۔ دوسری مخالفت وہی سکینہ بنت حسینؑ کی لائف کی بنیاد پر تھی مگر سب سے زیادہ اختلاف اس وقت ہوا جب آپ نے ۱۹۰۰ء میں پردہ عصمت نام ایک رسالہ لکھنو سے شائع کیا۔ جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے پردے کا

رسم اٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہے نہ گھر کی چار دیواری میں بند کر دینے کا۔ یہ رسالہ برس دن تک چلا۔ ہر جگہ سخت اختلاف ہوا۔ مگر اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اس لئے کہ اس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرفدار اور پردے کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اپریل ۱۹۰۴ء سے آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو و مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کئے جائیں۔

مولانا کے آخر عمر یعنی تقریباً ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۶ء ان کے سال وفات تک کے مزید حالات مختصراً اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہیں (۱)، دلگداز اس زمانے میں کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا۔ اور بالفعل ان کے صاحبزادے مولوی محمد صدیق حسن صاحب مینیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی اڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلتا ہے (۲)، جب مولانا محمد علی ۱۹۱۲ء میں اخبار ہمدرد دہلی سے نکالنے والے تھے تو سب سے پہلے انہوں نے اس کی ادارت کے واسطے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی میں قیام کرکے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے۔ اور اخبار مذکور سے کوئی تعلق نہیں رکھا (۳)، ۱۹۱۸ء میں حضور نظام فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کرکے ان کو اپنی سوانحعمری تیار کرنے کا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اس کے مولانا "تاریخ اسلام" لکھنے پر مامور کئے گئے جس کے واسطے ایک معتد بہ رقم ماہوار ان کو لکھنؤ گھر بیٹھے ملتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہوئی جس کی پہلی جلد شائع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔

مولانا کی چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ اس خاص صفت میں اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے تھے اور ان کی اس کثرت

تصانیف سے وہ زمانہ قرون اولی کا یاد آجاتا ہے۔ جب کہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقوں سے کتب تاریخ وسیر میں بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ قلم سے اس کے غسل میت کے واسطے پانی گرم کیا جانا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بار کئی کئی اونٹوں پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا جانا وغیرہ۔
غرضکہ مولانا کی تمام تصانیف کی اسم نویسی اس جگہ تحصیل حاصل ہے اس کے واسطے کوئی فہرست کتب یا دلگداز کے آخری اشتہاری صفحات دیکھنا چاہیئے یہاں پر ہم ان کے جاری کردہ اخبارات ورسائل اور ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد باعتبار ان کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

اخبارات ورسائل

(۱) محشر ہفتہ وار ۱۸۸۲ء لغایت سنہ ۱۸۸۲ء
(۲) دلگداز ماہوار سنہ ۱۸۸۷ء
(۳) مہذب ہفتہ وار
(۴) پردہ عصمت پندرہ روزہ
(۵) اتحاد ″
(۶) العرفان ماہوار
(۷) دل افروز ″
(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ "مورخ" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

سوانح عمریاں مثلاً "ابوبکر شبلی" "جنید بغدادی" وغیرہ ۲۱
تاریخی ناول مثلاً ایام عرب، بابک خرمی، وغیرہ ۲۸

خیالی ناول حسن کا ڈاکو، غیب داں و دلہن وغیرہ	۱۴
تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ	۱۵
نظم و ڈراما مثلاً شہید وفا، شب غم، شب وصل وغیرہ	۶
متفرق	۱۸
کل	۱۰۲

مولانا کے مضامین جو "دلگداز" میں چھپے ہیں سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدوں میں "مضامین شرر" کے نام سے حال ہی میں شائع کئے ہیں یہ سب کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات جو "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے دلگداز میں چھپتے رہے دیکھنے کے لائق ہے۔ اور اُن لوگوں کے لئے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جویا ہیں نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے۔

مرزا محمد ہادی رُسوا[1] مرزا محمد ہادی بی، اے۔ پی، ایچ، ڈی متخلص بہ مرزا اور رسوا فن شعر میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب اُن کو قریب قریب کل حفظ تھا۔ مگر اب غالب کی نازک خیالیاں اور عبارت آرائی اُن کو زیادہ مرغوب نہیں بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی میں وہ مومن کے متبع البتہ کہے جا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب کی معرکہ آرا تصنیف ان کی ناول "امراؤ جان ادا" ہے جس کو لکھے ہوئے تقریباً بچیس یا تیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کا ناول ہے اور اس کی عبارت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر (اشخاص قصہ) صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اُس میں زمانے کی طرز معاشرت اور سوسائٹی کے ہوبہو نقشے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف۔ اُن کے مثنوی نوبہار و صبح امید، مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈراما) اور ذات شریف (ناول) وغیرہ ہیں مرزا صاحب بالفعل عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں ملازم ہیں۔

[1] رسوا: سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی افتخار حسین تمکین کاظمی اور اعجاز حسین کے حوالے سے میمونہ انصاری ۱۸۵۷ء بتاتی ہیں۔ وفات ۲۱۔ اکتوبر

تصانیف

ناول

افشائے راز	۱۸۹۶ء	امراؤ جان ادا	۱۸۹۹ء
شریف زادہ	۰۲-۱۹۰۱ء	ذات شریف	
اختری بیگم		خونی شہزادہ	

حکیم محمد علی[1] | حکیم محمد علی متخلص بہ طبیب جن کا تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ایک مشہور ناول نگار تھے۔ مندرجہ ذیل ناول ان کی تصنیف سے ہیں۔ عبرت حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورارام پیاری۔ جعفر و عباسہ اختر وحسینہ۔ وغیرہ لبعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ مثلاً نیل کا سانپ جو رائڈر ہیگرڈ کی کلیوپیٹرا کا ترجمہ ہے اور دیول دیوی اور جعفر و عباسہ تاریخی ناول ہیں۔ حکیم صاحب گو اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے۔ مگر اعلیٰ درجے کے ناول نگار نہیں کہے جا سکتے اس وجہ سے کہ وہ زمانے کے رنگ سے بیخبر تھے۔ اور نہ وہ اس زمانے یا اس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جس کی وہ تصویریں کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی سے وہ پوری طرح باخبر نہیں اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے۔ عبارت میں یکرنگی ہے اور پند و نصائح سے اور بھی اسے غیر دلچسپ و بے اثر کر دیتے ہیں۔

راشد الخیری[2] | ناول نویسی میں مولانا نذیر احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جاتے ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ تر عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کے مصائب زندگی پر مبذول ہے۔ چونکہ عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے لہٰذا مصور غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ کثیر التصانیف ہیں۔ لبعض مشہور تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں۔ صبح زندگی شام زندگی۔ نوحۂ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرہ مغرب وغیرہ۔

نیاز فتحپوری | اردو کے مشہور و مشاق ادیب و جرنلسٹ نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری وطن فتحپور (یوپی) سال ولادت ۱۸۸۷ء ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی

---

[1] حکیم محمد علی وفات ۱۹۱۸ء

[2] راشد الخیری پیدائش ۱۸۶۸ء
وفات ۱۹۳۶ء (مرتب)

پھر مدرسہ اسلامیہ فتحپور مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی سے پڑھی انگریزی تعلیم ایف اے تک پرائیویٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایک ترک سے پڑھی۔ مختلف روزانہ اخبارات میں کام کیا اب سات سال سے "نگار" ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہے جو پہلے بھوپال اور اب لکھنو سے جاری ہے [1]

تصانیف صحابیات، گہوارہ تمدن، نگارستان (بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہے) جذبات بھاشا شہاب کی سرگزشت، شاعر کا انجام المسئلۃ الشرقیہ عرض نغمہ (ترجمہ گیتان جلی)

طرز تحریر | آپ کا طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے اور آپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم نما نثر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر بعض موقعوں پر جب یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو عبارت بانکلف اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے عبارت اور مضمون میں چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا اس قسم کی عبارت کو صرف انہیں مضامین پر صرف کرنا چاہیئے جو اس کے متحمل ہو سکیں۔ مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہے کہ آپ نے قدیم طرز انشا پردازی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہے آپ نے ٹیگور کی گیتان جلی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور رومی اور یونانی علم الاصنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اٹھاتے ہیں "کیوپڈ اور سائیکی اور مریخ سیاح کی ڈائری" انگریزی کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں آپ کی بعض کتابیں مثلاً شاعر کا انجام اور گہوارہ تمدن (جس میں ترقی تمدن میں عورتوں کے حصہ لینے کی بحث ہے) نہایت عمدہ اور دلچسپ کتابیں ہیں۔ آپ کا رسالہ "نگار" ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہے جس کے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت اعلیٰ دیکھنے کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

خواجہ نظامی | خواجہ حسن نظامی دلی میں ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوتے کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت درگاہ فلک بارگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہوئی۔ خواجہ صاحب ابتدائے عمر ہی سے اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے کچھ عرصہ تک گورنمنٹ ان کو بنظر شک دیکھتی رہی اور پولیس ان کی نگرانی کرتی تھی وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز بوجہ صوفی صافی ہونے کے بہت بااثر شخص ہیں۔ پچاس سے زیادہ کتب اور رسائل کے مصنف ہیں جن میں سے بعض بہت اچھی ہیں آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دلکش اور موثر طریقے سے

---

[1] نیاز کا ۱۹۶۶ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ نگار ان کی وفات کے بعد کراچی سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں جاری ہے اور خصوصی نمبروں کی اشاعت میں شہرت رکھتا ہے۔

ادا کرتے ہیں اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت سادہ سلیس اور دلکش ہوتی ہے مگر خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ آپ نے تقریباً دس کتابیں غدر کے بارے میں شائع کی ہیں جن میں سے بعض ترجمے ہیں اور بعض میں معزول شاہ دہلی کی اولاد کی پریشاں گردیوں کے افسوسناک اور عبرت ناک حالات ہیں آپ کی کتاب کرشن بیتی کو اہل اسلام اور خصوصاً ارباب تصوف بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں۔ میلاد نامہ۔ محرم نامہ۔ یزید نامہ۔ بیوی کی تعلیم اولاد کی شادی۔ جگ بیتی کہانیاں وغیرہ۔

پریم چند | میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں۔ اصلی نام دھنپت رائے ہے۔ پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں ۱۹۳۷ء سمیت سن ولادت ہے[1] آپ کے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب موضع پانڈے پور کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کر کے انگریزی شروع کی اور بنارس کالجیٹ سکول میں داخل ہوتے جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں ماں کا اور پندرہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ شروع میں آپ نے صیغہ تعلیم میں ملازمت کر لی تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے جب سے کہ آپ نے "زمانہ" میں مضامین لکھنا شروع کئے ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول "پریما" لکھا جو انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ۱۹۱۲ء میں "جلوہ ایثار" اور ۱۹۱۸ء میں "بازار حسن"[2] ہر دو حصہ تصنیف کئے۔ مثل اردو کے آپ کو ہندی میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ سیوا سدن پریم آشرم رنگ بھوم اور کایا کلپ آپ کے مشہور ناول ہیں جن کے اردو ترجمے بھی سنا گیا ہے کہ عنقریب شائع ہوں گے۔ رنگ بھوم علی الخصوص ایک نہایت دلکش ناول ہے آپ کا تاریخی ڈراما کربلا رسالہ زمانہ میں بہ اقساط نکلتا رہا۔ منشی صاحب موصوف چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانہ کے

---

[1] پریم چند ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس سے ۴ میل دور پانڈے پور کے نزدیک ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔
(پریم چند ان کا عہد اور فن ڈاکٹر عبید اللہ خان تحقیقی مقالہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
وفات ۸۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ (مرتب)

[2] سیوا سدن کا ترجمہ بازار حسن کے نام سے شائع ہو گیا ہے رنگ بھوم کے ترجمے کا پہلا حصہ چوگان ہستی کے نام سے شائع ہوا ہے دوسرا حصہ بھی عنقریب شائع ہو گا۔ ۱۲

کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے نگینوں کو چھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کئے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں بیحد آمد اور زور معلوم ہوتا ہے لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ آپ کو اردو ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی اس کے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں کہیں ظرافت اور کہیں درد وہی رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹر نہایت مخصوص جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں آپ کا ناول بازار حسن جو دو جلدوں میں ہے ایک طویل کتاب ہے مگر دلچسپی میں کم نہیں ہے اگر آپ کے اس قسم کے ادبی اشغال جاری رہے تو کچھ عرصہ میں آپ بڑی ترقی حاصل کریں گے۔ تھوڑے عرصہ سے بوجہ اردو کی ناقدری کے آپ ہندی کی طرف زیادہ توجہ فرما رہے ہیں۔ آپ کے خیالات سوشل اور پولٹیکل معاملات میں بہت اعلیٰ قسم کے ہیں۔ آپ کے مضامین ہندو مسلم اتحاد اور دَورِ جدید جو زمانہ میں نکلے تھے۔ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں آپ کی تصانیف علاوہ کتب مذکورۂ بالا کے پریم پچیسی حصّہ اول و دوم اور پریم تبیسی حصّہ اول و دوم چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہیں۔ خواب و خیال ابھی حال میں پنجاب سے شائع ہوا اور فردوس خیال انڈین پریس شائع کر رہا ہے۔[1]

سدرشن | آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کی بعض خصوصیات آپ میں بھی موجود ہیں مگر اُن سے کم درجے پر۔ آپ میں وہ استادی اور فنی کمال نہیں ہے اور نہ عبارت میں اس قدر ادبیت اور صحت ہے۔ آپ کی تصانیف حسب

---

[1] پریم چند کی تصانیف (صرف ناول اور افسانوں کی فہرست)

ناول

بیوہ۔ بازار حسن۔ پردہ مجاز۔ میدان عمل۔ گئودان۔ غبن گوشۂ عافیت۔ چوگان ہستی۔ جلوہ ایثار نرملا۔

افسانوں کے مجموعے:۔ سوز وطن۔ خواب و خیال۔ واردات۔ فردوس خیال زاد راہ۔ دودھ کی قیمت خاک پروانہ۔ پریم چالیسی (۲ جلد) پریم پچیسی (۲ جلد) پریم بتیسی (دو جلد) آخری تحفہ دیہات کے افسانے (مرتب)

ذیل ہیں۔

(۱) محبت کا انتقام ایک انعامی رسالہ جس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانچسو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی میں لکھا تھا اس کے بعد اس کا ترجمہ اردو میں ہوا۔

(۲) چندن اس پر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہے۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) بہارستان اس پر منشی پریم چند نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔

(۴) و (۵) تہذیب کے تازیانے اور زہریلا آب حیات بنکم چندر چیٹرجی کے بعض مضامین اور ناول کے ترجمے ہیں۔

(۶) عورت کی محبت ایک بنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۷) بیگناہ مجرم" بنگالی اور فرنچ کتابوں سے لیا گیا ہے۔

(۸) سدا بہار پھول مختصر قصوں کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نویس | فی زمانہ ناول نگاروں اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ ان سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ بہر طور اصحاب ذیل ان سب لوگوں میں زیادہ مشہور و ممتاز ہیں (۱) حامد اللہ افسر میرٹھی۔ جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے افسانے لکھنے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں ان کی اکثر کتابیں سر رشتۂ تعلیم میں بھی داخل ہیں۔ ایک مجموعۂ قصص جس میں ڈالی کا جوگ اور دیگر قصص شامل ہیں تیار ہو رہا ہے۔

(۲) مجنوں گورکھپوری

(۳) احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب اُردو

(۴) سید عابد علی

(۵) حکیم شجاع الدین

(۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک متحدہ جاسوسی کے قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری بہت مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ پنجاب سے بعض بہت دلچسپ قصے عورتوں کے لکھے ہوئے شائع ہوئے ہیں [۱]

---

[۱] سکینہ نے جن قصوں کا ذکر کیا ہے ان میں محمدی بیگم کے لکھے ہوئے قصے ممتاز حیثیت رکھتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

باب ۱۸

اُردو ڈراما

اُردو ڈراما اُردو ڈراما ایک غیر ملکی پودھا ہے جو سرزمین اُردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصب کیا گیا اور اب خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے

ڈراما کی عمومیت محاکات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم میں فطری ہے عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت اور گمراہی کے گڑھے میں پڑی ہو۔ نقالی انسانی فطرت میں داخل ہے البتہ بعض ممالک میں یہ جوش دبادیا گیا اور بدعت کہلایا۔ اہل اسلام اسی چیز یعنی نقالی کو جس میں ڈراما، بت تراشی، تصویر کشی رقص اور موسیقی سب داخل ہیں ممنوع سمجھتے ہیں۔ پس ان کے ممالک میں فنون لطیفہ کی نشو و نما اور ترقی کو گویا بدعت یا انحراف سنت کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونے اردو کو نہیں ملے مگر خود فارسی

(بقیہ حاشیہ)

ہیں ان میں خواتین کے مسائل اور ان کی اصلاح دلچسپ پیرایے میں بیان کی گئی ہے اس سلسلے میں سگھڑ بیٹی۔ شریف بیٹی اور صفیہ بیگم قابل ذکر ہیں۔ بیگم ر ظ حسن کا رونک بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا سرگزشت ہاجرہ عباسی۔ بیگم کا زہرا بیگم۔ نذر سجاد حیدر کا آہ مظلوماں کے نام بھی اہم قصوں میں شامل ہیں۔ ان قصوں میں معاشرتی اصلاح کے بعض پہلو موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ قصے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیے تھے۔

(مرتب)

اس تعالیٰ کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی وہاں ڈراما سے پیشن پلے (مرثیہ) کی صورت اختیار کر لی جس میں میدان کربلا میں حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہار رنج و غم کیا جانے لگا مذہب جو زمانہ قدیم میں عنصر غالب تھا اب ڈراما اور دیگر اصناف ادب کو ذریعہ تبلیغ قرار دینے لگا۔ اہل یورپ اور اہل انگلستان کے مریکل پلے (ایسے سین جن میں معجزات دکھائے جاتے ہیں۔) اور مسٹری پلے (ایسے سین جن میں اسرار دکھائے جاتے ہیں) جو قدیم کلیسائے مسیحی کے رسوم اور طریقہ عبادت کے مظہر ہیں اسی طرح سنسکرت اور ہندی کے مذہبی ڈرامے جو پرانوں اور دیگر مذہبی کتب ہنود سے اخذ کئے گئے ہیں اور اوبرامرگو[1] کے پیشن پلے ان سب کا ماخذ وہی قدیم مذہبی اعتقادات ہیں۔ ہندوستان میں اب تک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہے۔ پران اور دیگر مذہبی کتب کے قصے ڈراما کی صورت میں آکر اپنے خوب صورت پردوں اپنی دلچسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج سے اب بھی ہزاروں آدمیوں کے دلکشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اردو پر کیوں نہیں اثر کیا

ہندوستان میں ڈراما درجہ کمال تک پہنچ گیا تھا پس قدیم سنسکرت ڈراما کو جو اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا اردو ڈراما پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر کرنا چاہیئے تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ جس طرح اردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا اسی طرح فن ڈراما پر بھی اس کا کوئی اثر نہ پڑا سنسکرت کے ان دونوں خزانوں سے اردو نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جن کی وہ حقیقی وارث تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما کا زریں دور گزر چکا تھا اور اب وہ ایک تن بے جان اور محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اس کے شاہکار ہندوستان کی دیسی زبانوں میں مفقود تھے اس کا کھیل ایکٹنگ ابھی موقوف ہو چکا تھا۔ شروع میں بودھ مت اور جینی ڈراما کو ناپسند کرتے تھے مگر اس کا یہ فائدہ دیکھ کر کہ وہ ان کے دینی مسائل کے پھیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے وہ بھی اس کی قدر کرنے لگے اور بودھ مت کا ڈراما تو راجہ ہرش اور اشوک کے زمانہ میں بڑی ترقی کر لیا تھا جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کی ترقی ہوئی تو ڈراما

---

[1] اوبرامرگو جرمنی میں ایک مقام ہے جہاں مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی ناٹک کی صورت میں اسی طرح دکھلائے جاتے تھے جس طرح ہمارے یہاں رام لیلا ہوتی ہے ہزاروں آدمی اس مذہبی تماشے کے دیکھنے کو دور دور سے آتے تھے معلوم نہیں کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانے میں بھی اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے یا نہیں۔

اپنا پرانا عروج حاصل نہ کر سکا اس وجہ سے کہ غیر اقوام کے حملوں اور قوم کی مفلسی سے ملک میں بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈراما کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو گئی اور وہ اس کی پرانی شان و شوکت جاتی رہی۔ اور جب ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے ناٹک کی کمپنیاں کھول لیں تو ڈراما کی رہی سہی عزت جاتی رہی۔ ایکٹر لوگ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور مضمون بھی ادنیٰ درجے کے بعض وقت فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانے میں اردو اپنا جنم لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض ایک مکتوبی چیز رہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنیٰ درجے کا اور ذلیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اردو زبان ابتدا ہی سے فارسی کے آغوش محبت میں آگئی تھی اس کی سوتیلی ماں نے سگی ماں کو کونے میں بٹھا دیا تھا۔ فارسی روایات فارسی محاورے فارسی تخیل اردو پر غالب تھے۔ فارسی ادیب اس نوزائیدہ بچے کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب و تمدن کے سرچشمہ سے سیراب ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب سے طفل زبان مسلمانوں ہی کی گود میں پلنے لگا فارسی زبا ندان سنسکرت سے ناواقف تھے اسی وجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم دونوں بے اثر رہے۔ اگر یہ لوگ بھاشا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر پنڈت لوگ اردو کی پرورش زیادہ محبت سے کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اردو زبان اپنے اکثر نکتہ چینوں کو دندان شکن جواب دیتی۔

اردو ڈراما کے عناصر خمسہ | مسٹر عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس، نے ایک فاضلانہ مضمون میں اردو ڈراما کے عناصر ترکیبی حسب ذیل قائم کئے ہیں (۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) اہل ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مذہبی پلے اور دیوتاؤں اور دیوتوں کے حالات (۳) وہ چیزیں جو ادنیٰ درجے کے لوگوں میں جاری ہیں مثلاً سوانگ نوٹنکی نقلیں وغیرہ (۴) اسلامی نظمیں اور قدیم روایات (۵) زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپین اسٹیج کی ترقیاں۔

سنسکرت ڈراما | ہر چند کہ قدیم سنسکرت ڈراما کا اردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر پھر بھی بعض مشہور ناٹکوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کر دئے گئے ہیں تھوڑی عرصہ سے ڈراما کے پرانے قواعد بھی استعمال میں آرہے ہیں خاصکر وہ جو ابتدائی سین کے متعلق ہیں مثلاً ناٹک شروع ہونے سے پہلے ایک شخص جو سوتر دھار کہلاتا ہے مع اپنی بیوی کے اسٹیج پر آتا ہے اور تماشا کے تمام واقعات کو مختصر طور پر بتلا دیتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے کہ اب اصلی کھیل شروع ہونے والا ہے۔ بدوشک یعنی مسخرے کا پارٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشوں میں یہ بالکل علیحدہ رہتا ہے اور تماشہ کے اصل واقعات سے اس کو تعلق نہیں ہوتا

ہندو مزہبی پلے وغیرہ | اس قسم کے ناٹکوں نے بھی موجودہ اردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد فراہم کر دیا ہے۔ ان کی نسبت اردو ڈراما کے ساتھ وہی ہے جو ہالنشڈ اور ہال [1] کے پرانے قصوں اور مورخ پلوٹارک [2] کی قدیم یونانی مشہور لوگوں کی سوانح عمریوں کی شیکسپیر کے ناٹکوں کے ساتھ ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو ڈراما کی ابتدا ہی اس قسم کی ہندی چیزوں سے ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ سے ہندو لوگ رام اور کرشن کے مشہور واقعات زندگی کو تیوہاروں کے موقع پر مندروں میں ناٹک کی صورت میں لوگوں کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہوں ان سے اچھی اچھی باتیں سیکھیں اور اپنے دیوتاؤں اور سورماؤں کے واقعات زندگی سے مفید سبق حاصل کریں رامائن کے واقعات دسہرہ کے زمانے میں جب کہ رامچندر جی اپنے حریف راون پر فتح پاکر بھارت ورش میں واپس آئے تھے اسی قسم سے ہیں اور آج کل ایسے ناٹک رام ناٹک اور رامائن کے نام سے مشہور ہیں اور مذہبی لوگوں اور علی الخصوص عورتوں کو بہت پسند آتے ہیں اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت بھی اردو ڈراما کا جز ہیں۔ سچ پوچھئے تو جس قدر عاشقانہ اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی میں بالفعل ہے اس کا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادھا کے عشق پر مبنی ہے بہت سی ایسی کمپنیاں جو منڈلی کہلاتی ہیں متھرا اور بندرابن وغیرہ متبرک مقاموں سے چل کر راستے میں اپنے مذہبی گانوں اور تماشوں سے لوگوں کے دلوں کو محظوظ کرتی ہیں۔ ناچ اور گانا ان تماشوں کی جان ہے اس قسم کی کمپنیاں دولت مند اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہیں بلکہ عوام الناس کی دلچسپی کے لئے ہیں۔ یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں جہاں پہنچتے ہی فوراً ایک اسٹیج تیار کر لیتے اور کپڑے اِدھر اُدھر سے مانگ جانچ کر مہیا کر لیتے ہیں۔ اپنے چہروں کو رنگتے اور چراغوں یا مشعلوں کی روشنی میں اپنے تماشے دکھاتے ہیں اور آخر میں دو دو چار چار پیسے لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ مولانا غنیمت کشمیری نے اپنی مشہور

---

[1] یہ دونوں انگلستان کے قدیم مورخ سولہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں ان کے تاریخی فقروں کو کرانیکل کہتے ہیں شکسپیر نے اپنے تاریخی ڈراموں میں بہت مدد لی ہے [2] مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہنشاہ نیرو کا معاصر تھا تقریباً ۴۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کی کتاب لائوز "سوانح عمریاں" زمانہ قدیم کی ایک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے جس میں چھیالیس بڑے بڑے یونانی اور رومی مشاہیر کے حالات بالمقابلہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں اس کی دوسری کتاب موریلیا کئی رسالوں کا مجموعہ ہے ۱۲

مثنوی نیرنگ عشق میں ان جماعتوں کا جن کو وہ بھگت باز کہتے ہیں خواب خاکہ اڑایا ہے غالباً انہیں جماعتوں سے واجد علی شاہ نے جو اپنی عیش پرستیوں کے لئے مشہور تھے۔ ناٹک کا پہلا سبق سیکھا ہوگا اور وہ ان کو بہت پسند آیا ہوگا پھر انہوں نے ناٹک اور رہس خود قائم کر لئے جس میں وہ خود کنھیا اور ان کے محل کی عورتیں نہایت قیمتی اور زرق برق لباس میں گوپیاں بنا کرتی تھیں ہمارے نزدیک یہ ناچ اور گانا جو اردو ڈراما کا جزو لاینفک ہے انہیں رہس منڈلیوں سے لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ فرنچ اوپرا کا بھی اس اس پر کچھ اثر ہو کیونکہ واجد علی شاہ کے عہد میں ان کے یورپین دوستوں کی وجہ سے یہ وہاں مروج ہو گیا تھا۔

سوانگ نقلیں وغیرہ | سوانگ کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہے جو "پیجنٹ" کی انگریزی ڈراما کی ترقی کے پیشتر انگلستان میں تھی سوانگ ہندو تہواروں کے موقع پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلتے ہیں ان کو ابتدائی بھدی نقالی سمجھنا چاہیئے مگر عنصر ظرافت (کامک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے پرانے زمانے کے نقال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں رہتے تھے اور اپنی ظریفانہ باتوں اور نقلوں سے اپنے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے نقالی اس زمانے میں ایک مستقل فن تھا جو خاص تربیت اور محنت سے آتا سے آتا تھا اور اس کی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا تھا۔ نقالوں کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے زمانے میں امرائے دربار کے مصاحبین اور ملازموں کی تھی جو جماعتوں میں نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پنا سے لوگوں کو خوش کرتے تھے لوگوں کا خیال ہے کہ یہی پھرنے والی نقال کمپنیاں عہد ایلزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھیں۔ ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں طائفہ کے نام سے مشہور ہیں جو شادی بیاہ کے موقعوں پر بہ اجرت بلائے جاتے ہیں اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی باتوں سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں انہیں پرانے زمانے کی نقلوں سے آج کل کے تماشوں کے کامک اور نقلیں ماخوذ ہیں۔

اسلامی نظمیں اور روایات | یہ اردو ڈراما کا عنصر غالب ہیں نظم اور عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری کے لئے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے قدیم ڈراما نہایت موثر پُر درد داد بچے سروں کی عاشقانہ نظموں میں ہوتے تھے ان کی نثر مقفےٰ اور شعر دونوں موثر ہیں۔ زبان اردو بڑی تہ دار چیز ہے اس کا طرز ادا اس کے صنایع بدایع نہایت دلکش اور قابل تعریف ہیں وہ رزم و بزم دونوں موقعوں کے لئے موزوں اور جذبات نگاری کے لئے بھی پوری طرح مناسب ہے۔

انگریزی سٹیج اس کا اثر زمانہ حال کے اردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہے اردو سٹیج آجکل انگریزی ناٹکوں کے ترجموں سے بھری ہوتی ہے سٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پردے لباس نشستوں کا طریقہ تماشہ کے تقسیم پارٹوں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اسی کے زیر اثر ہیں۔

اردو ڈراما کے اقسام اردو ڈراما مستقل تصانیف اور تراجم پر مشتمل ہے اول الذکر کی تعداد نسبۃً کم ہے اور جو ہیں وہ کسی پولٹیکل یا سوشیل مبحث پر مبنی ہیں۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اور کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی (۳) فارسی قصے (۴) دیسی زبانیں علی الخصوص بنگلہ مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں۔

(۱) پران اور ہندو دیو مالا (۲) فارسی اور عربی قصے (۳) ہندوستان کے مشہور قدیمی روایتیں اور قصے (۴) انگریزی قصے (۵) مسائل حاضرہ یعنی کوئی پولٹیکل مسئلہ یا سوشیل خرابیاں۔

اردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر سب سے پہلا اردو ڈراما اندر سبھا[1] ہے جس کو امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا تھا جو عہد واجد علی شاہ میں دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہ ہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی۔ ایک ہندی شاعر نواز نامی نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد میں مشہور و معروف شکنتلا ناٹک کا زبان برج بھاشہ میں ترجمہ کیا تھا مگر خود اس ترجمہ کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے اس وجہ سے کہ نہ تو یہ ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہے کیونکہ دوہوں کی صورت میں ہے اور نہ اس میں ڈراما کی شان باقی رہی کیونکہ اشخاص قصہ جس طرح کہ ڈراما میں دستور ہے آتے جاتے نہیں اور نہ اس میں کیرکٹر اور ایکشن کا کہیں پتہ ہے اس وجہ سے نہ تو وہ ڈراما ہے

---

[1] جدید دور میں اردو ڈرامہ پر عبدالعلیم نامی کی تحقیق سے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ اردو تھیٹر کی تین جلدوں میں انہوں نے اردو ڈرامہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے جلد نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں امانت سے قبل کے ڈرامہ نگار اور امانت کے بعض معاصرین کے ڈراموں کی کیفیت ملتی ہے۔ اردو ڈرامہ کے اولیں ادوار کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ کتب دیکھئے۔ (مرتب)

اور نہ اس کا تعلق اردو سے ہو سکتا ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا زمانہ شاہی میں نقالوں اور بہروپیوں کا بڑا رواج تھا ان کی نقلوں سے لوگ خوش ہو کر ان کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتے تھے مشہور ہے کہ شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے ناچ رنگ اور عشرت پرستیوں کی وجہ سے محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہیں، اپنے اسی قسم کے اشغال میں مصروف تھے کہ نادر شاہ کا حملہ دلی پر ہوا۔ صحبت شاہی میں مخل ہونے کے ڈر سے کوئی شخص اس بری خبر کو اپنے منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ مجبوراً ایک نقال کے ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی گئی۔ نقلوں کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ حسب موقع فی البدیہہ یا فرمائش سے فوراً تیار کر لی جاتی تھیں۔ لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور علی الخصوص واجد علی شاہ کا زمانہ تو دولت و ثروت شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا اس زمانے کی ان الفاظ میں کیا اچھی تصویر کھینچی گئی ہے "وہاں دولت خوشحالی فارغ البالی، ناچ رنگ گانے بجانے کے ہر طرف جلسے تھے عاشق مزاج خوش رو جوانوں اور حسین مہ جبین نازنینوں کے جمگھٹے تھے زندگی اس مزہ سے گزرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختے پر باد بہاری چلتی ہے، ہر طرف سریلی آوازوں سے کان لطف اندوز ہوتے تھے وہ خیالی پرستان جس کو کوہ قاف کہتے ہیں اس سچ مچ کے پرستان کے آگے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بے فکری اور عیش و عشرت میں گزارتے تھے مات تھا۔ شاہزادے اور روسا امراء جو شادمانی اور کامرانی کے مجسم تصویریں تھے ان کو دیکھ کر دنیا دی جاہ و جلال اور مال و منال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا" اسی دربار میں اردو ڈرامانے جنم لیا۔ بادشاہ اور ان کے وزرا اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیوں کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو دربار شاہی سے متوسل تھا اوپرا کی تجویز پیش کی جس کا اس زمانے میں یورپ میں عروج ہو رہا تھا جو فوراً منظور کر لی گئی اس وجہ سے کہ اس میں صدہا حسین و جبین گانے والوں کے لئے جن سے دربار بھرا ہوا تھا ایک اچھا مشغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشہ لکھنے کا حکم ہوا۔

اندر سبھا امانت امانت نے ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی جو کہ لمبد کا ...

لے اندر سبھا کا ایک مستند متن سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ۱۹۵۷ء میں کتاب نگر لکھنؤ سے شائع کیا تھا اس کتاب کا نام لکھنؤ کا عوامی سٹیج ہے مقدمہ میں امانت کے حالات اور اندر سبھا سے متعلق تمام غلط روایات کی تردید کی گئی ہے کہ یہ واجد علی شاہ نے حکم پر لکھی گئی اور خود بادشاہ اس میں اندر بنتے اور سبھا کا تیصر باغ میں اہتمام ہوتا۔ (مرتب)

ہے اور چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کامیڈی ہے جو اوپرا کی ایک قسم ہے جونہی یہ کتاب تیار ہوئی اس کے واسطے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ میں ایک اسٹیج آراستہ کیا گیا۔ مشہور ہے کہ بادشاہ خود تماشا میں شریک ہوتے اور راجا اندر بنتے تھے۔ اور پریوں کا پارٹ خوب صورت حسین عورتیں کرتی تھیں جو پر تکلف اور قیمتی لباس اور جواہرات سے آراستہ ہوتی تھیں۔[1] ان تماشوں میں کسی غیر آدمی کے جانے کی اجازت نہ تھی یہ مسئلہ کہ آیا اردو ڈراما کی ترقی میں یورپ والوں نے کوئی حصہ لیا یا نہیں ہنوز مابہ النزاع ہے مولوی عبدالحکیم شرر مرحوم اس کو نہیں مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ کسی یورپین نے اردو ڈراما کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ معاملہ تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور اس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہیں ملتی جس سے اس پر کافی روشنی پڑ سکے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یورپین لوگوں نے اردو ڈراما کو زمانہ حال کے مطابق بناتے اور اسٹیج کے ساز و سامان اور تیاری میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہوگا۔ نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ناٹک ساگر میں بہت سے دلائل مولانا شرر مرحوم کے جواب میں پیش کیے ہیں مثلاً واجد علی شاہ کے دربار میں یورپین لوگوں کی موجودگی خود واجد علی شاہ کو نئی چیزوں کا شوق اندر سبھا کی اندرونی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے علاوہ خورشید جی بالی والا جو اس زمانے میں ایک مشہور ایکٹر تھے ان کا قول بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واجد علی شاہ تماشہ میں کچھ حصہ لیتے تھے یا کہ اندر سبھا کا تماشہ قیصر باغ میں ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہیں

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے کتاب راجہ اندر کی سبھا یعنی دربار کے سین سے شروع ہوتی ہے اور قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شائع ہوتے ہی بہت مقبول ہوئی اور اس کی مقبولیت کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ ابتدائی دھنیں اس کی شعروں اور گیتوں کی بڑے بڑے استادوں نے قائم کی تھی اور اس کا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پرتکلف تھا اس کی

---

[1] یہ روایت درست نہیں کہ واجد علی شاہ اندر سبھا میں شرکت کرتے تھے اصل حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ خود اپنے لکھے ہوئے منظوم ڈراموں میں شریک ہوتے تھے یہ ڈرامے امانت کی اندر سبھا سے قبل تصنیف اور اسٹیج ہوتے تھے دیکھئے سید مسعود حسن رضوی کی تصنیف لکھنؤ کا شاہی اسٹیج کتاب نگر لکھنؤ۔ (مرتب)

کامیابی دیکھ کر مداری لال نے ایک دوسری اندر سبھا لکھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر سبھا کی برابر نہیں ہے گو ڈراما کی حیثیت سے اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو۔ بعد کے زمانے میں جب تھیٹریکل کمپنیوں کا رواج ہو تب بھی اندر سبھا کی مقبولیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا اور اس کو لوگ اور تماشوں سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ دیوناگری گجراتی۔ گورمکھی اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی اور اس کے کم سے کم چالیس ایڈیشن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں اس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا جو بمقام لیپزگ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ اب سنا جاتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی ایڈیشن اندر سبھا کا لاہور سے نکلنے والا ہے۔

اردو ڈراما اور پارسی | ابتدا میں ہندو دیومالا کے قصے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے ان کو دیکھ کر چند پارسی نوجوانوں کے دل میں خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی قصے جس میں رستم وسہراب وغیرہ کا ذکر ہو عجلت کے ساتھ تیار کئے جائیں اور چھوٹے موٹے اسٹیج پر لوگوں کو دکھائے جائیں ان تماشوں کو ایسے لوگوں نے بھی دیکھا جو یورپی تھیٹر دیکھ چکے تھے اور ان کی نسبت اچھی رائے ظاہر کی۔ چند امیر پارسیوں نے جو کاروباری قابلیت رکھتے تھے اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر چند کمپنیاں بڑے بڑے شہروں میں مثلاً دہلی کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل میں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی کی تھی جن کو اردو اسٹیج کا ابو الآبا[ف۱] سمجھنا چاہیئے۔ یہ اردو خوب جانتے تھے۔ بلکہ شعر بھی کہتے تھے رنگ اور پری تخلص کرتے تھے اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے۔

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی رونق بنارسی | ان کی کمپنی کا نام اوریجنل تھیٹریکل کمپنی تھا جس میں یہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے۔ اور خورشید صاحب بالی والا کاؤس جی کھٹاؤ سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ تماشوں کی زبان اردو تھی مگر لکھنو اور دلی کی خالص اور عمدہ اردو نہیں بلکہ ایسی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکے کمپنی چونکہ تاجرانہ غرض سے قائم ہوئی تھی لہٰذا تماشوں میں وہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو بمبئی گجرات۔ بنگال غرضیکہ

ف۱ پسٹن جی فرام کو اردو کا ابوالآبا نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے تقریباً ۱۸۷۰ء میں اوریجنل تھیٹریکل کمپنی قائم کی ان سے قبل بمبئی میں ۱۸۶۱ء میں تھیٹریکل کمپنیاں موجود تھیں (اردو تھیٹر جلد اول ص ۲۶۳-۲۶۰) میں ان کمپنیوں کے نام موجود ہیں۔ ان کمپنیوں میں اردو انگریزی اور گجراتی ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو کی پہلی تھیٹریکل کمپنی کون سی ہے (مرتب)

تمام صوبجات ہندوستان میں بخوبی سمجھ میں آسکے تماشے اندر سبھا کی تقلید میں نظم میں ہوتے تھے۔ نیز اسی وجہ سے کہ کانوں کو خوشنما آئند معلوم دیں۔ اس زمانے کے ڈراما نگار رونق بنارسی[1] اور میاں حسینی متخلص بہ ظریف[2] تھے۔ رونق بمبئی میں رہتے تھے اور انگریزی تماشوں سے بھی ترجمہ کرتے تھے ان کا ایک تماشا "انصاف محمود شاہ" زبان گجراتی میں ۱۸۶۷ء میں بمبئی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ظریف کے بہت سے تماشے ہیں جن میں نتیجہ عصمت خدا دوست چاند بی بی بلبل بیمار وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ جب فرام جی بانی کمپنی کا انتقال ہو گیا تو بالی والا اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیاں علیحدہ قائم کر لیں۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی طالب بنارسی | یہ کمپنی خورشید جی بالی والا کی تمام کردہ تھی اور اس کا تھیٹر ۱۸۷۷ء کے مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ایکٹر تھے اور اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا اور کامک پارٹ علی الخصوص خوب کرتے تھے ان کی ایکٹنگ میں کسی قسم کا بازاری پن یا تکلف اور آورد نہیں معلوم ہوتی تھی اور نہ ان کو شرم اور جھجک تھی جس سے شیکسپیئر بھی مرعوب ہو جاتا تھا ان کو سیٹج پر دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے ان کی کمپنی میں اور مشہور ایکٹر یہ تھے۔ رستم جی مس خورشید۔ مس مہتاب اور ایک لیڈی مس میری فنٹن جو ہندوستانی چیزیں بھی خوب گاتی تھی۔ یہ کمپنی ایک زمانہ میں انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہاں بہت بڑا نقصان ہوا جو آخر میں بمبئی میں پورا کر لیا گیا۔

طالب بنارسی | منشی نبایک پرشاد طالب بنارسی اس کے ڈراما نگار تھے طالب شعر بھی کہتے تھے اور راسخ دہلوی کے شاگرد تھے انہوں نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اس کی زبان اور

---

[1] نام محمود احمد تخلص رونق ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ڈرامہ کے شوق میں پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں بحیثیت اداکار ملازم ہو گئے۔ بعد میں ڈرامہ نگار بنے۔ تمام عمر اسی کمپنی سے وابستہ رہے۔ رونق نے ہدایت کار دادا بھائی رتن جی ٹھوٹھی کے حکم سے اس دور کے بعض مقبول ڈرامے معمولی ردوبدل سے تیار کیے۔ رونق کے کل ۲۷ ڈراموں کے نام ملتے ہیں۔ (اردو تھیٹر جلد ۲۔ ص ۹۲۔) (مرتب)

[2] ظریف ڈرامہ نویس نہ تھے۔ وہ بمبئی میں بھگوان داس جناداس تاجر کتب کے ہاں ملازم تھے۔ اسی تاجر کے لئے وہ مشہور ڈراموں کو از سر نو لکھ دیتے تھے۔ اس طرح ان کا شمار ڈرامہ نویسوں سے زیادہ نقل نویسوں میں کیا جاتا ہے، اس نے ۳۰ کے قریب اس قسم کے ڈرامے لکھے اس کا کوئی ڈرامہ سٹیج نہیں ہوا (اردو تھیٹر اور ناٹک ساگر) (مرتب)

مضامین کو بھی درست کیا۔ ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان کا ایک ڈراما لیل ونہار ہے جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اس میں مترجم نے اصل کتاب کی خوب صورتی کو بہت کچھ قائم رکھا ہے ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ دکرم دلاس دلیر دل شیر ناز ان نگاہ غفلت ہریشچندر گوپی چند۔[1]

الفرڈ تھیٹریکل کمپنی احسن لکھنوی | وکٹوریہ کمپنی کے مقابلہ میں الفرڈ تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی جسکو کاؤس جی کھٹاؤ نے قائم کیا تھا۔ برخلاف خورشید جی کے ایک بڑے کامک ایکٹر تھے کاؤس جی ایک مشہور ٹریجک ایکٹر تھے یعنی جذبات درد وغم دکھانے کے استاد تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہے یہ شیکسپیئر کے رومیو اور ہیملٹ کا پارٹ خوب کرتے تھے اور مثل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے مرض ذیابیطس میں بمقام لاہور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ ان کی کمپنی کے مشہور ایکٹر منچرشاہ گلزار خاں مادھورام ماسٹر موہن ماسٹر منچر جی۔ مس زہرہ اور مس گوہر تھیں ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر جی نے تھیٹر چار پانچ سال تک چلایا اور پھر کلکتہ کے مشہور تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

احسن لکھنوی | الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے جن کا نام سید مہدی حسن ہے اور حکیم نواب مرزا شوق مشہور مصنف زہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نواسے ہیں۔[2] احسن صاحب نہ صرف ایک کامل ڈراما نگار بلکہ ایک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی داں بھی ہیں۔ ان کی ڈراموں کی زبان نہایت فصیح اور با محاورہ ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ زبان داں ہیں ان کی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس ہے جس میں میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ڈرامیٹک تصانیف یہ ہیں۔ فیروز گلنار۔ چندراولی۔ دلفروش۔ بھول بھلیاں۔ بکاولی چلتا پرزہ[3]

---

[1] طالب کے یہ ڈرامے مندرجہ ذیل سنین میں کھیلے گئے۔ لیل ونہار ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ۔ وکرم ولاس ۱۹۱۱ء لیر دل شیر ۱۸۹۰ء غفلت ۱۸۸۸ء ۔ ہریشچندر ۱۸۹۵ء گوپی چند ۱۸۹۲ء طالب نے ۱۴ ڈرامے لکھے۔ [الیغا ص۰۵-۱۰۶] (مرتب)

[2] پیدائش ۱۸۷۵ء وفات ۱۹۳۰ء

[3] احسن ان ڈراموں کے کھیلے جانے کے سنین فیروز گلنار ۱۸۹۸ء چندراولی ۱۸۹۷ء دلفروش ۱۹۰۰ء بھول بھلیاں ۱۹۰۱ء چلتا پرزہ ۱۹۰۲ء احسن کے اور ڈرامے بھی ہیں جن کے نام اور سنین یہ ہیں۔ زہر عشق ۱۸۹۷ء خون ناحق عرف مار آستین ۱۸۹۸ء شریف بدمعاش ۱۹۰۳ء گنگا تارا ۱۹۰۴ء اوتھیلو ۱۹۰۴ء (مرتب)

بیتاب دہلوی | حسن کے بعد الفرڈ کمپنی کی ڈرامانگاری کی خدمت پنڈت نرائن پرشاد بیتاب دہلوی کو سپرد ہوئی جو پنڈت ڈہلا رائے کے بیٹے اور فن شعر میں سردار محمد خاں طالب شاگرد غالب کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے یہ کمپنی میں باقاعدہ کام کرتے اور بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک رسالہ موسوم بہ شیکسپیر نکالتے تھے جس میں استاد زمانہ کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا۔ یہ اب بند ہو گیا ہے تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ "قتل نظیر مہابھارت زہری سانپ فریب محبت رامائن گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاپ کرشن سداما[1]

"قتل نظیر" پہلا تماشہ تھا جو بیتاب نے کمپنی کے واسطے تیار کیا تھا اس کی مقبولیت کی شاید یہ وجہ بھی ہو کہ اس زمانے میں دلی کی ایک رنڈی نظیر نامی مار ڈالی گئی تھی جس کا چرچا لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "مہابھارت" کا تماشا سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی دکھلایا گیا جو بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں بیتاب اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں کہ مہابھارت وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی کتابوں سے جو دلچسپ واقعات کا خزانہ ہیں ضروری ضروری دلچسپ واقعات چن لیتے ہیں اور ان کو نہایت عمدہ اور دلفریب طریقے سے ڈراما کا جامہ پہناتے ہیں ان کو ہندی میں بھی بڑا عبور ہے اور ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں اور مؤثر ہوتے ہیں انہوں نے متعدد تاریخی واقعات کو مثلاً دروپدی کا مہاراج سری کرشن جی کی خون بہتی انگلی باندھنے کے واسطے اپنی ساری پھاڑ ڈالنا اور سبھوا اور چیتا چماروں کا قصہ وغیرہ نہایت استادی اور حسن سے اپنے ڈراموں میں باندھا ہے وہ سین جس میں ساری پھاڑنا دکھایا گیا ہے بعض نکتہ چین اس کو خلاف قواعد فن اور خلاف تہذیب خیال کرتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس سے انتہا درجے کا اعتقاد اور محبت اور دوسری مہاراج کی عظمت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے ایک اور اعتراض ان کے تماشوں پر کیا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ نہایت بھونڈے پن اور دقیانوسی طریقے پر دکھلائے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی زبان بھی ایک حد تک ضرور قابل اصلاح و ترقی ہے ان کے یہاں نثر مقفّیٰ کی بہتات ہے جو بعض وقت بہت بری معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت برے اور بے میل معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔ اشعار بھی موقع و بےموقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت ریخ

---

[1] بیتاب کے ان ڈراموں کے کھیلے جانے کے سین: قتل نظیر ۱۹۰۱ء مہابھارت ۱۹۱۳ء زہری سانپ ۱۹۰۶ء رامائن ۱۹۱۵ء گورکھ دھندا ۱۹۱۰ء بیتاب کے ڈراموں کی تعداد ۲۴ ہے۔

(مرتب)

وعظ کے موقع پر بھی شعر ہی پڑھے جاتے ہیں جو بالکل خلاف فطرت چیز ہے مگر باوجود ان سب کمیوں کے بیتاب نے ڈرامانگاری میں کچھ سیح اور ترقی ضرور کی۔ بعض مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ بیتاب چونکہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سناتن دھرمیوں کو ناگوار اور ناپسند ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں ہے ان کی تماشوں کی شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوتی کہ مشہور حسین عورتیں اس میں تماشہ کرتی تھیں مختصر یہ کہ بیتاب کے جذبات عمیق اور ان کے کیرکٹر زبردست ہوتے ہیں۔ اور وہ اصول ڈراما کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیو الفرڈ کمپنی آغا حشر کشمیری | ایک شخص محمد علی ناخدا نامی نے ایک دوسری کمپنی الفرڈ کمپنی کے طرز پر کھولی اور اس کا نام نیو الفریڈ رکھا۔ مشہور کامک ایکٹر سہراب جی اس کے منیجر تھے جو بعد کو شریک بھی ہو گئے۔ یہ کمپنی ادھر اُدھر پھر پھرا کے آخر کار احمد آباد میں مستقل طور سے قائم ہو گئی عباس علی جو بعد کو جوبلی کمپنی میں چلا گیا اور امرت لال کیشو اس کے مشہور ایکٹر تھے امرت لال کا مس گوہر کے ساتھ تعلق ہو گیا تھا اور یہ دونوں آدمی آخر میں پارسی ناٹک منڈلی میں چلے گئے جس کے مالک فرام جی اپنے امرت لال کو اپنی کمپنی کا منیجر بنا لیا اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت نکالا۔ امرت لال کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا حشر کشمیری | آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بنارس میں مقیم ہے اور شال کی تجارت ہوتی ہے حشر کی ولادت امرتسر میں ہوئی[۱] وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں انہوں نے بہت سے تماشے نیو الفریڈ کے واسطے تحریر کئے جن کے پلاٹ زیادہ تر یورپی ڈراموں سے لئے گئے اور کچھ ڈرامے ان کی مستقل تصنیف بھی ہیں۔ نیو الفریڈ سے ترک تعلق کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم بہ شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کھولی جو نقصان اٹھا کر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام سیالکوٹ بند ہو گئی اس کے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہو گئے مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

---

(۱) حشر کے مقام ولادت میں اختلاف ہے۔ عبدالعلیم نامی لکھتے ہیں۔ کہ حشر یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو بنارس میں پیدا ہوئے وفات ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء (اردو تھیٹر جلد دوم ص۲۳۲) (مرتب)

شہید ناز - مرید شک - اسیر حرص - ترکی حور - خوب صورت بلا - سفید خون[1] وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے مثلاً سورداس - سیتا بن باس - گنگا اترن وغیرہ -

آغا حشر کو لوگ اُردو ڈراما کا مارلو کہتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں مارلو کا رنگ بہت ہے وہ اپنے کیرکٹروں میں وفور جذبات دکھاتے ہیں ان کا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں - وہ نثر و نظم دونوں کے استاد ہیں اور ان کا انداز بیان اس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے جب کہ دو کیرکٹروں سے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں آپس میں مکالمہ کراتے ہیں - اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص خوب صورت بلا اور سورداس میں ملیں گے آغا حشر کی ڈراما نگاری میں عیوب بھی وہی ہیں جو مارلو میں ہیں - یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت اور فرق ابھڑک رنگ بجائے اس کے کہ رنگ ہلکے ہوں اور ان میں قال میل کا خیال ہو - ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جن میں قتل و غارتگری وغیرہ دکھائی جاتی ہے آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اکثر جگہ شعر کو ایکشن پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں جو اصول ڈرامہ نگاری کے خلاف ہے کبھی کبھی واہیات اور سوقیانہ دل لگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات بیان واقعات اور سوقیانہ دل لگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات میں عجلت کی جاتی ہے جس سے ایکشن پر برا اثر پڑتا ہے مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور شخص ہیں اور ان کی تصانیف اردو ڈراما میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں -

دوسری کمپنیاں | مذکورہ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قائم ہوئیں ان میں سے بعض مشہور کے نام ہم یہاں لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی گزشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی - ۱۹۰۱ء میں لاہور میں جل گئی - مگر اپنے مالک آردشیر جی کی قابلیت اور حسن انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قائم ہو گئی (۲) جوبلی کمپنی دہلی اس کو دلی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قائم کیا تھا - اس میں عباس علی گلرو زرینہ اور جام جہاں نما میں پارٹ کرتے

[1] ان ڈراموں کے سن تصنیف یہ ہیں - شہید ناز ۱۹۰۲ء - مرید شک ۱۸۹۹ء اسیر حرص ۱۹۰۰ء ترکی حور ۱۹۲۲ء خوبصورت بلا ۱۹۰۹ء سفید خون ۱۹۰۷ء آغا حشر نے تقریباً ۳۲ اردو ڈرامے لکھے مندرجہ بالا ڈراموں کے علاوہ ان کے نام اور سن تصنیف یہ ہیں - مار آستین ۱۹۰۰ء میٹھی چھری عرف دو رنگی دنیا ۱۹۰۱ء دام حسن ۱۹۰۱ء صید ہوس ۱۹۰۸ء خواب ہستی ۱۹۰۸ء سلور کنگ ۱۹۱۰ء پہلا پیار ۱۹۱۱ء انوکھا مہمان ۱۹۱۳ء بھارت رمنی ۱۹۱۳ء یہودی کی لڑکی ۱۹۱۵ء بلوا منگل ۱۹۲۰ء شیر کی گرج ۱۹۱۸ء مدھر مرلی - بھگیرت گنگا - عورت کا دل - ہندوستان ۱۹۲۱ء آنکھ کا نشہ ۱۹۲۴ء سیتا بن باس ۱۹۲۸ء بھیشم پرتگیہ ۱۹۲۹ء دھرمی بالک ۱۹۲۹ء بھارتی بالک ۱۹۲۹ء دل کی پیاس ۱۹۳۰ء رستم و سہراب ۱۹۳۰ء عشق و فرض ۱۹۳۰ء خون جگر ۱۹۳۱ء

تھے (۳) بھارت ویاکل کمپنی میرٹھ اس میں بدھ بھگوان کا تماشہ خوب ہوتا تھا تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد احمدآباد میں ختم ہو گئی (۴) امپیریل کمپنی اور (۵) لائٹ آف انڈیا ان میں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی تماشہ کرتے تھے حافظ عبداللہ کے بعض تماشوں کے نام یہ ہیں جشن پرستان۔ انجام ستم۔ ستم ہامان وغیرہ۔ اور مرزا نظیر بیگ نے نلدمن۔ بہار عشق۔ فسانہ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ لکھے۔[1]

آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈراما نویس

علاوہ مذکورہ بالا ڈراما نویسوں کے اس زمانے کے بعض ڈراما نویس جن کی تصانیف کتب خانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یہ ہیں غلام حسین ظریف مصنف انجام سخاوت ۱۸۹۰ء محمد عبدالوحید قلیس جنہوں نے انجام نیک و بد اور حلیمہ پرستان لکھا۔ فقیر محمد تیغ مصنف انجام الفت و بینظیر و بدر منیر۔ فیروز شاہ خاں مصنف بھول بھلیاں ترجمہ شیکسپیر احمد حسن واقر مصنف بلبل بیمار میر کرامت اللہ میر عبدالماجد و مقصود علی۔ امداد علی مصنف البرٹ بل اردو میں سب سے پہلا سیاسی ڈراما) جہانگیر ترجمہ ہملیٹ[2]

شروع بیسویں صدی کے بعض ڈراما نویس

(۱) منشی علی دیوانہ الگزنڈرا تھیٹریکل کمپنی میں میں۔ تائید یزدانی اور مہرجان ان کے تماشے ہیں (۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی۔ حشر کے شاگرد ہیں اور آتشیں ناگ۔ نگاہ ناز خودپرست وغیرہ کے مصنف ہیں (۳) منشی رحمت علی مصنف دردجگر۔ بادفا قاتل وغیرہ پہلے البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے مینجر تھے اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں (۴) دوارکا پرشاد افق مصنف رام ناٹک جو ایک بہت طویل ڈراما ہے (۵) مرزا عباس مصنف نورجہاں و شاہی فرمان وغیرہ (۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ مصنف حور جنت (۷)، (۸) لالہ کشن چند زیبا و لالہ نانک چند ناز۔ یہ دونوں پنجابی ہیں۔ اور اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جن میں غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے (۹) لالہ کنور سین ایم اے چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر سابق پرنسپل لاکالج لاہور ڈراما کے مشہور نقاد ہیں ان کا ڈراما برہما نڈ ناٹک بہت عمدہ ہے اس میں آسمانی ستاروں کے کیرکٹر دکھلائے گئے ہیں (۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مصنف بدھ دیو جو بہت مقبول ہوا اس میں شانتی رس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین تصویر کھینچی ہے یہ ان عیوب سے پاک ہے جو اردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاکل بھارت بیاکل کمپنی کے روح رواں تھے جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی اور ایک زمانے میں شمالی ہندوستان کی کمپنیوں میں بہت مشہور تھی اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر ایکٹر پڑھے لکھے اور اچھے طبقے کے لوگ تھے

---

[1] مرزا نظیر بیگ کے ان ڈراموں کے سنین تصنیف۔ نل دمن ۱۸۹۰ء فسانہ عجائب ۱۸۸۸ء ماہی گیر ۱۹۰۱ء (مرتب)

باقی اگلے صفحہ پر

علی اطہر اس کمپنی کا ایک مشہور ایکٹر تھا۔ منشی جانیشر پرشاد مائل دہلوی ایڈیٹر رسالہ زبان نے اس کمپنی کے واسطے دو تماشے چندر گپت اور تیغ ستم تیار کئے تھے (۱) حکیم احمد شجاع بی اے اسسٹنٹ سکریٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب و ایڈیٹر رسالہ ہزار داستان ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈراما نویس ہیں۔ باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔ جانباز وغیرہ کے مصنف ہیں مگر ان کے ڈراما اسٹیج پر اچھے نہیں معلوم ہوتے (۲) سید امتیاز علی بی اے مصنف انارکلی[ط] دولہن وغیرہ۔ بالفعل رسکن کے الگزینڈر کا ترجمہ کر رہے ہیں (۳) سید دلاور علی شاہ مصنف پنجاب میل معمولی ڈراما ہے (۴) خان احمد حسین مصنف حسن کا بازار وغیرہ (۵) رادھے شام اکثر مذہبی ڈراما لکھتے ہیں جو اہل ہنود میں بہت مقبول ہیں (۶) سدرشن جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ادبی، سیاسی اور سوشل ڈراما اردو میں ادبی ڈراموں کی بہت قلت ہے مگر پھر بھی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں میکفرسن اور لوسی اور قاسم و زہرہ مولفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا مولانا شرر مرحوم وکرم اروسی مترجمہ مولوی عزیز مرزا مرحوم۔ مدرس وجاپان مولفہ مولوی ظفر علی خان۔ تسخیر فرانس جو شیکسپیر کے ہنری خامس کا ترجمہ ہے اور جولیس سیزر مترجمہ سید تفضل حسین نفیر۔ منشی جوالا پرشاد برق کے شیکسپیر کے اکثر ناٹکوں کے ترجمے جس میں معشوق فرنگ رومیو جیولیٹ[۲] کا منظوم ترجمہ ہے بیداری مولفہ حکیم اظہر صاحب ایڈیٹر تحریک ان کے علاوہ منشی محمد عمر صاحب مترجم ہائیکورٹ جموں کشمیر اور منشی[۳] نور الٰہی نے جو ناٹک ساگر کے مشہور مصنف ہیں جو تمام ملکوں کے ڈراما کی ایک مبسوط گو کسی قدر نامکمل تاریخ ہے اور اس سے اس باب میں بہت کچھ مدد لی گئی ہے اکثر مفید اور دلچسپ ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے ان کی یہ کوشش نہایت قابل تعریف ہے اور ان دونوں اصحاب کو اس فن میں خاص مہارت ہو گئی ہے اور ہم کو امید ہے کہ زیادہ تجربے کے ساتھ یہ زبان پر لیڈری

بقیہ حاشیہ ص[۲] ان ڈراموں کے سنین تصنیف یہ ہیں۔

عبدالوحید قیس — انجام نیک و بد انسان ۹۲ ۱۸ء۔ جلسۂ پرستان ۱۸۹۲ء

فقیر محمد تیغ — انجام الفت۔ بے نظیر بدر منیر [۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان]

فیروز شاہ خاں — بھول بھلیاں ۱۸۹۶ء

امراؤ علی — البرٹ بل ۱۸۹۳ء دوسری اشاعت،

البرٹ بل پہلی بار غالباً ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ ۳۰ راگست ۱۸۹۴ء کے رفیق ہند لاہور میں اس ڈرامہ کا اشتہار مرتب کی نظر سے گزرا ہے (مرتب)،

[ط] انارکلی ۱۹۲۲ء سید امتیاز علی تاج آجکل اردو کے قدیم ڈرامے مرتب کر رہے ہیں جن کی

باقی اگلے صفحہ پر

قدرت اور فن ڈرامانگاری میں عبور حاصل کر لیں گے۔ ان کی بعض تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) روح سیاست جس میں امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابراہام لنکن کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا ہے (۲) جان ظرافت فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں کنجوسوں کی بہت خبر لی گئی ہے (۳) قزاق مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ ہے (۴) بگڑے دل کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ (۵) ظفر کی موت میٹرلنک کے ایک ڈراما کا ترجمہ ہے[1]

سوشل ڈراموں کے ذیل میں مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی کا زود پشیمان جس میں کم عمری کی شادی کی قباحتیں دکھائی ہیں قابل ذکر ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایم اے جو ایک خوش گو شاعر اور بہت بڑے مضمون نگار ہیں ڈرامہ سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالفعل کشمیر میں اسسٹنٹ ہیں فارن سکریٹری کے عہدے پر ممتاز ہیں[2]۔ راج دلاری اور مراری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ راج دلاری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور ہو گئی ہے مسٹر کنورسین مشہور نقاد ڈراما ان دونوں کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں یہ دونوں نثر ڈرامے ہمارے موجودہ سوشل اور خانگی زندگی کے بہترین نمونے ہیں ان کے لکھنے کی غرض اصلاح معاشرت سے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ ان کو پورا آئینہ اخلاق سمجھیں ان میں طبقہ متوسط کے مردوں اور عورتوں دونوں کے صحیح خیالات و جذبات اور نیز ان کے نقائص اور کمزوریاں اور ان کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہیں طرز تحریر بہت شوخ زبان بامحاورہ اور خیالات بہت پاک وصاف ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین آسٹن کے ناولوں کو برنارڈ شا نے ڈراما کا جامہ پہنا دیا ہے البتہ لائق مصنف میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اس کی منطقی حد تک نہیں پہنچایا ہے۔ مولانا شرر مرحوم نے میوہ تلخ پردہ کی سختی کی خرابیوں پر لکھا۔ غرضکہ زمانہ موجودہ میں متعدد

(بقیہ حاشیہ) قناعت مستقبل ... ہو رہے ہو گی۔

۲۔ محمد عمر پیدائش ۱۳۰۰ھ/۸۳-۱۸۸۲ء وفات ۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء

۳۔ نور الٰہی پیدائش ۱۸۸۳ء وفات ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء (مرتب)

ان ڈراموں کے سنین اشاعت

روح سیاست ۱۹۲۲ء

قزاق ۱۹۲۳ء

بگڑے دل ۱۹۲۳ء

ظفر کی موت ۱۹۲۳ء

۲۔ کیفی ۱۹۵۵ء میں انتقال کر گئے (مرتب)

ڈراما انہیں معاشرتی مسائل پر لکھے جاتے ہیں جن میں ضمناً یا صراحتاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف میں منشی امداد علی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۸۹۳ء میں بمقام لاہور شائع ہوا تھا یعنی اس وقت جب کہ مشہور البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جس میں انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کو بیان کیا ہے سیاسی ڈرامے کہے جا سکتے ہیں مگر یہ کوئی دلچسپ اور وقیع تصانیف نہیں ہیں اسی طرح ترک موالات کے عروج کے زمانے میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسائل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے ان میں سے کوئی قابل ذکر نہیں الا وہ جو منشی کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

اردو ڈراما کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا

جیسا اوپر بیان ہوا اندر سبھا سے اُردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ رہس کے طریقہ پر لکھی گئی نہ تو اس میں کوئی منتظم پلاٹ ہے اور نہ صحیح معنوں میں کیرکٹر ہیں اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی یا کم سے کم اس کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی ان کی تصانیف کی وجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اردو کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں جہاں ان کے ڈراما کھیلے گئے ، شہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ظریف کی غرض صرف دلچسپی اور تفریح تھی ان کے ڈراما ادبی حیثیت سے ممتاز نہیں ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہیں ان کی تحریر میں استادی نہیں پائی جاتی نثر و نظم دونوں ابتدائی رنگ کی اور ناقص ہیں۔ حافظ عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کئے ان کے بعد طالب و احسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو بھی ایک حد تک بہت درست کیا انہوں نے دو پلاٹوں کو ایک کر دیا اور اسی پلاٹ میں بعض کیرکٹروں سے مسخرہ کا کام لیا یعنی کومیڈی کو بھی اسی قصہ میں شامل کیا معمولی گفتگو مقفیٰ نثر میں ہوتی تھی اور نظم گیتوں کے واسطے مخصوص کی گئی کبھی کبھی گفتگو میں بھی اس کو زوردار اور موثر کرنے کے لئے شعر استعمال کئے گئے گیت زیادہ تر ہندی زبان میں ہوتے تھے اور اب ڈراما اوپرا کی حد سے نکل کر صحیح ڈراما کی حد میں آگیا کیرکٹر سازی ایکشن اور اختتام قصہ پر زیادہ توجہ کی گئی۔ طالب نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی میں آمیزش کی۔ حشر نے پھر وہی طریقہ یعنی ایک قصہ میں دو پلاٹوں کا اختیار کیا ان کی خصوصیات کا بیان ان کے حالات میں مختصراً ہو چکا ہے بیتاب

کی شہرت ان کے دو مشہور ڈراموں مہا بھارت اور راماین سے ہوئی جس کے کیرکٹر
مشہور سنسکرت شاعر بیاس سے لئے گئے جن کی تصانیف اپنی مجموعیت اور رنگینیت
سے بہترین ڈراما کہی جاسکتی ہیں بیتاب کے نقائص کو بشمبر سہائے نے اپنے ڈراما
بدھ دیو میں دور کیا اس کی زبان گو اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اردو نہیں ہے مگر پھر
بھی بہت زوردار زبان ہے جس میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے خیالات بہت
پاکیزہ اور انداز بیان بہت دلکش ہے۔ مسٹر کنور سین نے اپنی کتاب برہمانڈ ناٹک
میں علم ہیئت یعنی ستاروں سے کام لیا اور واقعی بڑی استادی اور خوبی سے
ترتیب دیا کیفی صاحب نے سوشل مضامین پر ڈراما لکھے۔ "نور وطن اور اتفاق"
بلاشبہ سیاسی ڈراما ہیں تاریخی ڈراما کا بھی اب رواج ہو چکا ہے اور یہ زیادہ
تر مشہور بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں ان کے علاوہ ہندو دیومالا اور ہندوستانی
تاریخ بھی بہت کچھ مواد آج کل فراہم کر رہی ہے اور مغربی ڈراموں کے ترجمے
بھی بکثرت ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ڈراما بہت کچھ ترقی
کر رہا ہے۔

اردو ڈراما کے دیر میں ظاہر ہونے کے اسباب ہم اوپر بیان کر آتے ہیں یعنی
یہ کہ سنسکرت اور ہندی ناٹک زوال میں آکر متروک ہو چکے تھے اس کے علاوہ
سنسکرت ناٹکوں کے جو ترجمے بڑے بڑے قابل انگریزوں مثلاً سر ولیم جونس پروفیسر
ولسن اور مونیر ولیمس نے کئے تھے وہ انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں
کی سمجھ سے باہر تھے۔ اور اردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ سنسکرت
سے بھی ناواقف تھے اور نہ اس کے جاننے کے خواہشمند تھے لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے
کہ اردو ڈراما کا صحیح وجود اس وقت ہوا جب کہ اہل مغرب کا اثر اس ملک پر
ہونے لگا۔ اس کے بعد البتہ سنسکرت ڈراموں سے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ
اٹھایا جانے لگا۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص شروع میں ڈرامے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ
محض فائدے کی غرض سے کھیلے بھی جاتے تھے۔ پارسی لوگوں نے جو تجارت کا خاص
مذاق رکھتے ہیں اس کام کو ایک کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور جب ان کی کمپنیوں
کو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے جن کے ماخذ جیسا اوپر مذکور

ہو چکا ہے ہندو دیو مالا۔ پرانے قصے اور افسانے انگریزی ڈراموں کے ترجمے سبھی کچھ تھے تماشے کی عمدگی اور تکمیل کا خیال مطلق نہیں رکھا جاتا تھا کسی پرانے قصے کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتیں اس میں جوڑ کر تماشا تیار کر لیا بس یہی کافی تھا۔ ڈرامانگار بھی اسی وقت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زیادہ تر ایکٹروں میں سے یا ان لوگوں میں سے جن کو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا شوق ہوتا تھا یہ لوگ منتخب کر لیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے لوگ رکھ لئے جاتے تھے جو مینیجروں کی ہدایت کے موافق جلد جلد تماشے تیار کر دیا کرتے تھے۔ نفس ڈراما میں یہ خرابیاں ہوتی تھیں کہ ان کی عبارت بہت سست ہوتی تھی۔ اشخاص ڈراما بجائے معمولی طریقے کے اشعار میں گفتگو کرتے تھے۔ اور بعض اوقات غزلیں کی غزلیں اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتی تھیں اور اشعار بھی اعلیٰ درجے کے نہ ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور بے مزہ۔ نیز بھی انتہا درجے کی مسنوعی اور غیر مکمل پلاٹ اور کیرکٹر کا کہیں پتہ نہیں ایکشن نہایت ناہموار سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ٹریجڈی اور کامڈی جن کا کبھی میل نہیں ہو سکتا ایک ہی پلاٹ میں شامل کر دی جاتی تھیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی ادنی درجے کے ہوتے اور مہذب اور متین لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہرگز نہیں ہوتے تھے۔ بوسہ بازی گلے ملوں اور فحش گفتگو بے تکلف جائز تھی بلکہ اسی سے آنے کے ٹکٹ والے بہت خوش ہوتے تھے ایکٹرس عورتیں زیادہ تر ادنی درجے کی رنڈیاں ہوتیں قتل و خونریزی کے سین بے تکلف اسٹیج پر دکھائے جاتے کا ئک پارٹ اور نقلیں وغیرہ نہایت ادنی درجے کی ہوتی تھیں۔ غرضکہ فن ڈراما جن اعلیٰ عناصر سے مرکب ہے وہ بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصے کے بعد انگریزی ڈراموں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شیکسپیر کے تماشے لوگوں کو بہت پسند آئے ان میں سے اکثر ترجمے کے ذریعے سے سٹیج پر دکھائے جانے لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک میں بھی اصلیت کی جھلک تک نہیں معلوم ہوتی تھی ان کی مقبولیت اس درجہ ہوئی کہ بعض تماشوں کے چار چار پانچ پانچ ترجمے کئے گئے جن میں سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں موجود ہے ان ترجموں میں اشخاص قصہ کے نام بدل کر ہندوستان کی مناسبت سے کچھ اور رکھ دیئے گئے مگر اصلی کیرکٹر مترجموں کی سمجھ میں مطلق نہیں آئے مثلاً شیکسپیر کے مشہور تماشے ہیملٹ میں وہ سین جس میں ہیملٹ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے مترجم صاحب بوجہ انگریزی نہ جاننے کے اس کا صحیح مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے مسٹر

عبداللہ یوسف علی فرماتے ہیں انگریزی سٹیج کا اثر ہندوستانی اسٹیج پر اس کی بناوٹ اسکے ساز و سامان اس کی پردوں وغیرہ سے پوری طرح ظاہر ہے اردو ڈرامانے انگریزی ڈراما کی اندھا دھند تقلید دو طریقے سے کی۔ پہلے یہ کہ ابتدا میں وہ انگریزی ڈراما جو "پرابلم پلے" کہلاتے تھے اور جن کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پرانے رسم ورواج اور اخلاق و عادات کا خوب خاکہ اڑایا جائے ان کی تقلید میں ابتدائی اردو ڈراما بھی اس معاملے میں تمام پرانی چیزوں کی نسبت بہت آزاد و بیباک ہو گیا۔ بس اس معاملے میں انگریزی ڈرامانے اردو ڈراما کے ساتھ وہی کیا جو اٹالین ڈرامانے فرینچ ڈراما کے ساتھ اور فرینچ ڈراما نے عہد رسٹوریشن کے انگریزی ڈراما کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسی تقلید کی وجہ سے انگریزی دھنیں ہندوستانی تھیٹروں میں رائج ہو گئیں مگر نہایت بھونڈے طریقے سے رائج ہوئیں اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دھنوں کے واسطے معمولی شعرا نے نظمیں بھی اسی انداز کی لکھنا شروع کیں جس کا نتیجہ نہایت تمسخر انگیز ہو گیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی اردو شعر کو انگریزی دھن میں گائے اور چونکہ اس کوشش میں الفاظ ضرور ٹوٹ پھوٹ جائیں گے لہٰذا ان کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا مسٹر کنور رسین نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزوں کا بھی نتیجہ ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی ایکٹروں کا ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنا۔ ڈراما نویسوں کی معمولی لیاقت تماشائیوں کا اچھے برے میں تمیز نہ کرنا اور مالکان تھیٹر کا اپنے نفع کی غرض سے ان لوگوں کو خوش کرنا جن سے انہیں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ دوسری بات جو انگریزی دھنوں کے متعلق اوپر لکھی گئی یہ بالکل صحیح ہے اس سے واقعی ہندوستانی موسیقی کو جو نہایت سائنٹفک اور اعلیٰ درجے کی ہے بہت بڑا نقصان پہنچا۔

<u>موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی</u> | موجودہ زمانے میں اردو ڈراما میں ایک نمایاں تغیر و ترقی دیکھی جاتی ہے اردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اردو ڈراما پر اوپیرا ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فرینچ ڈراموں کے ترجمے نیز بنگالی گجراتی اور مرہٹی ناٹکوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس میں تھے جن کا نام بابو ہریشچندر تھا۔ یہ بھارتندو کے لقب سے مشہور تھے اور ہندی ناٹک لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ سنسکرت سے پوری طرح واقف تھے اور مشہور کالیداس اور بھاو بھوتی کے رنگ میں ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اپنے قصوں کے پلاٹ زیادہ تر پرانوں سے لیتے تھے۔ جو دلچسپ قصوں کو خوب صورت بنا دینے میں وہ عجب کمال رکھتے تھے چونکہ یہ ہندی میں

لکھتے تھے لہٰذا ان کی تصانیف کا اثر مابعد کے اردو ڈراموں پر بہت کچھ ہوا۔ مثلاً راجہ ہریشچندر، رکمنی منگل، بلوا منگل وغیرہ۔ بالفعل اردو ڈراما کے مضامین میں بہت توسیع کی جا رہی ہے۔ علاوہ ان پرانے قصوں کے جن کا رواج اب تک تھا اب نہایت توسیع کی جا رہی ہے علاوہ ان پرانے قصوں کے جن کا رواج اب تک تھا اب نہایت دلچسپ قصے اسٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ پولیٹیکل اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے قصوں کی عمدگی اور اخلاق آموزی میں بھی بہت کچھ فرق ہے عشق و عاشقی جو سٹیج پہ دکھائی جاتی ہے نیز وہ جذبات اور واردات قلبیہ جو ایکٹنگ ذریعہ سے دکھلاتے جاتے ہیں بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نغمات کی طرف زیادہ توجہ ہے ڈراما کے مضامین اور مطمع نظر بہت وسیع ہو گئے کیرکٹر اور پلاٹ میں بھی ترقی ہے ایکٹروں کو اپنے افعال پر کافی قابو ہوتا ہے اور اب وہ پہلا سا بے تکا پن ان میں نہیں ہے خیالات اور الفاظ دونوں میں شستگی اور متانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کی جاتی ہے نقلوں اور کامک پارٹوں میں وہ پہلے کی سی بدتمیزی اور پھکڑ پن جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا اب نہیں ہے مختصر یہ کہ قدیم اور جدید اردو ڈراموں میں اب زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

<u>اصلاح و ترقی کی ضرورت</u> اگر باینہمہ اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہے خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈینگ نہ ہونا چاہیے بلکہ معنویت اور اصلیت کا زیادہ خیال رکھا جاتے تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو۔ گفتگو کے موقع پر مقفی عبارت گو معین حافظہ سہی مگر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے اس کی جگہ بے تکلف سیدھی سادی بات چیت سے کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ابھی بہت اصلاح کی گنجائش ہے اس کے واسطے بہت ہوشیار اور چابکدست قلم چاہیے تمسخر اور مذاق کے موقعوں پر فحش اور بھانڈپن سے بچنا چاہیے اور مذاق نہایت ستھرا اور شائستہ ہونا چاہیے اصلاح زبان پر بھی توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے اصل فن ڈراما نگاری سے ہمارے ڈراما نویس ابھی آشنا نہیں ہیں اور ہماری رائے میں یہ بات اسی وقت نصیب ہوگی جب کہ اس کام کو وہی لوگ کریں گے جو اس کام کے اہل ہیں اور جن کا قدرتی میلانِ طبع اس طرف ہے اردو ڈراما کی ترقی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدان عمل وسیع کیا جائے اور نااہل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پرانے سنسکرت ناٹک ترجمہ کرائے جائیں جن سے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اعلیٰ آئیڈیل کا حال معلوم ہوگا۔ اور وہ دیکھیں گے کہ یہ فن شریفانہ گزشتہ

زمانے میں کس عروج تک پہنچ گیا تھا۔ اور آج کل زندہ قوموں اور ملکوں میں اس کی ترقی کی کیا حالت ہے اسی میں سے ان کو اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں اخذ کرنا چاہیئے مگر یہ ضرور ہے کہ ترجموں کی کثرت سے طبعزاد تصانیف دب نہ جائیں۔ زمانہ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دلچسپ اور سوشل تماشے مرتب کیے جائیں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کیے جائیں اس فن کو بنظر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علما وفضلا اس کی تضحیک وتذلیل کے درپے نہ ہوں ایکٹروں پر بھی ذلت کی نگاہیں نہ ڈالی جائیں ان کاموں کے واسطے زیادہ اہمیت اور زیادہ سرپرستی کی ضرورت ہے پردہ کی موجودگی سے ہمارے ناولوں اور ڈراما میں جو بعض رکیک اور ذلیل باتیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً رسم پردہ اٹھنے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج نہ کیا جائے اسی طرح ڈراما نویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشوں اور کاموں کو معزز سمجھیں۔

اردو ڈراما کا مستقبل | ہر چند کہ پیشین گو سچے نہیں سمجھے جاتے اور ان کی رائے کو معتبر نہیں مانا جاتا مگر باینہمہ ہم یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اردو ڈراما اپنے لئے ایک روشن مستقبل رکھتا ہے جس طرح اس باب کی ابتدا مسٹر عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اسی طرح اس کا اختتام بھی انہیں کے الفاظ میں کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اردو ڈراما بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی وجاہت لوگ یقیناً اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں اور اس کی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی کہ جہاں صحیح فن ڈراما سے کوئی واقف نہ تھا یعنی تاریخی اور سیاسی ڈرامانگاری۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شیکسپیر نے لکھے ہیں ان کی تصنیف کے واسطے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں کی سچی تقلید سے ہندوستان میں صحیح ڈرامانگاری کا مادہ پیدا ہوگا اور اسی وقت اردو ڈراما دنیا کے بہترین ڈراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔

باب ۱۹

زبانِ اُردُو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل الرائے لوگوں کی قیمتی رائیں

پورے ادب اردُو کا ایک خاکہ ابواب مذکورۂ بالا میں کھینچا گیا۔ اس باب میں زیادہ تر زبانِ اردُو سے بحث ہوگی نیز یہ کہ ادب اردو کا بہ مقابلہ دوسری دیسی زبانوں کے کیا مرتبہ ہے اس باب کی ترتیب میں مولوی عبدالمجید صاحب کے اُس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لی گئی ہے جو ماڈرن ریویو میں شائع ہوا ہے۔

اردُو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے اردُو بالاتفاق ایک ایسی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت شیرینی اور اظہارِ مطلب کے لئے بڑی شہرت رکھتی ہے یہ تہذیب و تمدن کی زبان ہے اور اس میں خیالات اور حسیات کے نازک فرق ادا ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اس میں اکثر دوسری زبانوں کے مخصوص الفاظ و حروف شامل ہیں، مثلاً عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت وغیرہ، لہٰذا یہ بہ نسبت دوسری دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم بننے ادبی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدن و شائستگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے زیادہ تر موزوں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنی اپنی قومی اور ملکی زبانوں کو چھوڑ کر اور ایک تیسری زبان اختیار کر کے ایثار و اتحاد کی ایک بیّن مثال پیش کی اور یہ زبان گو کہ ہندستان میں پیدا ہوئی مگر غیر ملکی ذرائع اس کی ترقی اور نشو و نما کے باعث ہوئے لہٰذا اس سے بہتر عملی طور پر اتحاد کا بیّن ثبوت نہ کوئی اس وقت تھا اور نہ اب ہے۔

ہندوستان کی زبان عام ہے اردو صحیح معنوں میں ہندوستان بھر کی "لنگوا فرینکا" یعنی زبان عام ہے۔ کیونکہ اُن مقامات میں بھی جہاں یہ بولی نہیں جاتی بخوبی سمجھی جاتی ہے اور زبانوں کا یہ حال ہے کہ صرف اپنے اپنے ملک یا دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں مگر دوسری جگہ ان کو سمجھنا دشوار ہے۔ مثلاً کشمیر میں اگر مرہٹی بولی جائے بہار میں گجراتی اور سندھ میں ٹامل تو بھلا ان کو کون سمجھے گا مگر وہ زبان جس کو ہندوستانی یا اردو کہتے ہیں ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بتلا سکتا ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے میں بلکہ دور دراز تک اس سے باہر بھی مثلاً عدن

بندر سعید مالٹا وغیرہ تک میں یہ بے تکلف سمجھ لی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادران وطن سے معافی کے خواستگار ہیں اور کسی دیسی زبان کی توہین یا برائی نہیں کرنا چاہیئے مگر اصل یہ ہے کہ تمام دیگر دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبے کی مخصوص زبان کہی جاسکتی ہیں اور اردو ایک بین الاقوامی اور ہر صوبہ کی زبان مانی جائے گی اور چونکہ تمام دیسی زبانوں میں بہت سے اردو الفاظ شامل ہیں۔ اور اب اور زیادہ ہوتے جاتے ہیں لہذا اُن مقامات کے رہنے والوں کو بھی جہاں اردو عام طور پر نہیں بولی جاتی اس کے سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

ایک وسیع زبان ہے اردو ایک نہایت وسیع زبان ہے اور اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہو گئے ہیں جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ و اصطلاحات کے بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً آج کل کے اردو لکھنے والے اگر مغربی سائنس پر کچھ لکھنا چاہیں تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور انگلش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہیں اور ان کو ایک ضروری تغیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل عربی سے زیادہ استفادہ کیا جا رہا ہے جس سے کسی قدر زبان اردو مورد الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے۔

بعض یورپین محققین کی رائیں جے بیمس صاحب مصنف "انڈین فلالوجی" حسب ذیل رائے دیتے ہیں: "میں اردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اس بڑی اور وسیع زبان کو سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں رائج ہے اردو نہ صرف ایک وسیع، فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہے بلکہ یہی صرف ایک صورت ہے کہ جس میں دریائے گنگ کے قریب کی رہنے والی قومیں اپنی زبان کی ترقی ایک صحیح طور پر دکھلا سکتی تھیں۔" دیکھو جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۵ متعلق سنہ ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۔

مشہور فرنچ مستشرق "گارسن ڈی ٹاسی" لکھتے ہیں اردو کی ہندوستان بھر میں وہی پوزیشن ہے۔ جو فرنچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ میں ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک میں بکثرت مستعمل ہے عدالتوں میں اور شہروں میں جاری ہے ارباب ادب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ موسیقی داں اپنے راگ راگنیاں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں۔ اور اہل یورپ سے گفتگو بھی اسی میں کی جاتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر یہی حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہے مثلاً برٹی، کے کسان، عام اس سے کہ پروانس یا ایلیس کے

ہوں اصلی فرنچ نہیں سمجھ سکتے۔ پس کیا یہ وجہ معقول ہو سکتی ہے کہ اردو عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے اٹھا دی جائے؟"

جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ مائٹ بی" تحریر کرتے ہیں "میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے کہ تمام سرکاری سکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کر دی جائے اور دیسی زبانیں بھی بشرط ضرورت رکھی جائیں۔ میں اس کو بالکل ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان کا ذریعہ کئے بغیر کام چلایا جا سکتا ہے اور چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہیئے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا اردو ہندوستان بھر کی زبان عام (لنگوا فرینکا) کہی جانے کی مستحق ہے کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس کو ادنیٰ و اعلےٰ اور یہاں کے انگریز بھی بولتے ہیں اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلا کسی تغیر کے یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں جذب کر لیتی ہے اور پھر وہ لفظ اسی کے ہو جاتے ہیں۔"

مسٹر ونسنٹ سمتھ مصنف "ہسٹری آف انڈیا" اپنی کتاب کے آخر باب میں لکھتے ہیں "زبان اردو جو ہماری زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہے۔ ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب، عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک اس میں ادا کئے جائیں۔"

اردو کی نام نہاد کم مائگی یہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اردو کوئی ایسا سرمایۂ ادب اپنے پاس نہیں رکھتی جس پر فی الحقیقت اس کو ناز ہو نہ اپنے ارتقاء ترقی کی کوئی خاص تاریخ رکھتی ہے یورپین محققین اس کی طرف کم متوجہ ہوئے اور ہندوستانی ان سے بھی کم۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی چیز قدر و قیمت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے اور کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح بیش بہا ادبی خزانوں سے معمور ہو خلاف عقل ہے۔ اس کی ادبی زندگی فارسی سے علیحدہ رہ کر بہت کم گزری ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بہت ہونہار زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ایک ایسے ادب سے مالا مال ہو جائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کر سکے گا اور اب بھی ہندوستان کی اور مروجہ زبانوں میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں ہے۔

اقسام ادب اردو ادب دو بڑی قسموں پر منقسم ہو سکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم ترجمے زیادہ تر زبان انگریزی فارسی عربی اور شاذونادر ہندی اور سنسکرت سے اور دیسی زبانوں میں بنگالی، مرہٹی اور گجراتی سے بھی کئے جاتے ہیں۔

تصانیف مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہیں۔ نظم اردو مختلف اقسام کی ہے اور نہایت ہی پُرلطف اور مزیدار ہے۔ اس میں پند و نصائح اخلاق حسن و عشق کے افسانے، مرثیے، حمد و نعت، بادشاہ وقت کی تعریف ہجو ظرافت، اور زمانہ حال کی نیچرل نظمیں مختلف مضامین پر سب کچھ موجود ہیں۔ مشہور شعرائے اردو ماضی و حال میر، سودا، درد، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، امیر، داغ، حالی، اقبال، حسرت و اکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں جن کے کلام کے سمجھنے کے لئے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسبت طبیعت کی ضرورت ہے۔ بالفعل نظم اردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے ایک جدید اسلوب سے تین حصوں میں کیا ہے اور ہر حصہ رسٹ، کا علیحدہ نام رکھا ہے یعنی (۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت (۳) مناظر قدرت یہ تینوں حصے یا سٹ بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مولف نے ارادہ کیا ہے کہ ان میں نظم اردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کیئے جائیں اور اس غرض سے اکثر شعرائے اردو قدیم و جدید کا بہترین کلام باعتبار مضمون منتخب کیا ہے۔ بہر طور یہ ایک اعلےٰ درجے کا مفید مجموعہ ہے اور کیا اچھا ہو کہ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے۔ مشہور نثاروں میں مرزا رجب علی بیگ سرور۔ سرسید۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا شبلی۔ مولانا آزاد۔ پروفیسر ذکاء اللہ مولانا حالی کے نام گنائے جا سکتے ہیں اور سرشار۔ شرر۔ مرزا رسوا۔ راشد الخیری اور پریم چند سے دنیائے افسانہ نویسی میں کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہوگا۔

تراجم تراجم کے ذیل میں بھی زبان اردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابیں نظم اور ڈراما کی اردو میں ترجمہ ہوگئی ہیں مثلاً ہومر کی ایلیاڈ۔ مہابھارت۔ راماین۔ شکنتلا۔ میگھ دوت وکرم اروسی رتو سنگھار۔ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ۔ ٹیگور کی گیتانجلی۔ چترانگدا۔ اسی طرح شیکسپیر کے اکثر ڈراموں سے اردو داں پبلک بذریعہ ترجمہ کے خوب واقف ہے۔ شیریڈن کے بعض ڈرامے اور ڈینٹی، گوئٹے لانگ فیلو۔ سودے، شیلی بائرن، ورڈسورتھ اور ٹینیسن کی بھی اکثر مشہور نظموں نے اردو کا جامہ پہن لیا ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں رینالڈس، اسکاٹ، میری کاریلی اور کانن ڈایل کی تصانیف وہ لوگ بہت پسند کرتے ہیں بنکم چندر چٹرجی کے قریب قریب سب ناول اور ٹیگور کے بھی بہت سے قصے اردو میں آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑے عرصہ سے اسٹیونسن رائیڈر ہیگرڈ، آسکر وائلڈ،

برنارڈشا - اور ایچ - جی ویلس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں - ناٹکوں میں مکالمے، کارلائل، سمائیلس اور لیک کی مشہور تصانیف ترجمہ ہو گئے ہیں فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون وارسطو کی اکثر کتابیں چانکیا کے اقوال سینیکا کے فلسفیانہ خیالات، برکلے کے مکالمات، اسی طرح بیکن ہیوم - کینٹ - مل - اسپنسر جیمیس اور سٹاوٹ کی بھی بعض تصانیف اردو میں موجود ہیں - تاریخ اور سوانحعمریوں میں پلوٹارک کی مشہور مشہور یونانیوں اور رومیوں کی سوانحعمریاں، رالین کی تاریخ یونان، بیری کی تاریخ یونان، ڈوزی کا "اسپین اہل اسلام کی حکومت میں" والیس کی تاریخ روس، اسکاٹ کی سوانحعمری نپولین، بوناپارٹ گرین کی تاریخ انگلستان، ونسنٹ سمتھ کی تاریخ ہندوستان قدیم الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، مالکم کی تاریخ ایران اور گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم اور اسی طرح اور بھی مشہور مشہور کتابیں اردو میں موجود ہیں - سیاسیات اور معاشیات میں حسب ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں - ارسطو کی پالیٹکس، مل کا رسالہ لبرٹی اور پولیٹیکل اکانمی وغیرہ بیل کے قوانین دولت موریل کا میکیاولی - لارڈ کرزن کا پرشیا - مزینی کا فرائض انسان - شوسٹر کا اختناق ایران، بلنٹ کا مستقبل اسلام - اسی طرح سیلی، ولسن، پالک، ہجوک، جیونس، مارشل اور مارلین کی بھی بعض بعض کتابیں سیاسیات کے علاوہ بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں مثلاً گیزو کی تاریخ تمدن - بکل کی تاریخ تمدن انگلستان - لیبان کی تمدن عرب اور تمدن ہند - لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ - ڈریپر کی تاریخ ارتقائے یورپ - دت کی تاریخ قدیم تمدن ہند فلسفۂ تعلیم میں بھی اردو اساتذۂ ذیل کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہے اسپنسر بین - فروبیل - اسٹالوڈزی - ہربرٹ - مانٹی سوری - سائنس میں ڈریپر کی معرکۂ مذہب وسائنس اور ڈارون - ہیکل - ہکسلی - لایل - گیکی - ٹنڈل - بوس - کیلون - میکسول - کروک - اور سر آلیور لاج کی جدید تحقیقاتیں اردو میں آچکی ہیں - قانون اور طب کا ذکر بیکار ہے اس وجہ سے کہ اس کی اکثر کتابیں بضرورت ترجمہ ہو گئی ہیں۔

مذہبی لٹریچر اہل عرب وفارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت وہندی کا ایک معتد بہ حصہ ترجمہ ہو گیا ہے - مذہبی کتابوں میں قرآن شریف - گیتا - پران - مہابھارت - رامائن کے ایک نہیں بلکہ متعدد ترجمے موجود ہیں - اسی طرح اکابر دین مثلاً پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم - حضرت عیسیٰ علیہ السلام سری کرشن - سری رام چندر - گوتم بدھ - گرونانک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی نیز مقتدایان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکماء وشعراء اور نامی مورخین کے بھی حالات موجود ہیں مثلاً جوگیوں میں بشسٹ متصوفین میں مولانا روم اور حافظ اخلاق فلسفہ

میں غزالی اور سعدی شعرا میں فردوسی حکما میں بو علی سینا۔ مورخین میں ابن خلکان، ابنِ خلدون اور فرشتہ وغیرہ۔

ادب اُردو کے سرچشمے بالفعل ایسے سرچشمے جن سے ادب اُردو کا ہرا بھرا باغ سیراب ہو رہا ہے حسب ذیل ہیں۔ (۱) عثمانیہ یونیورسٹی جس میں دارالترجمہ قائم ہے۔ (۲) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن (۳) دارالمصنفین اعظم گڑھ ان تینوں جماعتوں کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جا چکے ہیں اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور سوسائٹیاں ادب اُردو کی اشاعت و ترقی کے واسطے دلّی۔ لکھنؤ اور لاہور میں قائم ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی دلچسپیوں سے مطمئن ہو کر اپنے صوبہ میں ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کی ہے تاکہ اُردو ہندی ادب کو ایک نمایاں ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہو کر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے منضبط کئے ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

(۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے واسطے مقابلہ کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اُردو ہندی کتابوں کا ترجمہ اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرانا اور ان کو اپنی طرف سے چھپوانا اور شائع کرنا۔

(۳) اُردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیوں اور ادبی انجمنوں یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیلوشپ (اعزازی ممبری) کے واسطے منتخب کرنا۔

اکیڈمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایگزیکیوٹو کمیٹی داخل ہیں لیکن اصلی اختیارات فیلوؤں کے ہاتھ میں رہیں گے جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا۔ کونسل میں بالفعل ایک پریسیڈنٹ چھ اکس انیشیو ممبر اور تیس معمولی ممبر شامل ہیں (ان میں جنرل سیکرٹری داخل ہے) جن کو شروع ہی گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا۔ اور گورنمنٹ سے ابتدا ہی میں مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ ہی نے سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو اکیڈمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر تارا چند پی۔ ایچ۔ ڈی کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام سچ پوچھئے تو اس عہد کے گورنر صوبہ مشہور اسکالر اور ناقد ہز اکسیلنسی سر ولیم میرس کی خاص ادبی دلچسپی اور ہمدردی۔ اور اُن کے روشن خیال جوان ہمت اور موقع شناس وزیر تعلیم آنریبل

رائے راجیشور بلی صاحب کی انتھک کوششوں اور پیش بینیوں اور نیز منشی دیا نرائن صاحب نگم کی سعی بلیغ کا معقول نتیجہ ہے کہ یہ مبارک اسکیم انہیں حضرات کی محنت و جانفشانی اور حقیقی دلچسپی کی وجہ سے درجۂ تکمیل کو پہنچی اور انہیں کی آبیاری سے یہ تخم سرسبز ہوا۔ اکیڈمی اپنے وحید العصر خلیق و متواضع پریسیڈنٹ اور اپنے فاضل سیکریٹری اور نیز اپنے قابل ممبروں کی کوششوں اور گورنمنٹ صوبہ کی نظر عنایت سے ضرور ایک درخشاں مستقبل اور ایک بارونق مطمح نظر اپنے سامنے رکھتی ہے۔

اُردو کا رسم الخط سنا ہے کہ اورنگ آباد اور حیدر آباد دکن میں اردو کے رسم الخط کی درستی اور ترمیم کے واسطے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم ہوئی ہیں جنہوں نے اپنی تجاویز پبلک کے سامنے پیش بھی کیں مگر سنا جاتا ہے کہ یہ جدید رسم الخط نوآموزوں کے واسطے نہایت پیچیدہ مشکل اور پریشان کن ہے۔ اور اس سے غلط پڑھنے اور غلط لکھنے دونوں کا قوی احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اس قسم کے نقائص کے اظہار میں غلط بیانی یا غلط فہمی ہوئی ہو مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طریقۂ تحریر میں جو نقائص اور کمیاں ہیں اُن پر ماہرین فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی اور یقیناً اس قسم کی خرابیاں کبھی نہ کبھی ضرور رفع ہو جائیں گی۔

ضمیمۂ تاریخِ ادبِ اردو

بعد تیاری کتاب اصحاب ذیل کے حالات دستیاب ہوئے جو ضمیمہ کی صورت میں درج کئے جاتے ہیں۔

نظرؔ لکھنوی

نوبت رائے نظرؔ ایک معزز سکسینہ کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد زمانۂ نوابی میں لکھنؤ میں معزز و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نظرؔ لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں تھے۔ اردو فارسی اور انگریزی کی ضروری تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ہمہ تن شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے۔ جس سے کہ اس وقت فضائے لکھنؤ معمور ہو رہی تھی۔ ستمبر ۱۸۹۷ء[1] میں اپنا مشہور ادبی رسالہ "خدنگ نظر[1]" لکھنؤ سے جاری کیا۔ جو شروع میں تو صرف مجموعۂ غزلیات ہوتا تھا مگر بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے تلمذ تھا جن کی کوشش سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور انہیں مشاعروں کی غزلیں "خدنگ نظر" میں درج ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ تھوڑے عرصہ تک جاری رہ کر بند[2] ہو گیا۔

۱۹۰۴ء میں نظرؔ رسالہ زمانہ کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی خدمات نہایت قابلیت اور مستعدی سے انجام دیتے رہے جیسا کہ اس وقت کے رسالہ مذکور کے مضامین کی عمدگی سے

---

[1] سن اجراء ۱۸۹۶ء ہے (مرتب)

"خدنگ نظر" "پیام یار" کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم اور مشہور گلدستہ تھا۔ اس کی اشاعت آصفی پریس نواز گنج لکھنؤ سے ہوتی تھی اور حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں مرحوم کے نام نامی کے ساتھ معنون تھا۔ پہلے اس کے ٹائیٹل پر یہ شعر دیا جاتا تھا سہ مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ۔ بہلائیے دل کو سیر "خدنگ نظر" سے آپ کچھ عرصہ کے بعد یہ شعر دیا جانے لگا سہ نکلا ہے بن سنور کے خدنگ نظر "نظر"۔ یاں دل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو[2] غالباً ۱۹۰۰ء میں بند ہوا۔

[2] (مترجم۔ خدنگ نظر مئی ۱۹۰۰ء بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد سوم صفحہ ۶۸۵ (مرتب)

ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد کی طلبی پر الہ آباد گئے اور رسالہ ادیب کی اڈیٹری پر فائز ہوئے جو اُس وقت نیا نیا جاری ہوا تھا۔ اور اردو رسالوں میں یہ اوّل درجے کا اور موقر پرچہ سمجھا جاتا تھا۔ نظر نے اس نوزائیدہ بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور انہیں کی تربیت میں وہ پروان چڑھا اور اس کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ جو کسی اردو رسالے کو نہ اس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ نظر کا تعلق ادیب کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک رہا جس کے بعد اُن کو پھر کانپور آنا پڑا اور وہ "زمانہ" کے اسٹاف میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اب کی مرتبہ تقریباً دو سال تک کانپور میں رہے اور ہفتہ وار "آزاد" کی نگرانی بھی اب اُن سے متعلق ہو گئی ۱۹۱۲ء میں وہ لکھنؤ آگئے اور یہاں زبان اُردو کے مشہور محسن اور شاعر و شاعری کے دلدادہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کی وساطت سے رائے بہادر منشی پراگ نرائن بھارگو مالک نولکشور پریس و اودھ اخبار سے ملے اور منشی صاحب موصوف ہی کی نظر عنایت سے نظر کو اخبار تفریح کی ایڈیٹری اور تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور اودھ اخبار کی ایڈیٹری بھی مل گئی۔ اس میں انہوں نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے کام کیا کہ آخر صحت خراب ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ روحانی آلام کا بھی سامنا ہوا یعنی ان کا پیارا نواسہ جس سے کہ وہ بہت مانوس تھے چل بسا اور کچھ عرصہ بعد اس بچے کی ماں یعنی ان کی اکلوتی بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی جس سے کہ ان کا چراغ شادمانی گل ہو گیا اور ان جانفرسا حادثوں کی بدولت ان کو اپنا تعلق اودھ اخبار سے بھی قطع کرنا پڑا۔ انہیں حادثات اور مالی دشواریوں کی وجہ سے اُن کی زندگی کا آخری حصہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ آخر کار دمہ کے موذی مرض میں ایک عرصہ تک مبتلا رہ کر ۵۶ برس کی عمر میں ۱۰۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت کی اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ لکھنؤ کا گلشن شاعری اس بلبل خوش الحاں کے اُٹھ جانے سے سونا ہو گیا۔ تمام شعرائے لکھنؤ کو جن کو ان سے دوستی اور محبت کا پیوند تھا اس

واقعہ جانگداز سے دلی صدمہ ہوا اکثر نے تاریخیں کہیں جن میں مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے ؎

کلک محشر نے لکھا سال وفات		شاعر کامل نظر سے چھپ گیا ۱۹۲۳ء

نظر ایک فطری شاعر تھے اور یہی فطرتی میلان طبع اور کہنہ مشقی ان کی قدرت زبان اور کمال شاعری کا راز تھے۔ تلمذ بھی ان کو لکھنؤ کے ایک مشہور اور مستند استاد سے تھا رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں نظر نے اپنے ابتدائی شوق کا حال نیز یہ کہ ۱۸۸۴ء میں ان کو آغا مظہر سے شرف تلمذ کیونکر حاصل ہوا تھا نہایت دلکش طریقے سے قلمبند کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا مصائب و آلام کی گھنگھور گھٹاؤں نے ان کی آخر عمر کو تیرہ تار کر دیا تھا جس کا اثر حزن و یاس کی صورت میں ان کے کلام پر بھی چھا گیا تھا جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

نظر اب چل کے کرنا چاہیئے آباد مرقد کو	بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی
موت سے کیا ساز کر رکھا ہے اس نے اے نظر	مدتیں گزریں سبب کھلتا نہیں ایسی نہ تھی
زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات	اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی
مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے	وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے۔
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی	زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑتا ہے باقی	اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دنیا ہی جب نظر میں	پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے!
دنیا سے جارہے ہو کیا لے کے اے نظر تم	زاد سفر نہیں ہے رخت سفر نہیں ہے!
طول عمر سے مختصر غم کی کہانی ہو گئی	جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہو گئی
ختم دلچسپی تری اے دار فانی ہو گئی،	ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہو گئی
ہر قدم پہ ایک نالہ ہر قدم پہ ایک آہ	زندگی کیا ایک شرح سخت جانی ہو گئی
ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیل اشک	بند دوگز دل میں دریا کی روانی ہو گئی

مے کو دنیا آتش سیال کہتی ہے نظر
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

کچھ اندوہ و یاس ہی پر موقوف نہیں نظر کے کلام میں سلاستِ زبان، لطفِ بیان اعلیٰ تخیل غرض کہ جملہ محاسنِ شاعری علی الخصوص وہ سب چیزیں جو غزل گوئی کی جان ہیں پوری طرح موجود ہیں وہ غزل ہی خوب کہتے تھے اور اسی صنف میں وہ اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اور وہ لوگ ان کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے ان کے چند اشعار غزل جو رسالہ زمانہ اور دیگر رسالوں میں چھپ چکے ہیں منتخب کر کے بطور نمونہ یہاں دیے جاتے ہیں ۔

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے
اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے
حالتِ محفلِ عشرت ہے رقم سب اس میں
پرتوِ مہر کہا ذرّۂ ناچیز کھپا
تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک

ذرّہ ذرّہ میں ترا جلوہ مستانہ ہے
ساری دنیا نگہِ یاس میں ویرانہ ہے
ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے
کیوں یہ دل حسرتیِ جلوہ جانانہ ہے
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے اک افسانہ ہے

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی
دیکھ لو سیر دم نکلنے کی
دلِ سوزاں کو شمع کیا کہیے

اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
یہ ہوا اچھی نہیں ہے چلنے کی
اس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

مسدس بھی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ وہ مسدس جو بطور مرثیہ اپنے پیارے نواسے کی موت پر کہا تھا نہایت درد انگیز و موثر ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہوا تمام امیدوں کا خاتمہ تم پر !!
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہے خبر
کسی سے اب نہ توقع نہ ہے کسی پہ نظر
مرے پہ دیکھیے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے
پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

سمجھو کہ اس اجڑے مکان کا تھا یہ چراغ نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ	بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اسی طرح ان کا وہ مسدس بھی جو جنوبی افریقہ کی سیتہ گرہ کے موقع پر کہا تھا دل ہلادینے والا ہے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی طبع آزمائی شروع کی تھی مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ جب کبھی اس رنگ میں کہنا چاہتے تھے وہ پرانا رنگ پھوٹ نکلتا تھا اور وہ کلام بھی غزل ہی معلوم ہونے لگتا تھا۔

علاوہ شعر و شاعری کے وہ فن تنقید اور نثر نگاری میں بھی بہت ممتاز تھے عرصہ تک رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے کتابوں پر ریویو لکھتے رہے معرکہ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق چھڑ گیا تھا انہوں نے نمایاں حصہ لیا اور ان کی رائے ہمیشہ بہت جچی تلی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی تھی جس سے ان کی ذاتی قابلیت اور شاعرانہ مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اس بات پر نظر رکھتے ہوئے کہ وہ جدید طریق تنقید سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھے ان کے ریویو اور ادبی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نظر ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو اور نقاد تھے ہرچند کہ ان کا کلام کسی نئے پیام کا حامل نہ تھا ان کا کلام سلاست و روانی و پاکیزگی میں درگاہ سہائے سرور کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔

بالفعل حشمی بشیشر پرشاد متورہ نظر کے شاگردوں میں لکھنؤ میں موجود ہیں۔ افسوس کہ نظر کا کلام علاوہ اس کے جو رسالوں اور گلدستوں میں شائع ہوا جمع نہ ہو سکا۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی باہمت شخص ان کا پورا کلام یکجا کر کے اسکو شائع کر دے تو اس سے ادب اردو میں ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہو جائے گا۔

وفات نوبت رائے نظر ۱۹۲۳ء (مرتب)

چکبست لکھنوی

تحریک جدید کے مشہور لیڈر، روش تازہ کے صحیح راہبر، زمانہ حال کی شاعری
کے رکن رکین روش قدیم و جدید کے جامع پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد
میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اوائل عمر ہی میں اپنے وطن اصلی لکھنؤ میں آگئے جہاں
ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری اور
۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی اور تھوڑے
ہی عرصہ میں اپنی قابلیت ایمانداری، مستعدی اور سب سے زیادہ اپنی خوش اخلاقی
سے وکلاء کی صف اول میں آگئے اور ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ
ہو گئیں مگر افسوس ہے کہ عنفوان شباب میں ایک عجیب حسرتناک طریقے سے انتقال
کیا یعنی ۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو جب کہ وہ کسی مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے ہوئے
تھے واپسی کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ایک شدید دورہ فالج کا ہوا جس سے کہ بے حس و
حرکت ہو گئے اور زبان بند ہو گئی اور قریب سات بجے شام کے اسٹیشن ہی پر روح
مفارقت کر گئی جب یہ وحشتناک خبر ان کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج
نرائن چکبست کو پہنچی تو وہ فوراً گئے اور لاش موٹر پر لکھنؤ لے آئے اس سانحہ عظیم سے
لکھنؤ بھر کو جو صدمہ ہوا لائق بیان نہیں۔ عدالتیں بند کر دی گئیں، سر لوئی اسٹوارٹ
چیف جج اور مسٹر کنیڈل ڈسٹرکٹ لکھنؤ نے اپنے اپنے اجلاس پر اس واقعہ
کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کے قلب و دماغ کے صفات عالیہ کی بہت تعریف
کی اور ان کی اس ناگہانی موت پر بے حد رنج و قلق کا اظہار کیا۔ دنیائے ادب بھی
اظہار رنج و ملال میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے جن میں
مختلف مذاہب کے لوگوں نے موثر اور دردناک تقریریں کیں۔ بڑے بڑے شعراء
اور ادباء نے درد انگیز اشعار اور مضامین سپرد قلم کئے تاریخیں کہیں جن میں سے
بعض چیدہ چیدہ اشعار جو اس موقعے پر کہے گئے تھے نذر ناظرین کئے جاتے ہیں
صفی صاحب فرماتے ہیں ؎

شمع بزم شعرا برج نرائن چکبست	بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس
داغ فرقت سے تمہارے ادب اردو پر	دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس
شور ماتم ہے بپا حلقۂ احباب میں آج	شان اس بزم میں ہے بزم عزا کی افسوس
ہائے ملتا ہی دل اور رہ بے تابی دل	جب زباں بند ہوا اک نکتہ سرا کی افسوس

عزیز لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شاعر نکتہ سرا برج نرائن چکبست	جس کو قدرت نے دیا ذوق سخن روز الست
خادم قوم صفا کیش مرنجان و مرنج	ساقی میکدہ نکتہ رسی جام بدست
سبق آموز ہے ہر نظم مرصع اس کی	صاف ترشے ہوئے ہیرے ہیں کہ لفظوں کی نشست

ان کے علاوہ محشر، محروم، اور سحر ہنگامی نے بھی موثر نظمیں لکھیں علی الخصوص آخر الذکر کا کہا ہوا مرثیہ نہایت موثر اور حسرت انگیز ہے مگر محشر صاحب نے کمال کیا کہ مرحوم ہی کے ایک مشہور مصرعہ سے لفظ عزا (۷۸) کا تعمیہ کر کے ایک نہایت عمدہ تاریخ نکالی ؎

ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہ عزا	موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ھ

چکبست کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نو برس کی عمر میں غزل کہی تھی۔ طالب علمانہ زندگی میں بھی وہ اس شغل سے بے پرواہ نہیں رہے بلکہ کالج کے مشاعروں میں شریک ہو کر خراج تحسین کے علاوہ انعام اور تمغے بھی حاصل کرتے رہے مگر شاعری کو دون مرتبہ سمجھ کر یا شہرت طلبی سے عار کرتے ہوئے کبھی انہوں نے کوئی تخلص نہیں اختیار کیا۔ ضرورت کے موقع پر صرف لفظ چکبست پر جو اُن کا خاندانی نام تھا اکتفا کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا	میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں معمولی غزل کہتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد قومی، سیاسی، سوشیل اور نیچرل نظموں پر آ رہے جن میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔ مسدس کا شوق ان کو بہت تھا۔

تخلص کے ساتھ انہوں نے فرسودہ طریقہ استادی و شاگردی کو بھی خیرباد کہا تھا یعنی کسی کے شاگرد نہیں تھے اور صحیح معنوں میں "تلمیذ الرحمان" کہے جانے کے مستحق تھے اساتذہ قدیم مثلاً میر و غالب انیس و آتش وغیرہ کے سرچشموں سے سیراب ہوتے اور انہیں بزرگوں کے کلام کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پیرو تھے۔

چکبست کا مطمع نظر بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش ہو اور پر تاثیر ہو۔ ۔ ۔ ۔ برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے ترکیب کا الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گزر جائیں" بندش الفاظ پر بہت زور دیتے تھے گویا یہ شعر آتش کا ان کے پیش نظر تھا ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں	شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بندش الفاظ کے ساتھ مناسب ہندی الفاظ بھی موقع موقع سے خوب صرف کرتے تھے اور جدید رنگ کے مضامین اور خیالات کو صاف سادہ اور سلیس طرز میں کہنے پر قدرت رکھتے تھے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں	عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبست کا مطبوعہ منظوم کلام بہت مختصر ہے اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ آخر میں اپنے پیشہ کے کام مصروف رہنے کی وجہ شعر کہنے کا وقت بہت کم نکال سکتے تھے ان کا مجموعہ نظم انڈین پریس الہ آباد میں چھپ گیا ہے۔ جس پر ادب اردو کے دلدادہ محسن سر تیج بہادر

سپرد نے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے۔ ان کی تنقیدات اور دیگر مضامین بھی اسی پریس سے شائع ہو گئے ہیں۔ چکبست نے خود ایک ماہوار رسالہ "صبح امید" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں جاری کیا تھا جو سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کا پرچہ تھا اس میں وہ اکثر لکھتے رہتے تھے مگر ان کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ کے ہوتے تھے ہمارے خیال میں یہ مضامین کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔

بحیثیت غزل گو | بحیثیت غزل گو چکبست پرانے ڈھنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے تھے انہوں نے صنف غزل میں ایک خاص جدت اور ترقی کی اور قدیم طرز سے علیحدہ رہے پرانے فرسودہ تشبیہات و استعارات اور لوازمات غزل گوئی کو یک قلم خارج کر دیا اور شیرینی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا اور یہی چیزیں ان کے کلام کے مابہ الامتیاز جوہر ہیں ان کے مجموعہ نظم میں بمشکل پچاس غزلیں نکلیں گی اور ان میں بھی اکثر ناتمام معلوم ہوتی ہیں مگر انہیں میں انہوں نے اپنی سحر کاری اور جادو نگاری کا پورا کرشمہ دکھا دیا ہے۔ کہیں کہیں فلسفہ اور اخلاق اور نصیحت آمیز شعر بھی خوب کہے ہیں ان کے اکثر اشعار دار الضرب کے سکۂ شاہی ہیں اور بقاء دوام کے مستحق ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

دل احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا

وہ سودائے زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے مر جانا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن میں

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

ہمارے اور واعظوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اس کو خوف خدا کہیں گے

طویل نظمیں ان کی طویل نظموں میں علاوہ مذکورہ بالا خوبیوں کے مقامی رنگ اور ہندی الفاظ کا بھی بہت خوشگوار اضافہ ہے۔ جس سے کلام کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے ان نظموں کا ملکی رنگ قدیم ملکی روایات رسم و رواج کا شمول نئے نئے تشبیہات و استعارات اعلیٰ آئڈیل ان کی نظموں کو ادبی جواہر ریزے بنا دیتے ہیں۔ چکبست کی اس قسم کی نظمیں پانچ قسموں پر تقسیم ہو سکتی ہیں (۱) مراثی جو ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی وفات پر کہے گئے (۲) قومی و سیاسی نظمیں جو ملک کے اہم سیاسی مضامین پر لکھی گئیں۔ جن سے اعلیٰ تخیل کے ساتھ شاعر کے سیاسی آئڈیل کا بھی پتہ چلتا ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ درحقیقت تمام تعلیم یافتہ نوجوانان ہند کی بلند خیالیوں کی حقیقی ترجمان ہیں (۳) سوشل نظمیں (۴) مذہبی نظمیں (۵) نیچرل نظمیں

مراثی اس صنف میں وہ پُر زور اور درد انگیز نظمیں شامل ہیں جو ملک کے جاں نثار لیڈروں اور آزادی کے علمبرداروں کی وفات پر شاعر کے قلم سے نکلیں یہ عموماً مسدس کی شکل میں ہیں اور جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوتی ہیں بلکہ فی الحقیقت یہ وہ آزادی اور حریت کے خیالات ہیں جو کسی علمبردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے اور بہ زبان قلم سے آنسو کی طرح ٹپک پڑے۔ چند بند یہاں بطور نمونہ دیے جاتے ہیں گوپال کرشن گوکھلے کے متعلق ؎

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو

پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھر تلک کے متعلق ؎

اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث

جاں نثارِ ازلی شیر دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پرنا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

پنڈت بشن نرائن در کی دائمی مفارقت پر سے

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر
دو نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر

جن پہ صدقے ہیں زبان اور قلم کے جوہر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانہ کی خبر

ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیو لتے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

قومی نظمیں | ان میں سب وہی انداز ہیں اور وہی سچے جذبات جلوہ گر ہیں جو مرثیوں میں نمایاں ہیں وہی شستگی الفاظ وہی اعلیٰ اور اچھوتے خیالات

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
تیری جبیں سے طور حسن ازل عیاں ہے

دریا تے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
اللہ ری زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

(از خاک ہند)

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ادا ہے یہی

تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پاتے ہوئے
فنبض قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا

رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

(وطن کا راگ)

تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے
ہم نے بھولے ہوئے درتہ کا نشاں پایا ہے

آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

حکم حاکم کا ہے فریاد تو باقی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے

دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنہوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

مسز بسنٹ کی نظر بندی پر

جب ۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی حالت پر غور کرنے اور اسکو سدھارنے کے لئے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست نے ایک پُرتاثیر نظم "فریاد قوم" کے نام سے لکھی جس میں مہاتما جی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؂

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا

ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

۱۹۱۸ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ نفاق و نشقاق پیدا ہوا تھا جس سے بعض لیڈر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو انہوں نے "نالۂ درد" کے نام سے ایک نظم تیار کی اسی طرح لکھنؤ کے اجلاس کانگریس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں ایک زوردار نظم پڑھی تھی

جس کا ایک شعر اس وقت یاد آیا ؎

برطانیہ کا سایہ سر پہ قبول ہوگا	ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

جنگ عظیم میں شرکت کے لئے جب ہندوستانی سپاہی یہاں سے روانہ ہونے لگے تو وہ ان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا	طنطنۂ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا	ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

سوشیل نظمیں | سوشل معاملات کی اصلاح میں بھی مثل سیاسی معاملات کے ان کا مسلک میانہ روی اور اعتدال پسندی تھا۔ ان کی نظم "پھول مالا" جو ہندوستانی عورتوں کے واسطے ہے عورتوں کو بہت زیادہ آزادی اور تفریح (انگریزیت) کی خرابیوں سے متنبہ کرتی ہے کہتے ہیں ؎

روشِ خام پہ مردوں کے نہ جانا ہرگز	داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم	تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں	ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے	خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا	پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا	اس کو تفریح کا ہرگز نہ بنانا ہرگز

وہ ازدواج بیوہ کے بھی موید تھے اور ۱۹۱۷ء میں ایک نظم "برق اصلاح" کے نام سے اپنی خاص جماعت (کشمیریوں) کے واسطے اسی مبحث پر لکھی تھی۔

مذہبی نظمیں | اس صنعت میں انہوں نے بڑا زورِ قلم دکھایا ہے۔ رامائن کا وہ منظر جہاں

سری رامچندر جی بن باس سے پیشتر اپنی ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں نہایت موثر اور درد انگیز الفاظ میں دکھایا ہے۔

"کشل کنھیا" سری کرشن جی کی پیدائش کے متعلق چھوٹی سی ایک نہایت دلکش اور مقدس نظم ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ پر زور اور موثر نظم گنگا سے ہے جسکے دو بند یہاں دئے جاتے ہیں ؎

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار	بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار

ایک اک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا !
پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں	چشمہ فیض خدا مرد خدا کہتے ہیں ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نیچرل نظمیں | ان کی تعداد گو کم ہے مگر جس قدر ہیں سب اعلیٰ تخئیل اور حسن بندش سے لبریز ہیں پرانی تشبیہیں اور تمثیلیں ان میں مطلق نہیں، "پھول" "کشمیر" "جلوہ صبح" "سیر دیرہ دون" اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں آخر الذکر لطافت و عمدگی میں سب پہ فوقیت رکھتی ہے۔

رباعیات | چند رباعیات بھی کہی ہیں حسب ذیل رباعی اپنے حسب حال ہے:۔

بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو کس واسطے جستجو کروں شہرت کی	لوں داد سخن نہیں یہ عادت مجھ کو اک دن خود ڈھونڈھ لے گی شہرت مجھکو

چکبست کی زبان | ان کی زبان نہایت صاف شستہ اور شیریں ہے الفاظ نہایت مناسب روزمرہ اور زور دار استعمال کرتے ہیں کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہے مگر بہترین قسم اور اعلیٰ درجہ کا ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ مناسب ہندی الفاظ کلام میں ملا کر کلام کی شیرینی اور اثر کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

چکبست بحیثیت نقاد | بسبب اعلیٰ انگریزی دانی کے چکبست مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی تنقیدوں سے بخوبی آگاہ تھے اسی وجہ سے ان کی رائیں ادبی معاملات میں بہت جچی تلی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تھیں کبھی کسی کی تعریف یا تنقیص آنکھیں بند کر کے یا مبالغہ کے ساتھ نہیں کرتے تھے ذاتی حملوں سے ہمیشہ بچنے اور اشتعال طبع پر بھی اعتدال اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ بیجا مناظرہ اور تو تو میں میں سے ہمیشہ گریز کرتے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

الجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں   وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

ان کے مضامین داغ اور سرشار اور اردو شاعری پر نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور بڑی واقفیت اور معلومات کا پتہ دیتے ہیں وہ مشہور مناظرہ جو معرکہ چکبست و شرر کے نام سے مشہور ہے ان کی اعتدال پسندی متانت اور فنی قابلیت کا شاہد عادل ہے اور اس معاملہ میں ان کی تعریف اکثر مشہور اہل فن و اہل قلم نے کی ہے جو انتخابات غالب و آتش وغیرہ کے کلام کے عطر سخن کے نام سے رسالہ صبح امید میں چھپا کرتے تھے وہ ان کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کا بین ثبوت ہیں۔

چکبست بحیثیت نثار | نثر میں بھی مثل نظم کے ان کا پایہ بہت بلند تھا علاوہ صبح امید کے وہ اکثر موقر رسالوں میں مثلاً کشمیری درپن خدنگ نظر، زمانہ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے ان کی عبارت نہایت متین معنی خیز زوردار اور روشن ہوتی ہے۔ منشی سجاد حسین سابق اڈیٹر اودھ پنچ ستم ظریف (مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی) نواب سید محمد آزاد جوالا پرشاد برق بشن ناتھ در، دیا شنکر کول ترببھون ناتھ ہجر وغیرہ پر جو مختصر مضامین انہوں نے لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

رامائن کے سین سے چند بند بطور نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن سے چکبست

کی قدرت زبان اور چستی بندش کا حال بخوبی معلوم ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہوگا جیسا کہ حالات مصنف میں جو شروع میں کتاب صبح وطن میں دیے ہوئے ہیں لکھا ہے کہ "وہ انیس کے کلام کے شیدا تھے"۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام	راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام ! دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال	خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

یہ عجیب بات ہے کہ غالب اور انیس کا اثر زمانہ حال کی شاعری پر اس درجہ چھایا ہوا ہے کہ اس زمانے کے اکثر شعراء جب کسی چیز کو موثر اور درد انگیز بنانا چاہتے ہیں تو یہی صنعت اختیار کرتے ہیں اسی وجہ سے چکبست کی تقریباً دو ثلث نظمیں جو مجموعہ صبح وطن میں چھپی ہیں اسی مسدس کی صورت میں ہیں مگر انہوں نے بعض نظموں میں (مثلاً مرقع عبرت جو کسی قومی انجمن کے سالانہ جلسے کے واسطے لکھی گئی تھی) مسدس حالی کے تتبع اور اسی رنگ میں قوم کی حالت، نوجوانوں کی حالت مذہب دولت آزادی واصلاح وغیرہ کے عنوان آٹھ آٹھ دس دس بند کہے ہیں چنانچہ نوجوانوں کی حالت کے متعلق کہتے ہیں ؎

موجود ہے جن بازو دل میں زور جوانی پیدا ہے مے غفلت سے سروں میں یہ گرانی	طوفان سے انہیں کشتی قومی ہے بچانی آرام پسندی میں پہ رکھتے نہیں ثانی

پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

عبرت نہیں دیتا انہیں نیرنگ زمانہ
تعلیم کہاں اور کہاں صحبت دانا
عمر اُن کی فقط لہو و لعب کا ہے فسانہ
پس پیش نظر رہتا ہے آئینہ و شانہ

گر رُخ پہ گُجے موئے پریشان پہ نظر ہے
اک شغل یہی ان کے لئے شام و سحر ہے

ہمت نہیں دل پر جوشش پہ نازاں!
بد شکل ہوں پر چشم و لب و گوش پہ نازاں
بے ہوش و خرد ہیں خرد و ہوش پہ نازاں
کم ظرف کوئی اپنے تن و توش پہ نازاں

نیرنگیِ افلاک کا ڈر ان کو نہیں ہے
فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے

سودائے محبت میں نہیں ان کے ہے خامی
عرفان کی خبر لاتی ہو جو طبع گرامی!
خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے ہیں حامی
ہے نفس کے منظور حقیقت میں غلامی

مذہب کے متعلق ـــ

کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکر کہ دمہ ہے
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہے تو یہ ہے

عالم کے دکھانے کے لئے خاک نشیں ہیں
دنیا کی ترقی پہ سدا چیں بجبیں ہیں!
دعویٰ ہے کہ ہم مالک فردوس بریں ہیں
گویا کہ یہی راز الٰہی کے امیں ہیں

جو اور ہیں وہ معرفت حق سے جدا ہیں
بس ایک یہی بندہ مقبول خدا ہیں

مذمتِ شراب کے متعلق جو "آبِ انگور" کے نام سے لکھی گئی۔

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اس کا
خمار مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
وداع ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا

لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

خیال بادہ کشی دل میں گر ہویدا ہو
زبان مزے پہ جو آب طرب کے شیدا ہو
تمام قلب سیہ صورت سویدا ہو
تو سوز آتش پنہاں جگر میں پیدا ہو

زبان کے واسطے گو رشک انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لئے آب آتشیں ہے یہ

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال زمانہ حال کے فلسفی شعراء میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اُن کی شہرت حدود ہندوستان سے نکل کر بلادِ اسلام افغانستان و ایران بلکہ یورپ اور امریکہ تک پہونچی ہے وہ زمانہ موجودہ میں ایک زبردست اور نمایاں ہستی ہیں اور اُن کا نام اور کلام شعرائے حال کی صفِ اوّلین میں بھی سب سے آگے ہے۔ سالِ ولادت ۱۸۷۵ء[1] اور مقام ولادت سیالکوٹ ملک پنجاب ہے۔ مگر بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بُلبُل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور
کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے — اس باغِ جانفزا کا یہ بُلبُل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

تعلیم | ابتدائے عمر میں ایک مکتب میں پڑھا پھر تھوڑے عرصہ کے بعد جب انگریزی کا شوق ہوا تو سیالکوٹ کے ایک اسکول میں داخل ہوئے جہاں اپنے ساتھ والوں میں بہت ممتاز تھے اور برابر انعام اور اسکالرشپ پاتے رہے۔ میٹریکولیشن کا امتحان[2] پاس کر کے اسکاٹش مشن کالج سیالکوٹ میں نام لکھایا جہاں عربی و فارسی کے مشہور پروفیسر اور علوم مشرقیہ کے باکمال استاد سید میر حسن صاحب کے زیرِ تعلیم و نگرانی رہے اور انہیں بزرگ کی بدولت شعر و شاعری و ادبیات کا ذوق اُن میں پیدا ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان[3] اول درجے میں پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور کے درجہ بی۔اے میں داخل ہوئے اور فلاسفی منجملہ مضامین مختار کے لی۔ یہیں سے نہایت نیکنامی اور عزت کے ساتھ بی۔اے کی ڈگری لی جس میں زبان عربی اور انگریزی میں اسپیشل پروفیشنسی (امتیاز خصوصی) حاصل کیا۔ اس کے بعد جب ایم۔اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی بھر میں اول آئے[4]

مسٹر آرنلڈ سے تلمذ | لاہور میں علی گڈھ کالج کے مشہور ہر دلعزیز پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فخرِ تلمذ حاصل ہوا جس سے اقبال کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس کا اثر جانبین پر بہت گہرا اور دیرپا تھا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف انگلستان جانے لگے تو اقبال نے ایک نہایت مؤثر نظم "نالۂ فراق" آرنلڈ کی یاد میں اس

---

[1] صحیح تاریخ ولادت ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ / ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (روزگار فقیر)

[2] ۱۸۹۳ء

[3] ۱۸۹۵ء (مرتب)

[4] ۱۸۹۹ء۔ اقبال نے فلسفہ کا یہ امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا تھا واحد کامیاب طالب علم کی حیثیت سے اول قرار دیئے گئے۔ (کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ) (مرتب)

موقع پر لکھی تھی۔ اب لاہور ہی میں انھوں نے وطن اختیار کرلیا اور بعد فراغت تعلیم پہلے اورنٹیل کالج میں تاریخ و فلسفہ و معاشیات کے پروفیسر پھر گورنمنٹ کالج میں انگلش اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے

قیام انگلستان ستمبر ۱۹۰۵ء میں بغرض تعلیم انگلستان روانہ ہوئے جس کے تمام مصارف کے کفیل اُن کے بھائی تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوکر ڈاکٹر میک ٹیگرٹ کے زیر تعلیم مغربی فلسفہ[1] پڑھنا شروع کیا اور کتب بینی بکثرت کی اور یہیں انگلستان کے مشہور مستشرقین پروفیسر براون، نکلسن اور سارلی سے استفادہ کا موقع ملا۔ ایتھکس (اخلاقیات) میں ڈگری حاصل کرکے جرمنی چلے گئے اور میونک میں کچھ عرصہ تک قیام کرکے اپنا تھیسس (مضمون) متعلق بہ فلسفہ ایران تیار کیا میونک ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اُن کو ملی اور مضمون مذکور انگلستان میں میٹافزکس آف پرشیا (فلسفہ ایران) کے نام سے شائع اور اُن کے قدیم دوست مسٹر آرنلڈ (جو سر ٹامس آرنلڈ ہیں) کے نام سے معنون ہوا۔ جرمنی سے انگلستان واپس آکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ جب مسٹر آرنلڈ جو لندن یونیورسٹی کے عربی پروفیسر مقرر ہو گئے تھے رخصت پر گئے تو ڈاکٹر اقبال ہی نے کچھ عرصہ تک اُن کی قائم مقامی کی تھی۔ بعد واپسی انگلستان لاہور میں اُن کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ اور یہیں پر انھوں نے اپنی پریکٹس شروع کی اور باوقات فرصت شعر و شاعری کے مشغلے میں بھی مصروف رہے۔ اُن کی قابلیت اور شہرت کے سبب سے ایک زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ان کو یقیناً ملے گا۔ سنہ ۱۹۲۲ء درجہ نائٹ ہڈ یعنی سر کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے۔

اقبال ایک وسیع النظر شاعر ہیں انھوں نے فلسفہ مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہ علاوہ ایران کے فلسفہ کے ہندوستان کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف ہیں اور زبان و ادب فارسی میں اُن کا تبحر اُن کے فارسی کلام سے بخوبی ظاہر ہے

---

[1] یہ مختصر نظم مسدس کی صورت میں ۵ بند کی ہے۔ پہلا بند یہ ہے ؎

جا لبا مغرب میں آ غرا ہے مکاں تیرا کہیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سر زمیں
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں
تا ز آغوش وداعش داغ حسرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است

تصانیف| تصانیف حسب ذیل ہیں ۔

(۱) علم الاقتصادیات پر ایک رسالہ جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا فن میں اردو میں پہلی تصنیف ہے ۔

(۲) فلسفۂ ایران اس کا ذکر اوپر ہوا ۔

(۳) اسرار خودی مثنوی فارسی جس میں فلسفۂ خودی کی بحث ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے مع دیباچہ اور نوٹوں کے شائع کیا ہے اور یورپ و امریکہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

(۴) رموز بیخودی یہ بھی مثل نمبر ۳ کے فارسی میں فلسفیانہ مثنوی ہے جس کی خاص غرض مسلمانوں میں روح حیات پیدا کرنا ہے

(۵) پیام مشرق بجواب جرمن شاعر گیٹے کے سلام مغرب" کے یہ بھی فارسی میں ہے ۔ اور بہت مقبول ہے ۔

(۶) بانگ درا ۔ مجموعہ نظم اردو مطبوعہ ۱۹۲۴ء اسی طرح کا ایک دوسرا مجموعہ "کلیات اقبال کے" نام سے مولوی محمد عبدالرزاق نے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ حیدرآباد سے شائع کیا ہے ۔ اقبال کا فارسی کلام ہماری کتاب کے مبحث سے خارج ہے لہذا اس پر خصوصاً کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی البتہ ان کے کلام اردو پر کی جائے گی ۔

اقبال کی شاعری| اقبال کو شعر کا ذوق ابتداء عمر ہی سے تھا ۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا جب وہ سیالکوٹ اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی سے فکر سخن کرنے لگے تھے لاہور کے قیام میں اس شوق نے اور بھی ترقی کی اور آخر ایک مشاعرہ میں انہوں نے اپنی ایک غزل پڑھی جس میں اتفاقاً اردو کے مشاق شاعر اور مشہور زباں داں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے جنہوں نے اس شعر کی خاص طور پر بڑی تعریف کی ہے

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اسی عرصہ میں اقبال کو ارشد سے تلمذ بھی ہو گیا مگر کچھ دنوں بعد وہ داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوتے جیسا کہ خود کہتے ہیں ہے

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پہ نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں پر

مگر افسوس ہے کہ یہ سلسلۂ تلمذ کا بہت دیر تک قائم نہ رہا۔ شروع میں اقبال اپنا کلام صرف مجمع احباب اور مخصوص شاعروں تک محدود رکھتے تھے۔ پبلک میں ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ ان کی پُرجوش اور دلکش نظم "نالۂ یتیم" انجمن حمایت الاسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء کے عظیم الشان اجتماع میں پڑھ کر سنائی گئی۔ اور اس کے بعد ان کی دوسری نظم "ہمالہ" اسی انجمن کے کسی دوسرے سالانہ جلسے میں دوستوں کے اصرار سے پڑھی گئی۔ جو رسالہ مخزن لاہور کے سب سے پہلے پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تا رفتگی ولایت وہ برابر بہت شوق سے کہتے رہے اور ان کا کلام متعدد اردو پرچوں ادبی رسالوں اور کانفرنسوں کے اجلاسوں کی زینت سمجھا جاتا ہے اور نہایت اشتیاق اور عزت کے ہاتھوں سے لیا جاتا ہے اس زمانے میں انہوں نے بہت کچھ کہا اور بہت جلد کہنے کی مشق بہم پہنچائی۔ حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ اکثر پوری پوری نظمیں بغیر کاغذ دیکھے پڑھ سکتے تھے۔ وہ تقریباً ہر سال اپنی ایک نہ ایک نظم انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں سناتے تھے۔ جس سے ان کی شہرت دنیائے اردو میں پھیل گئی۔ تصویر درد، فریادِ امت، ہمارا دیس، نیا شوالہ، ترانہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں اسی موقع پر پڑھی گئیں اور اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ یہاں تک کہ اس سے بالکل تائب ہو جانا چاہتے تھے۔ مگر اپنے بعض مخصوص دوستوں مثلاً پروفیسر آرنلڈ اور خان بہادر شیخ عبدالقادر کے اصرار سے اس ارادے سے باز رہے اور زبان فارسی کو اپنے اظہار خیالات و جذبات کا ذریعہ قرار دیا۔ ہندوستان واپس آکر فارسی اردو دونوں میں کہنے لگے مگر اب زیادہ ان کا رجحان ملیت (یعنی اسلامزم) کی طرف ہے شکوہ، جواب شکوہ، اور اسی قسم کی پرجوش نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔

اقبال کی شاعری کے تین دور | اقبال کی شاعری کے تین دور صاف طور پر نظر آتے ہیں۔[1] پہلا

---

[1] اقبال کی شاعری کے یہ تین دور غالباً ان کے مطبوعہ کلام اردو (بانگ درا) کے تین حصوں میں بنی ہیں۔ ان حصوں کی تقسیم اس طرح پر ہے۔ حصہ اول ۱۹۰۵ء تک حصہ دوم ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ء تک حصہ سوم ۱۹۰۸ء سے۔ ۱۲۔

دورِ ۱۸۹۹ اور سے ۱۹۰۵ء تک کا یعنی جب تک کہ وہ ولایت نہیں روانہ ہوتے تھے یہ دور ان کی تیاری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اس زمانے کے کلام میں جو زیادہ تر غزلوں کی صورت میں ہے ان کی طباعی کی جھلک اور ان کی سحر نگاری کی ابتدا نظر آتی ہے مگر بسبب ابتداءِ مشق کے الفاظ و بندش میں کسی قدر بھونڈا پن ہے اور وہ موسیقیت و مصوری الفاظ ابھی درجہ کمال کو نہیں پہنچی مگر اس کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے اقبال اس دور میں ایک ملّی شاعر نہیں۔ بلکہ ایک ملکی شاعر نظر آتے تھے یعنی وہ تمام ہندوستان اور تمام مختلف المذاہب اور مختلف الخیال ہندوستانیوں کے شاعر ہیں ان کی نظمیں ہمالہ ترانہ ہندی ہندوستانی بچوں کا قومی گیت نیا شوالہ وغیرہ اسی زمانے کی تصنیف ہیں جنہوں نے اقبال کو تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں عزت کی جگہ دی اور ان کی شہرت کو تمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا ان کے قیام یورپ سے تعلق رکھتا ہے اس زمانہ میں ان کی تصنیف کی تعداد بہت ہی کم ہے اور تین چیزیں اس دور کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک یہ کہ اقبال کو اس عرصہ میں فارسی کا بہت شوق ہو گیا اور اسی زبان کو انہوں نے اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک سخت ملی شاعر ہو گئے اور تمام ان کے خیالات اسی ایک مرکز پر جمع ہو گئے تیسرے یہ کہ اس زمانے کی ان کی نظمیں گو کہ عمق خیال کے اعتبار سے بڑھ گئیں مگر فلسفیت ان پر غالب آگئی جو اقبال کے فلسفہ مشرق و مغرب پڑھنے کا نتیجہ تھا ترانہ ملی وغیرہ اسی انداز اور اسی دور کی نظمیں ہیں۔

تیسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ اقبال ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آتے اس میں ان کی مشق شاعری درجہ کمال کو پہنچ گئی اس میں ان کا کلام پر زور اور شیریں الفاظ کا ایک خزانہ ہے مگر یہ الفاظ زیادہ تر فارسی ہیں ملیت کا عنصر غالب ہے مگر وطنیت کا جذبہ کم ہے اسی سبب سے وطن کی زبان اردو پیش پیش نہیں ہے یعنی اسی دور میں اس کو وہ مرتبہ نہیں حاصل ہے جو دور اول میں تھا اور جس کی وہ اب بھی یقیناً مستحق ہے فارسیت کا غلبہ ان کے فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب اور اساتذہ عجم کے کلام کی تضمین سے ظاہر ہے تمام عشاق اُردو اس دن کے منتظر ہیں کہ جب اقبال کی شاعری مثل سابق کے ایک وطنی اور خالص اردو شاعری کی حیثیت سے پھر جلوہ نما ہو گی۔

اقبال کی اردو غزلیں اور نظمیں | مثل دیگر شعرائے اردو کے اقبال کی شاعری کا آغاز بھی تغزل سے ہوا جیسا کہ اوپر لکھا گیا پہلے وہ ارشد گورگانی کے شاگرد ہوتے داغ کا ذکر انہوں نے نہایت محبت اور رشک گزاری کے ساتھ اس مرثیہ میں کیا ہے جو ان کی وفات پر لکھا تھا نیز اکثر قطعوں میں بھی ان کی طرف اشارہ رہا ہے مگر یہ سلسلہ تلمذ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں کوئی غیر معمولی اور خاص بات نہیں پائی جاتی مگر آئندہ ترقیوں کا پتہ ضرور چلتا ہے کہیں کہیں بندش بھونڈی مگر تخیل اعلیٰ ہے جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا اسی قدم کلام میں پختگی کے ساتھ حسن بندش اور نشست الفاظ کی خوب صورتی بھی ترقی کرتی گئی اور اسقام کم ہوتے گئے غزلوں کی تعداد گو کہ صرف ۲۷ ہے مگر متانت کلام بلندی خیال اور فلسفیت میں وہ مرزا غالب کی غزلوں سے ٹکر کھاتی ہیں اسی وجہ سے اگر اقبال جانشین غالب کے معزز لقب سے یاد کئے جائیں تو کچھ بیجا بات نہیں ہر چند کہ غالب کی سی تمانت خیال اور ان کی مخصوص ترکیبیں اقبال کے یہاں نہ سہی پھر بھی کلام کا جذبات سے لبریز ہونا اور فلسفہ اور تصوف کے رنگ میں شرابور ہونا ان کے کلام کو غالب کے کلام سے بہت قریب پہنچا دیتا ہے بعض جگہ فارسیت کی کثرت اور تصنع دآورد کے معائب کلام کی روانی، موسیقیت الفاظ اثر بلندی خیال اور ارتفاع نظر کے محاسن ہے دب ہو جاتے ہیں اہل دہلی و لکھنو چھوٹی چھوٹی لفظی لغزشوں پر نکتہ چینی کیا کریں پرانے رنگ کے استاد عروضی غلطیاں نکالیں یا کہیں کہ فلاں لفظ غلط یا بے موقع ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ہر ہر شعر پر ان کی طباعی اور ذہانت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جس سے ان کا کلام بہت سی چیزوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا

چھوٹی نظمیں | سہل اور صاف عبارت میں مثل حالی اور اسمٰعیل کی نظموں کے ہیں یہ زیادہ تر اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں جب کہ اقبال پر فارسیت کا غلبہ کم تھا اکثر یہ نظمیں بچوں کی درسی کتابوں میں شامل ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی عمدہ اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے بعض نظموں کے نام یہ ہیں ہمدردی ایک مکڑا اور مکھی ایک گلے اور بکری ایک پہاڑ اور گلہری بچے کی دعا ماں کا خواب وغیرہ چونکہ یہ چھوٹے بچوں کے واسطے لکھی گئیں لہٰذا ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔

طویل نظمیں | اقبال کی شہرت کا دارومدار ان طویل نظموں پر ہے جن میں ان کا خاص رنگ اور تخیل پایا جاتا ہے انہیں نظموں میں انہوں نے اپنے خاص شاعرانہ جوہر

دکھاتے ہیں اور فلسفہ و تصوف اور حُبِ وطن کے جذبات کے ساتھ بہترین شستہ و رفتہ زبان سلاست بیان زورِ تخیل جذب و اثر اور نئے نئے استعارے اور تمثیلیں بھی ان میں پائی جاتی ہیں ہمالہ خضرراہ شمع و شاعر شکوہ جواب شکوہ اسی صنف سے تعلق رکھتی ہیں ان کو رسمی اور معمولی نظمیں نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ سچے جذبات کا صاف و شفاف آئینہ اور طرزِ بیان اور بلندیِ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔

ہمالہ میں موضوع کی بلندی کے ساتھ مضمون کی بلندی بھی داد طلب ہے ہمالیہ ہندوستان کا اصلی محافظ ہے شاعر کو چونکہ اپنے وطن ہندوستان سے عشق ہے لہذا وہ اس کے محافظ کا بھی عاشق ہے والدہ مرحومہ کی یاد میں اقبال نے جو موثر نظم لکھی ہے وہ سچے جذبات سے مملو ہے "خضرراہ" شاعر کے دلی جذبات کا نتیجہ ہے اس میں وہ جدید مغربی ترقیوں کو اپنے اہل وطن کے واسطے ننگ و بے اعتباری کی نظر سے دیکھتا ہے شکوہ میں ایک نہایت لطیف اور شاعرانہ پیرایہ میں ان تمام مصائب اور پستیوں کا ذکر ہے جو بدنصیبی سے اس زمانے کے مسلمانوں کے حصے میں آگئی ہیں"۔ جواب شکوہ میں انہیں سب باتوں کا معقول جواب دیا ہے اور انکے اسباب بتائے ہیں ترقی اسلام میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔ شمع و پروانہ نہایت اعلیٰ درجہ کی ایک خیالی نظم ہے۔

دیگر نظمیں اقبال کی وہ چیز جس نے ان کا تخم محبت تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بودیا انکا جذبہ حب وطن ہے جسکا اظہار نہایت خوش اور سچائی کے ساتھ انہوں نے اپنی بعض نظموں میں کیا ہے جو فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں ایسی نظمیں جو کسی خاص مقصد یا غرض سے لکھی جاتی ہیں اتنی جاذب اور موثر ثابت نہیں ہوتیں جتنی کہ خیالی اور بے غرض نظمیں ہوا کرتی ہیں جگنو چاند حسن و عشق وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جنکو ہر شخص دل سے پسند کرتا ہے"۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ہندوستان کا مقبول ترین گیت ہے۔ نیا شوالہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک بیش بہا نظم ہے۔ علیٰ ہذا جو مختصر نظمیں داغ، غالب سوامی رام تیرتھ شبلی و حالی۔ شکیسپیر عرفی، نانک وغیرہ پر ہیں نیز وہ جو مناظر قدرت پر لکھی ہیں نہایت اعلیٰ درجے کی نظمیں ہیں۔

اقبال بحیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے اقبال نے شاعری کی دنیا میں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور ان کی شاعری نے نوجوان ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا اس زمانے کی ان کی شاعری کا عنصر غالب وطن کی محبت ہے اور اسی وجہ سے انکی

پہلی نظم ہمالہ میں یہ عنصر تمام جذبات پر غالب ہے صدائے درد میں یہ خیال اور بھی تقویت پکڑ گیا ہے اور اس میں وطن کے تمام مصائب اور خرابیوں کے اسباب کا ذکر نہایت پرجوش طریقے سے کیا گیا ہے سید کی لوح تربت میں بھی یہی جذبہ وطنی جلوہ نما ہے اور اس میں مذہبی تعصب اور فرقہ بندی کی شفقت مذمت کی گئی ہے تصویر درد" کو ہندوستان کا نہایت پُرا ثر اور پرجوش مرثیہ کہنا بجا ہے ہندی ترانہ اور قومی گیت" سے مادر ہند کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن ہوتی ہے ترانہ ہندی" کو بنگال کا بندے ماترم سمجھنا چاہیئے جس سے بڑھ کر ہندوستان میں شاید کوئی دوسرا قومی گیت مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں نہ ہوگا یہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مروج اور ہر شخص کی زبان پر ہے اس جذبہ وطنیت کا منتہائے عروج "نیا شوالہ" میں پہنچ گیا جس میں وہ خاک وطن کے ذرّہ ذرّہ کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ مختصر مگر نہایت ہی موثر اور جذبہ وطنیت میں ڈوبی ہوئی نظم ہے لہٰذا پوری یہاں دی جاتی ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے !

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں !

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں !

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے !

مگر یہ ان کا جذبہ وطنیت روانگی انگلستان کے ساتھ مدہم پڑ گیا یہاں تک کہ ان نظموں میں جو قیام انگلستان کے زمانے میں لکھی گئیں یہ جذبہ قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے بہر حال ہم کو پوری امید ہے کہ اقبال اردو کی طرف پھر رجوع کریں گے اور ہندوستان کے قومی شاعر کا معزز لقب ان کو پھر حاصل ہوگا۔

اقبال بحیثیت پین اسلامسٹ کے ــ یہ پین اسلامزم (اخوت ملی) کا رنگ اقبال میں قیام یورپ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب کہ ان کی آمد و رفت لندن کی پین اسلامک سوسائٹی کے جلسوں میں بہت تھی اور اس سوسائٹی کا نام بھی انہیں کے ایماء سے بدل کر صرف اسلامک سوسائٹی رکھا گیا تھا جس کے واسطے ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ اسلام میں عنصر اجتماعیت پہلے سے موجود ہے لہٰذا لفظ "پین" جو اجتماعیت کے معنی دیتا ہے زائد ہے اور اس کو نام سے خارج کر دینا چاہیے اس چھوٹے سے واقعہ سے ان کے میلان طبع کا پتہ چلتا ہے انہوں نے یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک عالمگیر سوسائٹی کے رکن ہیں عام اس سے کہ وہ اس بات سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ زمانہ حال کے سیاسی معاملات نے ان کا یہ خیال پوری طرح ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر لطیف لکھتے ہیں:۔

"نئی صدی کے آغاز سے مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا ان کا سیاسی تحفظ اور آزادی کی جد و جہد صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ جہاں جہاں اسلام کے نام لیوا تھے یعنی ترکی، ایران، ترکستان، مصر، طرابلس، مراکش یہاں تک کہ دور دراز ملک چین بھی ان کے دائرہ عمل میں شامل ہو گیا۔ یہ عالمگیر اتحاد اسلامی کی کوشش جس کا دوسرا نام پین اسلامزم تھا۔ سلطنت ترکی کے مٹ جانے سے اور زور پکڑ گئی اس کی ابتداء ۱۹۱۱ء کے اطالوی حملہ طرابلس سے ہوئی تھی جس کے بعد جنگ بلقان میں اس کی شرر افشانی اور بڑھی مگر جنگ عظیم میں اس کا خاتمہ ہو گیا اس کے متعلق بے شمار پمفلٹ رسالے اخباری مضامین نظمیں اسپیچیں ہر قسم اور ہر حالت کے لوگوں کی زبان و قلم سے نکلیں جن میں اقبال، شبلی، ابو الکلام آزاد، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور علی برادران بہت ممتاز ہیں اس احساس کا ظہور نتیج مختلف طریقوں سے ہوتا تھا (۱) رنج و الم کسی اسلامی قوم یا ملک کے آزادی پر عام اس سے کہ یہ گزشتہ زمانہ کا واقعہ یا زمانہ موجودہ کا (۲) ایسے اسلامی ممالک کے مستقبل کی فکر جو دول یورپ کے زیر اثر ہیں (۳) شک اور بے اعتباری یورپین اقوام کی بابت جو بقول ان لوگوں کے ہر مقام پر زوال اسلامی کی ذمہ دار ہیں ڈاکٹر اقبال کچھ عرصہ تک اس بین الملی اخوت کے خاص علمبردار سمجھے جاتے تھے اور انہوں نے اس معاملے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس زمانے کی نظموں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔

اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں سے ملتجی ہیں کہ اگر تم کو اپنی ہستی قائم رکھنی ہے تو جزئی جزئی مذہبی اختلافات ترک کرو اور ایک عالمگیر اتحاد و اخوت پیدا کرو۔ اُن کو بخوبی معلوم ہے کہ دنیائے اسلام چونکہ موجودہ زمانے میں منتشر اور متشتت ہے لہٰذا وہ مغرب کے باقاعدہ حملوں سے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی اور بہت جلد اُن کا شکار بن جائے گی ؎

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی	ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اُن کی دلی خواہش ہے کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ محبت و یکجہتی کی مضبوط رسّی سے بندھ جائے اور مسلمان اپنے مذہب کے ضروری احکام و ارکان کے دل سے پابند ہو جائیں۔ مسلمانوں کو یہ خیال ترک کر دینا چاہیئے کہ ہم ہندی ہیں یا ترک، مصری ہیں یا افغانی۔ اُن کو اپنے تئیں ایک عظیم الشان زنجیر کی کڑیاں سمجھنا چاہیئے۔ قوم و ملک، قرب و بُعد کے فرضی خیالات دل سے یک قلم نکال دینا چاہیئے اور اپنے تئیں ایک برادری کے افراد سمجھنا چاہیئے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی	اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی!
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گُم ہو جا	نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اُن کا قول ہے ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو	جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

جب اقبال یورپ جا رہے تھے تو راستے میں جہاز سے جزیرہ سسلی نظر پڑا جو ایک زمانہ میں عربوں کے اقتدار اور تہذیب و شان و شوکت کا مرکز تھا اُس کو دیکھ کر عجیب پُراثر طریقے سے فریاد کرتے ہیں ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار	وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی	بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے	بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور	کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور!
مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا	آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے	کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یہ اسی پین اسلامزم کی برکت ہے کہ اقبال کی شہرت ممالک اسلامی کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی پھیل گئی ہے۔

اقبال کا فلسفہ — اقبال محض خوشگوار شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں۔ اُن کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے۔ اُن کا فلسفہ مختصراً دو جملوں کا ترجمان ہے (۱) اپنی ہستی پہچان (۲) اپنی ہستی

ثابت کر۔ اسی ہستی سے باخبر ہونے میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اہل مشرق کے دلوں سے وہم و گمان جو اُن کے کیرکٹر کا عنصر غالب ہے نکل جانا چاہیئے اور اُس کی جگہ یقین اور اعتبار کو ملنا چاہیئے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اقبال مغربی مادیت کے دشمن ہیں اہل مغرب کو مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

"طلوع اسلام" میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اُن کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں انسان کو خوشدلی اور خودداری کی تلقین کی گئی اور اس کو اصلی عظمت و شان یاد دلائی گئی ہے ؎

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

اس قسم کے اشعار بکثرت ہیں لہٰذا اُن کے بحرِ سخن میں غوطہ مارنا اور فلسفہ کے تمام دُرِ شاہوار باہر نکالنا اس مختصر مضمون کے مقصد سے باہر ہے۔

بعض یورپی نقادوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مضامین کے لئے بعض مغربی فلسفیوں مثلاً نطشے اور برگساں وغیرہ کے ممنونِ احسان ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔ مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر اکابر مذکور کے فلسفہ کا اثر بہت گہرا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اقبال کی دلی خواہش ہے کہ اُن کے برادرانِ دینی میں اپنی ہستی سے واقف ہونے اور اپنے تئیں پہچاننے کا مادہ پیدا ہو جائے اور کوشش و عمل کی شدید ضرورت کا احساس اُن کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اقبال کے نزدیک عملی جد و جہد زندگی اور سُستی اور بیکاری موت ہے۔ اُن کا پیغام نہایت اعلیٰ سچا اور پُرجوش ہے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو بہانگِ دُہل سُنانا چاہتے ہیں کہ غفلت و سُستی ترک کرو۔ اُن کی غرض کوئی مُلکی توسیع یا سیاسی ترقی نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سادگی، بے ریائی، شجاعت، ہمت و استقلال اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی قوتِ فکر غرضکہ وہ جملہ خصائل و فضائل جو کسی زمانے میں اُن کے اسلاف میں پائے جاتے تھے ان میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اس پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو پُرانے افسانوں کو یاد کرنا اور ترقی کی گھڑی کی سوئیاں اُلٹی گھمانا ہوا۔ مگر درحقیقت یہ اعتراض سطحی اور غیر واجبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقبال زمانہ موجودہ کی تصویر تاریک رنگوں میں اور زمانہ گذشتہ کا مرقع نہایت چمکتے ہوئے رنگوں میں کھینچتے ہیں محض اس غرض سے کہ مسلمان اُس سے ایک مفید سبق حاصل کریں اپنی غفلت شعاری چھوڑیں اور سعی و کوشش

سکھیں۔ مختصر یہ کہ اقبال کا یہ پیغام عمل و کوشش کا پیغام ہے ؎

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے | جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

اقبال کے کلام میں اُمید و مسرت اقبال محزون و مایوس شاعر نہیں اُن کے کلام میں امید و مسرت جلوہ گر ہے بلکہ یہی چیز اُن کو اُن کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس تاریک فضا سے کبھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کیرکٹر کو پختہ اور مضبوط کرتی ہیں جس طرح سونا کٹھریا کی تیز آنچ سے پاک و صاف ہو کر چمک جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی ناکامیوں اور نامرادیوں کی کسوٹی پر چڑھ کر قوت پکڑتی ہیں۔ وہ تاریک اور مصائب گرفتہ مشرق کے لئے ایک درخشاں مستقبل دیکھتے ہیں اور کبھی افسردہ دل نہیں ہوتے بلکہ ناکامیوں کے بادل کے پیچھے شعاعِ اُمید جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

اقبال عملی شاعر ہیں باوجود خیالی شاعر ہونے کے اقبال بہت بڑے عملی شاعر بھی ہیں۔ وہ اشیاء کا عملی پہلو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ گو اُن کے خیالات فلک پیما ہیں مگر وہ خود مادرِ زمین کے ساکن ہیں۔ اُنکو انسانی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ اُن کی دنیا عملی دنیا ہے جس میں خوشی اور غم اُمید و یاس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ کبھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اقبال کی نیچرل نظمیں اس صنف میں بھی اقبال کا کلام لاجواب ہے اور اُن کی وہ نظمیں جو نیچرل چیزوں اور قدرتی مناظر پر ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتیں مثلاً جگنو، چاند، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور جگنو، ابر وغیرہ۔ اعلیٰ تخیل، صحتِ بیان اور شیرینی زبان کے واسطے یہ نظمیں لاجواب ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کے یہاں جو سادگی طفلانہ مسرت اور اصلیت کا جوش و خروش پایا جاتا ہے وہ اُن کے یہاں نہیں۔ مگر یہ چیز تو یہاں کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ پس اقبال کے یہاں جس قدر بھی ہے بہت غنیمت ہے اور اوروں سے بہت زیادہ ہے۔ شعرائے مشرق کے یہاں مناظرِ قدرت کا بیان اظہارِ جذبات کے لئے وہی کام دیتا ہے جو تصویر کے واسطے اُس کا بیک گراونڈ یعنی بالذات اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی صرف تصویر کو اُبھارنے کے کام آتا ہے ہمارے شاعروں کا اصلی مقصد کسی جذبہ یا تخیل کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کسی منظر کو بطور تمثیل یا تشبیہ کے ضمناً پیش کر دیتے ہیں برخلاف شعرائے مغرب کے کہ وہ حسین مناظر کے بیان میں جو اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں محو ہو جاتے ہیں اور اُنھیں کا حسن و حسنِ بیان اور اُنھیں سے لطف اندوزی اُن کی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ اقبال بمقابلہ دوسرے شعرائے اُردو کے اس معاملہ میں شعرائے مغرب سے بہت قریب تر ہیں اور اُنہوں نے پُرانے فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔

اقبال کی خصوصیت شاعری (۱) پہلی خصوصیت وہی پین اسلامزم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا (۲) اسلام کی قرونِ اولیٰ کی سادگی پر جو بُرا اثر عجمی تکلف و تصنع کی تہذیب نے ڈالا تھا اُسکے وہ بہت شاکی ہیں اور اسی کو وہ اسلام کے انحطاط و زوال کا اصلی سبب ٹھہراتے ہیں (۳) اُن کا پیغام نہایت سچا اور پُر جوش ہے مگر چونکہ کچھ باتیں مصلحتاً وہ علانیہ طور پر کہنا نہیں چاہتے لہٰذا تمثیل و تشبیہ کے پردے میں اُن کو کہنا پڑتا ہے (۴) وہ حقیقی شاعر ہیں کیونکہ نہ تو وہ کسی کی فرمائش سے کہتے ہیں نہ کسی کی بے جا اور خوشامدانہ تعریف کہتے ہیں (۵) ان میں ایجاز و اختصار کی صفت ہے یعنی چھوٹے چھوٹے لفظوں میں معنی کے دریا بھرے ہوتے ہیں

مثل غالب کے ان پر بھی یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ پہلے الفاظ کی کیمیائی تحلیل کر لو اس کے بعد معنی کا خاص سونا ہاتھ آئے گا (۶)۔ ان کے مضمون اکثر فارسی الفاظ و محاورات کے تہ میں ہوتے ہیں مگر کبھی راز سربستہ نہیں ہوتے غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں (۷)۔ وہ بالکل زمانہ حال کے شاعر ہیں ہر طرح کے حقائق سائنٹیفک فلسفیانہ مذہبی سب ان کے کلام میں موجود ہیں۔ جس طرح تصوف و اخلاق کے بیش بہا مضامین بہترین اور حسین ترین الفاظ میں ان کے کلام میں جلوہ گر ہیں اسی طرح علوم مغربی مثلاً کیمیا و طبعیات وغیرہ کے رموز بھی لطیف تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں پائے جاتے ہیں (۸)۔ ان کی بعض تشبیہیں نہایت لطیف و نادر ہیں مثلاً "ہلال عید" "روشنی کا حباب ہے" جگنو کی نسبت کہتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

(۹) اُن کے کلام کا خاص طرۂ امتیاز جوشِ مسیحائی اور قوت ہے۔ اُن کی نظموں میں وہی زور ہے جو بہتے ہوئے دھاروں میں ہوتا ہے یہ زور قوت اور اردو شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔

اقبال کی شہرت ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کو یہ شہرت اور ہر دلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کو ہوئی۔ اُن کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُور دُور ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک قومی شاعر مانے جاتے ہیں بڑے بڑے شعرا اور اہل قلم مثلاً شبلی نعمانی اکبر، خواجہ حسن نظامی سر ذوالفقار علی خاں وغیرہ نے ان کو باج تحسین دیا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے ان کی کتاب اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ یورپ و امریکہ کے مشہور ناقدوں نے ان کی تصانیف پر نہایت عمدہ عمدہ ریویو لکھے۔ ہندوستان میں وہ ترجمان حقیقت کے لقب سے مشہور ہیں۔ اسی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں "سر" کا معزز خطاب ان کو دیا گیا۔ نوبل پرائز کے مستحقین میں ایک زمانے میں ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

وہ نوجوانانِ ہند کے بہترین شاعر ہیں کیونکہ انہیں کے جذبات و احساسات کو وہ عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہیں ایک زمانے میں وہ اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور ملک کا ہر طبقہ ان کو مادر وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ سے وہ ان لوگوں میں اس قدر ہر دلعزیز نہیں رہے جو جذبات وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں اور ان کی کمی شہرت کا باعث یہ بھی ہوا کہ وہ اُردو کو زبان فارسی کے ماتحت کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے اقبال کا مرتبہ زمانۂ حال کے دیگر اُردو شعرا میں بہت بلند ہے وہ تو دنیا کے بڑے بڑے شعرا کے ہم پلہ ہیں:

تعلیقات

اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق اُردو زبان اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں دہلی اور اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے، زبان اُردو کی اصل اور ماں کہی جاتی ہے۔

رام بابو سکسینہ نے اردو زبان کے مختلف نظریات پر بحث کرنے کی جگہ محض مغربی ہندی کے نظریہ کو پیش کیا ہے اور اس نظریہ کی تصدیق کے لئے کوئی واضح ثبوت اور دلیلیں بھی فراہم نہیں کی ہیں جس کی وجہ سے یہ موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔

اُردو زبان کے نظریے پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے برصغیر میں لسانی ارتقا کا جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آریاؤں کی آمد کے بعد لسانی صورتِ حال کو دیکھا جائے اور پھر مسلمانوں کی آمد کے بعد جو لسانی عمل ہوا اس کا تجزیہ کیا جائے۔

اُردو زبان کو محض مسلمانوں کی آمد سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ برصغیر کے شمالی علاقے میں جہاں اول اول آریا داخل ہوئے، آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی زبانیں موجود تھیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد مقامی زبانوں سے اختلاط شروع ہوا۔

برصغیر کی لسانی تاریخ کا جہاں تک فی الحال سراغ لگایا جا سکا ہے۔ اس کے مطابق آریاؤں کی آمد سے پہلے یہاں زبانوں کے تین گروہ ملتے ہیں۔ پہلا گروہ پہاڑی زبانوں کا ہے جو لداخ سے شروع ہو کر ہند چینی تک جا پہنچتا ہے۔ دوسرا گروہ منڈا قبائل کی زبانوں کا ہے جن میں بھیل، کول اور سنتھال قبائل کی زبانیں شامل ہیں۔ اس گروہ کے بعد تیسرا گروہ دراوڑی زبانوں کا ہے۔ شمالی ہند کی موجودہ زبانیں پنجابی، سندھی اور اُردو کا سرچشمہ ان کی پیش رو مقامی پراکرتیں تھیں جو براہِ راست منڈا اور دراوڑی گروہ سے متاثر تھیں۔ سنسکرت اسی کے بعد آریاؤں کی آمد سے برصغیر میں شروع ہوتی ہے۔

آریاؤں کی برصغیر میں آمد کے بعد ایک نیا لسانی عمل شروع ہوا۔ آریا اپنی زبان خود اپنے ساتھ لائے تھے۔ آریا چونکہ جسمانی لحاظ سے طاقتور تھے۔ اس لئے برصغیر کے شمالی علاقے پر مسلسل قابض ہوتے چلے گئے۔ اور ایک فاتح کی حیثیت سے انہیں اپنی زبان پر غرور تھا اگرچہ مقامی باشندے تہذیب و تمدن میں ان سے بہت آگے تھے۔ وہ پختہ شہروں اور پختہ مکانوں میں رہتے تھے۔ زراعت و تجارت اور صنعت میں ترقی کر چکے تھے جبکہ آریا محض خانہ بدوش تھے اور طویل عرصے بعد کہیں بستیوں میں انہیں رہنے کا فن آیا تھا۔ مگر اسی تہذیبی برتری کے باوجود جو مقامی باشندوں کو ان پر حاصل تھی۔ آریا انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ ان کی اسی نفرت کا اظہار ان کے لسانی اظہار میں ہوا۔ وہ اپنی زبان کو سب مقامی زبانوں پر فوقیت دیتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ مقامی زبانوں کو انہوں نے مردھراوگ یعنی غیر زبان کا نام دیا۔ آریاؤں سے

قبل شمالی ہند میں ناگ کو دیوتا ماننے والے قبیلے بھی موجود تھے۔ آریا ان قبیلوں کی زبان کو "ناگ بانی" کہتے تھے۔ اسی طرح آریا غیر آریا قبائل کی زبان کو "اسر بھاشا" بھی کہتے تھے جس کا مطلب ہے وہ زبان جسے غیر آریا لوگ بولتے تھے۔ آریاؤں نے مقامی زبانوں سے اپنی بھرپور نفرت کا اظہار اسے "ملیچھ بھاشا" یعنی ناپاک زبان کہہ کر کیا۔ اس طرح سے زمانہ گزرنے کے بعد مقامی زبانوں کے لئے "دیسا جا" کا لفظ مستعمل ہوا۔

آریاؤں کا مقامی زبانوں کے بارے میں یہ رویہ آغاز ہی سے قائم ہوا اور یہ بتدریج بڑھتا گیا۔ انہوں نے آغاز ہی سے اپنی زبان کو خالص، پاکیزہ اور برتر سمجھا اور اس نظریہ میں مستقبل میں زبردست ترقی ہوئی۔ آریاؤں کے اس لسانی رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند میں دو قسم کی زبانیں اپنا عمل کرنے لگیں۔ سنسکرت اور پراکرت۔ سنسکرت آریاؤں کی مذہبی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے ایک برتر زبان سمجھی گئی اور اسے "دیو بانی" یعنی دیوتاؤں کی زبان کا نام دیا گیا۔ چنانچہ آریاؤں کی مقدس کتابیں سنسکرت ہی میں لکھی گئی ہیں۔ سنسکرت نے طبقاتی کردار ادا کیا۔ یہ اعلیٰ تہذیبی و مذہبی طبقات تک محدود رہی بلکہ اسے خالص رکھنے کے لئے، مقامی زبانوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی۔ مقامی زبانوں کا ذخیرہ خود کار لسانی عمل سے اس میں داخل ہو گیا۔ اسے اعلیٰ طبقات تک محدود کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان عوام کے کبھی قریب نہ آئی۔ اور رفتہ رفتہ مردہ ہو گئی۔

اب مسئلہ پراکرتوں کا رہ جاتا ہے جو غیر آریائی مقامی زبانیں تھیں یہ زبانیں چونکہ اپنی زمین سے مضبوط رشتہ رکھتی تھیں اس لئے زندہ رہیں۔ زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اور ذہنوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا اثر ان پر پڑتا رہا۔ معاشرتی تبدیلیوں کا شیوہ ان مقامی زبانوں کے رنگوں کو مسلسل بدلتا رہا۔ اور ترقی دیتا رہا اور یہ زبانیں سنسکرت کے مقابلے میں زندہ رہیں۔

آریاؤں کی برصغیر میں آمد کے بعد پراکرتوں میں لسانی اور صوتی تبدیلیوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ کئی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں جو لسانی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے اعتبار سے ماہرین لسانیات نے پراکرتوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ زبان کی تاریخ کو کسی قطعی میں مقید نہیں کر سکتے، صرف اندازاً زمانے کا تعین کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر چیٹرجی نے پراکرتوں کو مختلف ادوار میں اس طرح سے تقسیم کیا ہے۔

۱۔ قدیم ہند آریائی دور ——— آریوں کی آمد سے لے کر تقریباً ۶۰۰ ق م تک (۷۰۰ سال)

۲۔ وسطی ہند آریائی دور ——— ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک ۱۶۰۰ سال تقریباً۔

۳۔ جدید ہند آریائی دور ——— ۱۰۰۰ء سے عہد جدید تک تقریباً ۹۵۰ سال۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد تک جو لسانی ارتقاء کی شکل بنتی ہے اس کا نقشہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں اس نقشہ کے مطابق برصغیر میں لسانی ارتقاء کے تین اہم ادوار مانے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا دور۔ ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م ہے۔ یہ دور ہند آریائی زبان کا عہد قدیم کہلاتا ہے۔ یہ دور آریاؤں کی آمد کے بعد ہونے والے لسانی اختلاط کو واضح کرتا ہے اور دوسرا دور عہد وسطی کا ہے جس کا زمانہ ۵۰۰ ق م تا ۶۰۰ء تک ہے اور پھر تیسرا دور ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک ہے۔ مسلمان اس آخری دور میں ہی برصغیر میں داخل ہوئے اور پھر یہاں آباد ہوئے اور ان کی تبلیغ سے اسلامی تہذیب کو فروغ ملنے لگا۔

برصغیر میں مسلمان پہلے پہل سندھ میں آئے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر فتح حاصل کی اور یوں برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا نفوذ شروع ہوا۔ یہاں کے لوگوں نے کثرت سے اسلام قبول کیا اور خود عرب بھی ان علاقوں میں آباد ہوئے۔ نومسلموں کو چونکہ عبادات سیکھنے کے لئے عربی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لئے اس حوالے سے عربی زبان کے بے شمار لفظ سندھی میں داخل ہوئے۔ عربوں کی سیاسی فتوحات سے جو عمل شروع ہوا' اس کا دائرہ صرف سندھ تک ہی محدود رہا۔ سندھ میں عربوں کے دورِ حکومت میں سندھ کے مختلف علاقوں میں عوام اپنی مختلف بولیاں بولتے تھے۔ یہاں 'اردو ناگری' کا بھی رواج یعنی نصف ناگری کیونکہ یہ مختلف زبانوں سے مل کر ملی جلی زبان بن گئی تھی۔ یہ زبان بول چال اور تحریر میں مستعمل تھی (تاریخ سندھ ۳۶۵ ابو ظفر ندوی) جنوبی سندھ میں ساحلی علاقوں میں ملگاری زبان کا زیادہ رواج تھا۔ جب کہ منصورہ اور برہمن آباد میں رائج زبان کو سین دب (سندھی) کہتے تھے۔ (ایضاً ص ۳۶۵ بحوالہ کتاب الہند ص ۸۲) سندھ میں صدیوں تک عرب عدالتی، تجارتی و تعلیمی مقاصد کے لئے عربی استعمال کرتے تھے۔ اور عام لوگوں سے ان کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ سلسلہ چوتھی صدی ہجری تک جاری رہا مگر چوتھی صدی ہی کے آخر میں ایک اور نمایاں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اس صدی کے آخر میں دیلمیوں کے عروج سے سندھ میں فارسی کا بھی رواج ہوا۔ چنانچہ ۳۷۵ھ میں جب بشاری ملتان آیا تو یہاں فارسی رائج ہو چکی تھی۔

اسلامی تہذیب کے اثرات اس کے بعد پنجاب میں غزنوی کی فتوحات سے پہنچے۔ ۱۰۲۷ء سے پنجاب غزنوی سلطنت کا صوبہ بن چکا تھا اور یہاں غزنی سے باقاعدہ طور پر صوبہ دار متعین ہوتے رہے۔ پنجاب میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے غزنوی عہد میں ایک بڑا لشکر موجود رہتا تھا اور اس لشکر میں فارسی اور ترکی بولنے والوں اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد ان لشکریوں کی تھی۔ جن کی مادری زبان پنجابی تھی۔ چنانچہ اول اول لسانی ملاپ کی ابتدائی شکل فوج ہی میں بنی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلم تہذیب و ثقافت کے اثرات کچھ اور اشکال میں بھی ظاہر ہو رہے تھے۔ ترکی اور فارسی بولنے والے تاجر بھی پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔ ان تاجروں کا میل ملاپ مقامی تاجروں سے رہتا تھا جو پنجابی بولتے تھے۔

اسلامی تہذیب کا سب سے مؤثر اثر صوفیاء اور علماء کے حوالے سے ہوتا ہے۔ غزنوی عہد میں بہت سے صوفی تبلیغِ اسلام کی غرض سے پنجاب میں آباد ہوئے۔ یہ لوگ فارسی یا ترکی جانتے تھے۔ جب کہ مقامی

لوگ ان زبانوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ صوفیاء حضرات چونکہ معاشرے کی ہر سطح پر خدا کا پیغام پہنچاتے تھے اور خصوصاً ان کی توجہ کا مرکز غریب عوام تھے جو صدیوں کے برہمنی عذاب میں گرفتار تھے۔ جسے اُس نے متشدد طبقاتی تقسیم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسلام کے پیغام مساوات اور وحدانیت سے یہ لوگ بہت جلد متاثر ہوئے اور صوفیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔ اب ظاہر ہے کہ صوفیاء ان لوگوں تک رشد و ہدایت کا سلسلہ فارسی یا ترکی ہی میں نہ کرتے ہوں گے بلکہ وہ مقامی زبان سیکھ کر لوگوں کے دلوں میں جذباتی سطح پر اپنا پیغام اتار سکتے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ اوّل اوّل صوفیاء نے ہی ایک مخلوط زبان کی ضرورت کی اہمیت کو سمجھا ہوگا۔ لاہور ایک ایسا شہر تھا جو ثقافت، تجارت اور سیاست میں زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اور بقول محمود شیرانی اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا اور پنڈت کیفی نے لاہور کو اس حوالے سے "نئی زبان" اور مخلوط کلچر کا ابتدائی مرکز" کہا ہے۔ لاہور غزنویوں کی تہذیب و ثقافت میں زبردست ترقی کرتا رہا۔ اور اس عمل سے ایک نیا لسانی عمل جاری رہا۔ غزنوی عہد ایک سو سترہ سال پر محیط ہے۔

اس کے بعد غزنوی سلطنت کا زوال ہوا تو محمد غوری نے شمالی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں خاندانِ غلاماں کا دور شروع ہوا تو قطب الدین ایبک کے ساتھ پنجابی فوجی دلی جاکر آباد ہوئے۔ اور اسی طرح دلی میں مقامی زبانوں پر پنجابی کے اثرات شروع ہوئے۔ دلی میں صدیوں تک پنجابی سپاہی آباد رہے اور پھر انہی سپاہیوں پر مشتمل افواج نے محمد بن تغلق کے عہد میں دکن کا رخ کیا اور یوں دکن میں پنجابی فارسی اور ترکی بولنے والے سپاہی، انتظامی افسر اور تاجر و صوفیاء پہنچے اور یہ ایک زبردست تہذیبی یلغار تھی جو بڑی تیزی سے اس علاقے پر ہوئی۔ یہاں بھی صوفیا کا طریق کار وہی تھا جو انہوں نے پنجاب میں روا رکھا تھا۔ یہ صوفیاء کی تبلیغ ہی کا نتیجہ ہے کہ آج پرانی دکنی میں اردو کے ابتدائی نمونے صوفیاء کی زبان ہی میں ملتے ہیں۔

برصغیر کی پوری تہذیبی زندگی میں مسلمانوں کی آمد سے ایک انقلابی تغیر شروع ہوا تھا۔ جس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔ اس تغیر سے اردو کو وابستہ کر لیا جاتا ہے۔ اس تغیر سے تخلیق کا عمل اوّل اوّل چونکہ پنجاب کی سرزمین پر ہوا۔ لہٰذا اردو کی ابتداء کے نظریے کو پنجاب سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اردو کو جو مغربی ہندی سے منسوب کر دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔

صـ۴

رام بابو سکسینہ نے دکن کی ریاست گولکنڈہ کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

"قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ ان کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنہوں نے شعر کہا ہو مگر ان کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہ ملا۔"

محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے تین شعرا کا سراغ ملتا ہے اور یہ شعراء ہیں۔ ملا خیالی، سید محمود اور فیروز۔

ملا خیالی کی تعمیر کردہ مسجد کے کتبہ پر ۹۶۷ھ/ ۱۵۶۹ء درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس عہد میں زندہ تھا۔ اس کا سنہ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ ملا خیالی کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ ملا وجہی اور ابن نشاطی اسے اپنا معنوی استاد تسلیم کرتے ہیں۔

سید محمود بھی قلی قطب شاہ سے پہلے کا شاعر ہے۔ اسے وجہی اور ابن نشاطی استاد سخن مانتے ہیں۔ خود قلی قطب شاہ اس کا ذکر انوری اور ظہیر کے ساتھ کرتا ہے۔

فیروز، ملا خیالی اور محمود کا ہم عصر شاعر تھا۔ وجہی اور ابن نشاطی اس کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں۔ فیروز نے ایک مثنوی 'توصیف نامہ' ۱۵۶۵ء میں قلی قطب شاہ کی پیدائش سے قبل لکھی تھی۔ اس مثنوی کا متن اردو ادب جون ۱۹۵۷ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

فیروز کی شعری زبان نسبتاً صاف، رواں اور سادگی کی طرف مائل ہے۔ یہ شعری زبان، دکن کی شعری لغت کے ابتدائی ڈھانچے کا نمونہ ہے۔ یہ زبان ظاہر کرتی ہے کہ فیروز آسانی سے اپنا مطلب بیان کر سکتا ہے اور نئے شعری اسالیب اور تجربات کے لئے زبان کو تیار کر رہا ہے۔ قلی قطب شاہ سے پہلے یہ اسی عہد کے دکن کی معیاری زبان سمجھی جاتی تھی۔

صہ ۱۲

محمد قلی قطب شاہ۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا سکینہ نے سرسری جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان کی شاعری کے بعض نئے پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا جو تہذیبی کینوس بنتا ہے۔ اس میں عربی و عجمی اور ہندوستانی تہذیب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مذہبی طور پر وہ مسلمان ہے۔ اس لئے اس نے شب برات اور عید میلاد النبی پر نظمیں لکھی ہیں۔ عجم کی تہذیبی بساط سے بھی اس کا ایک تعلق ہے جس کا اظہار اس نے 'نوروز' پر لکھی جانے والی نظموں میں کیا ہے۔ وہ سرزمین دکن میں پیدا ہوا۔ زمینی زندگی کے مظاہر سے اسے محبت تھی۔ بسنت، سرما، دیوالی اور برسات پر لکھی جانے والی نظموں میں اس کے ان جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی زمینی زندگی سے محبت کے اور ثبوت بھی ملتے ہیں۔ اس نے نہ صرف شاعری میں مقامی عناصر کو داخل کیا بلکہ عملی زندگی میں بھی مقامی تہذیب کے اثرات قبول کئے۔ اس نے آبائی لباس چھوڑ کر مقامی لباس اختیار اختیار کیا۔ ایرانی اور ترکستانی ملبوسات کی جگہ برصغیر کے باریک اور ہلکے پھلکے ملبوسات کا استعمال کیا۔ اسی طرح فن تعمیر میں بھی مقامی اثرات قبول کئے۔

محمد قلی قطب شاہ منظر نگاری میں کمال رکھتا ہے۔ وہ خارجی مناظر کے اجزاء کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ ایک مرقع بن جاتا ہے۔ مناظر میں اسے روشنی اور چکاچوند کر دینے والی اشیاء زیادہ پسند ہیں۔

اس کی تمثالیں تاریک، نیم تاریک یا نیم روشن نہیں۔ اس کی پوری امیجری تیز روشنی اور بھڑکیلے رنگوں کا اظہار کرتی ہے۔ دکن کی سرسبزی و شادابی اور شگفتگی اور عیش و نشاط کی فراوانی سے اس کے ہاں یہ عناصر پیدا ہوئے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ چراغوں کی کثرت ہے۔ اور اتنی تیز روشنی ہے کہ رات سورج نکلے بغیر دن کا منظر پیش کرتی ہے۔

قلی قطب شاہ کی تشبیہات میں عجمی و مقامی رنگ نظر آتے ہیں۔ ان میں جدت کا تیکھا پن ہے مگر ان کا حیاتی ہونا، ان کی قدر کو بڑھاتا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ تشبیہیں دور از خیال نہیں ہیں ان کے معروضات قریبی تہذیبی رابطوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مروجہ روایت کا حصہ ہیں۔ شب برات کی ایک نظم میں وہ اپنے معشوق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے یہ وہ رات ہے کہ معشوقوں کے دہن پستے اور آنکھیں شکر کی طرح شیریں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہونٹ کوزے کی مصری کی طرح نازک معلوم ہوتے ہیں اور ان معشوقوں کے چہرے پر پسینے کی ننھی بوندیں خشخاش کے دانوں کی طرح باریک نظر آتی ہیں۔ ان کی کاجل لگی آنکھیں سیاہ بادام کی طرح ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے مقامی موسموں کے بھرپور نقشے پیش کئے ہیں۔ ان کے حوالے سے اس کی شاعری میں جاگیردار معاشرے کی مجلسی زندگی کی جھلکیاں، رقص و سرود کی پرتکلف محفلیں، عیش و نشاط کے جمگھٹے اور رندی و سرمستی کی مجلسیں پورے روایتی اہتمام سے نظر آتی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

"نازنین کا چہرہ بجلی کی طرح چمکنے لگا، جب وہ شرم کے مارے آنچل ہٹا کر پھر چہرے پر ڈالنے لگی۔ چاروں طرف گرج کی آواز سنائی دیتی ہے اور مینہ برستا ہے، عشق کے ترانوں سے موروں نے باغوں کو معمور کر دیا۔ ان چھیلی پتلیوں جیسی دوشیزاؤں کے جوبن چولیوں کے بند سمیت آزاد ہو کر نکل پڑے ہیں۔ ان کے جسم سے شرابِ عشق ابل رہی ہے اور وہ آنکھوں سے فریفتہ بنا رہی ہیں، جس طرح ڈالیوں پر سرخ پھول نکل آئے ہیں۔ اس طرح تم اپنے بازوؤں پر باز و بند کے سرخ پھندنوں کی بہار دکھاؤ۔"

قلی قطب شاہ کی شاعری کی لسانی تشکیلات بھی قابل توجہ ہیں۔ اس کی شعری لغت پنجابی کے بہت قریب ہے۔ بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظ بدل جائیں تو پنجابی زبان کا نمونہ ہوگا۔ دکن کے شعرا کی زبان کا یہ ڈھانچہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں پنجابی کا واضح اثر موجود ہے۔ یہ شعرا پنجابی کے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ ان لفظوں کو جس رخ سے استعمال کرتے ہیں وہ پنجابی کی شعری لغت کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔

ص صـ ۴۲

سکینہ غوری نے غواصی کی تصنیفات میں سے صرف مثنوی سیف الملوک کا ذکر کیا ہے۔ غواصی کی یہ مثنوی دکن سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔

غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" ہے جو ضیاءالدین نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی چار ہزار رباعیات پر مشتمل ہے اور ۱۶۳۹ء/۱۰۴۹ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی بھی ۱۹۳۹ء میں دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ ان دونوں مثنویوں کے متن سعادت علی رضوی نے مرتب کئے ہیں۔ غواصی کی ایک اور مثنوی "میناستونتی" ہے۔ یہ مثنوی ڈاکٹر غلام عمر خان کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ غواصی کی کلیات محمد بن عمر نے مرتب کی تھی جو شائع ہو چکی ہے۔

ص ۴۲

ابن نشاطی کا نام شیخ محمد مظہر ہے۔ ابن نشاطی کی "پھولبن" ۱۶۶۵ء/۱۰۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔ "پھولبن" کا ایک ایڈیشن شیخ چاند ابن حسین نے ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع کیا تھا۔ ابن نشاطی شاعر ہی نہیں بلکہ وہ انشاپرداز بھی تھا جس کا اظہار اس نے "پھولبن" کے خاتمے میں کیا ہے۔

طبیعت کو مری ہے خط علائم رہے انشا میرا میل دائم

ڈاکٹر جمیل جالبی "پھولبن" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ابن نشاطی نے ۱۷۴۴ اشعار کی اس مثنوی میں سلیقے کے ساتھ اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں۔ چاندنی رات، طلوع و غروب آفتاب اور باغ کے مناظر دلچسپ ہیں۔ اور رزم و بزم کے نقشے بھی توازن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں حتیٰ کہ ابن نشاطی نے قصہ در قصہ کے بیان میں بھی فنی توازن کو برقرار رکھا ہے اور ہر مقام پر قصے کے مرکزی کردار اور قصے کی بنیادی اہمیت کا خیال رکھا ہے۔ مثنوی میں کثرت سے کردار آتے ہیں اور ابن نشاطی ان کرداروں کے خد و خال قابلِ ذکر انفرادیت کے ساتھ شعر کی زبان میں اس طور پر ابھارتا ہے کہ کردار ہمارے ذہن میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ پھولبن کی ایک خصوصیت اس کا زورِ بیان ہے۔ اس زورِ بیان کو پیدا کرنے کے لئے وہ کثرت سے موزوں تشبیہات استعمال کرتا ہے۔ جس سے خیال و احساس اجاگر ہو جاتے ہیں۔"

ص ۴۳

سکینہ نے ملا وجہی کی صرف ایک کتاب "سب رس" کا ذکر کیا ہے۔ بحیثیت شاعر وجہی کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" خاص شہرت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کا قصہ نیا نہیں ہے۔ مثلاً ایک بادشاہ اولاد سے محروم ہے۔ بالآخر اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ خوب توجہ سے اس کی تعلیم و تربیت کی گئی۔ شہزادہ نے جوان ہو کر ایک نازنین کو دیکھا وغیرہ وغیرہ۔ اس قصے میں ایک علامتی سطح بھی موجود ہے۔ شہزادہ جسم کی علامت ہے اور وہ روح سے محروم ہے۔ لہٰذا روح کی تلاش میں وہ سرگرداں نظر آتا ہے۔ شہزادی روح کی علامت ہے اور جسم کی متلاشی ہے۔ جسم جتنی دیر روح سے

دور رہتا ہے وہ مسلسل اضطراب کا شکار نظر آتا ہے لیکن جب روح سے اس کا ملاپ ہوتا ہے تو دونوں وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ علامت ایک ایسی قدرِ مشترک ہے جو اکثر داستانوں میں ملتی ہے۔

جس طرح "سب رس"، دکن کی نثری روایت کی تکمیل کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح "قطب مشتری" کی زبان دکنی کی شعری لسانیات کی تکمیل کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ اس میں بیک وقت عربی، فارسی اور مقامی زبانوں کی لسانی تشکیل کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ قطب مشتری تک پہنچتے پہنچتے دکن کی شعری لسانیات کی ایک روایت مکمل ہو جاتی ہے۔ وجہی نے اپنے اسلوب نثر میں اپنے سے پہلے بننے والی دکنی شعری روایت سے پورا استفادہ کیا ہے۔ قطب مشتری نہ صرف لسانی اعتبار سے دکنی ادب کی ایک اہم کڑی ہے

بلکہ مرقع نگاری کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے۔ وجہی شاہی مجالس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ایک مرقع بن جاتا ہے اور پھر اس میں لفظوں کی قوت سے حرکت اور حرارت کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

ص ۴۴

قطبی

سکینہ کے بقول، قطبی نے ۱۰۴۶ھ میں "تحفۃ النصائح" کا دکنی میں ترجمہ کیا تھا جب کہ ترجمہ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں کیا گیا۔ یہ کتاب ۱۹۰ اشعار اور ۵۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں دین و دنیا کی ساری نصیحتیں اور معلومات جمع کی گئی ہیں۔ توحید باری، احکام و ارکانِ ایمان، عقائد، عقوبت گور، بیانِ علم و فضل، قضائے حاجت، وضو، غسل، آداب، لباس پہننا، کھانا پینا، شطرنج، سماع، رقص و سرود، بخل و سخا، امر معروف و نہی عن المنکر، دلہن کی گھر میں آمد اور مجامعت۔ "تحفۃ النصائح" اپنے عہد کی مشہور تصنیف تھی۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیبی نقطہ نظر سے یہ کتاب خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں پسند و ناپسند کے معیار کیا تھے؟ ادب و آداب کے کیا طریقے تھے؟ تہذیب و تمیز میں کن باتوں کو اہمیت دی جاتی تھی؟ لباس، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے کیا طریقے تھے؟ جنس کی معاشرے میں کیا اہمیت تھی؟ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے کے طرزِ فکر و عمل پر کن خیالات و عقائد کی گہری چھاپ تھی۔ تحفۃ النصائح کی حیثیت اس دور میں وہی تھی جو ہمارے زمانے میں مولانا اشرف علی تھانوی کے "بہشتی زیور" کی ہے۔

جنیدی

ص ۴۴

جنیدی کے بارے میں بھی بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ سکینہ نے اس کی صرف ایک مثنوی "ماہ پیکر" کا ذکر کیا ہے۔

جنیدی کے نام میں اختلاف ہے شمس اللہ قادری نے اس کا نام شیخ احمد اور نصیر الدین ہاشمی نے علی اکبر لکھا ہے۔

جنیدی سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۷۲-۱۶۱۴ء) کے عہد میں ایک عہدے پر فائز تھا۔ وہ بعد ازاں برہان پور میں بھی رہا۔ جنیدی کی شہرت کا سبب اس کی مثنوی "ماہ پیکر" ہے۔ جو اس نے ۱۶۵۴ / ۱۰۵۴ھ میں لکھی۔ جنیدی کی اہمیت کا سبب اس کی شعری زبان ہے۔ وہ صاف ستھری اور سادہ زبان کا شاعر ہے۔ اسے خاص طور خارجی منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔ مناظر کی تصاویر مرتب کرنے میں وہ خصوصی طور پر اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کرتا ہے۔ تشبیہات کی تلاش میں وہ نہایت خوب صورت تشبیہیں ہمارے سامنے لاتا ہے۔

ص ۴۴

طبعی

طبعی، سلطان عبداللہ قطب شاہ (م ۱۶۷۲ء) اور ابوالحسن تاناشاہ (م ۱۶۹۹ء) کے زمانے میں موجود تھا۔ اس کی مثنوی "بہرام گل اندام" خصوصی شہرت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ یہ صرف چالیس دن کے اندر لکھی گئی ہے۔ طبعی نے اس مثنوی کی بنیاد "ہفت پیکر" پر رکھی تھی۔

طبعی کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عربی، فارسی کے ساتھ مقامی شعری لغت کو بھی استعمال کیا ہے جس سے اس کے فن میں زیادہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ مثنوی اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے نقادوں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ طبعی نے بڑی فن کارانہ چابکدستی سے قصے کے اتار چڑھاؤ، تسلسل، ترتیب اور منطقی انجام کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طبعی نے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ دکنی شعراء کے مقابلہ میں اس نے عربی فارسی الفاظ کو شاعری میں ان کے صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس کے اسی عمل سے مثنوی کے فنی حسن اور اس کی لسانی خوبیوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ طبعی کی یہ مثنوی ظاہر کرتی ہے کہ دکن پر شمالی ہند کی زبان مؤثر طور پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی ہے اور اب تیزی سے یہ زبان دکن میں نئے معیارات بنا رہی ہے جس میں ایک خوب صورت شعری لغت وجود میں آ رہی ہے۔

ص ۴۴

ابوالحسن تاناشاہ

سکینہ نے تاناشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا ایک شعر گلشنِ ہند میں ملتا ہے۔ تاناشاہ کے یہاں ایک غزل 'دکن میں اُردو' سے پیش کی جاتی ہے۔

اے سروِ گلبدن تو ذراٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کو مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لبِ تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ
چاہتا ہوں وصفِ قد میں کروں فکر شعر کی
اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ
اے جانِ بوالحسن توں اچھے خوش لٹک ستی
بندِ قبا کوں کھول کے صحنِ چمن میں آ

تاناشاہ کی یہ غزل فارسی اسلوب کے اُن اثرات کو واضح کرتی ہے جو اس کے عہد ۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۶ء تک دکن کے ادب پر نظر آنے لگے تھے۔ اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی شعری کا عکس دکن کی شاعری پر اب گہرا اثر ہونے لگا ہے۔

ص ۴۴

فائز

فائز کی ایک تصنیف 'رضوان شاہ روح افزا' ہے جو ۱۶۸۲ء میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کی زبان شستہ، صاف اور رواں ہے۔ یہ مثنوی پروفیسر سید محمد نے مرتب کر کے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے ۱۹۵۶ء میں شائع کی ہے۔

ص ۴۵

مرزا

مرزا دکن کے ان شعراء میں سے ہے کہ جنھوں نے یہاں مرثیہ کی روایت کی تشکیل میں نمایاں طور پہ حصّہ لیا۔ مرزا کے حالاتِ زندگی تاریکی میں ہیں۔ بساتین السلاطین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا علی عادل شاہ ثانی کے دورِ حکومت ۱۶۵۷ء میں فوت ہوا۔ وہ عادل شاہی دور کا سب سے بڑا مرثیہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ساری عمر میں مرثیہ، حمد، نعت اور منقبت کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ مرزا بیجاپور میں مراثی پڑھنے میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ اس کا پورا کلام شائع نہیں ہوا۔ اس کے مراثی

کے مخطوطات اڈنبرا، انجمن ترقی اردو کراچی اور دکن میں محفوظ ہیں۔ مرزا کے مراثی کی اہمیت اس میں ہے کہ اس نے شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان سے مرثیہ کی ادبی حیثیت بلند کی۔

رستمی

ص ۴۶

رستمی نے ابن حسام کی فارسی مثنوی خاور نامہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ابن حسام نے خاور نامہ فردوسی کے شاہنامہ کے جواب میں تصنیف کیا تھا۔ رستمی کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ یہ اردو کی سب سے زیادہ قدیم اور ضخیم ترین رزمیہ مثنوی ہے۔ رستمی نے یہ ترجمہ ملکہ خدیجہ کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ ترجمہ اٹھارہ ماہ میں مکمل ہوا اور یہ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔

"خاور نامہ" کے ہیرو حضرت علیؓ ہیں۔ یہ ایک فرضی قسم کی رزمیہ داستان ہے۔

سودا

ص ۲۸

بقول رام بابو سکسینہ، سودا کے بزرگ کابل کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر سودا کے کلام کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ سودا نے تو کابل کے مغلوں کے خلاف سخت زہر اگلا ہے۔ کلیاتِ سودا میں ایک ہجو ہے جو حکیم آفتاب کی فرمائش پر میر علی تائق کی ہجو کے جواب میں کہی گئی ہے۔ اس کے ایک بند میں کابلی مغلوں کے متعلق کہتے ہیں۔

وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی	شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی
ہرگز کسے نگویست آغا علی قلی	کونان کی نون کہنے پہ تیری زبان جھکی

زیں گفتگو محبتِ دل خود شاد کردہ

سودا اگر کابل کے مغل ہوتے تو ہرگز یہ انداز اختیار نہ کرتے۔ ایک تذکرہ نگار نقش علی جو سودا سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے اجداد کا وطن بخارا بتاتے ہیں۔ (باغ معانی ورق ۹۲ ب بانکی پور لائبریری پٹنہ بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا ص ۵۵ از خلیق انجم) ایک اردو تذکرہ نگار بھگوان داس ہندی بھی ان کا وطن بخارا بتاتے ہیں۔ (سفینۂ ہندی ص ۲۵)

ص ۳۵۶

شیخ عین الدین گنج العلم

شیخ عین الدین کا سنہ پیدائش ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء ہے۔ آپ دہلی میں علاؤالدین خلجی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ شیخ عین الدین نے علوم کی تکمیل گجرات میں کی۔ بعد ازاں آپ بیجاپور چلے گئے جہاں ساری عمر رشد و ہدایت کے کاموں میں گزار دی اور یہاں پر انہوں نے تصنیف و تالیف کا زبردست کام بھی کیا۔ شیخ کی کتابوں کی کل تعداد ۱۳۲ بتائی جاتی ہے۔ جن کا تعلق تصوف، شریعت اور تاریخ سے ہے۔ ان کا انتقال

۱۳۹۶ء میں ہوا۔

شیخ الدین کے نثری رسائل کا سراغ حکیم شمس اللہ قادری نے دیا تھا۔ "اُردوئے قدیم" میں ان کے بقول شیخ نے دکھنی زبان میں کئی چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کئے تھے۔ منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی تعداد چالیس تھی اور ان میں فرائض و سنن کے متعلق احکام درج تھے۔

شیخ عین الدین کے مذکورہ بالا نثری رسائل کے وجود سے بعض محققین انکار بھی کرتے ہیں۔ مثلاً نصیر الدین ہاشمی نے انہیں دکن میں اردو میں شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ رسائل ابھی تحقیق طلب ہیں۔

ص ۳۵۶

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز ۱۳۲۰ء میں دلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بزرگ ہرات سے آکر پانچویں صدی ہجری میں آباد ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب بچپن ہی میں والدین کے ساتھ دکن گئے۔ آپ پندرہ برس کی عمر میں واپس دلی آئے اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور یہاں علوم ظاہری و علوم باطنی کے حصول میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انیس برس کی عمر میں مروجہ علوم کی ترکیب کے بعد صوفیانہ ریاضت اور مجاہدے کی منزلوں سے گزرنے لگے اور اس زمانے میں آپ نے مختلف کتابوں پر حواشی لکھے اور شروح تیار کیں جن میں "فصوص الحکم" کی شرح بھی شامل تھی۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ۱۳۵۶ء میں حضرت چراغ دہلی کے انتقال کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے اور دلی میں توحید کا درس دینے لگے۔ جس زمانے میں امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کیا، حضرت صاحب دہلی سے گوالیار چلے گئے تاکہ اس ناگہانی آفت سے اپنی عزت و آبرو محفوظ رکھ سکیں۔ بعد ازاں خواجہ صاحب مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ۱۴۰۰ء میں گلبرگہ پہنچے۔ جہاں سلطان فیروز شاہ بہمنی نے اپنے خاندان اور ارکان سلطنت کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور بصد عزت و اعزاز انہیں گلبرگہ لایا۔ خواجہ صاحب مرتے دم تک گلبرگہ کی سرزمین میں رہے اور سارا علاقہ آپ کی سیرت و کردار سے جگمگانے لگے اور یہاں ان کے عقیدت مندوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوا۔ گلبرگہ ہی میں خواجہ صاحب نے ۱۴۲۱ء میں وفات پائی۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں کتب تصنیف کیں۔ خواجہ صاحب نے اردو زبان میں کئی رسالے تصنیف کئے۔ ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لئے اور مضبوط بنانے کے لئے انہوں کی [illegible] اور عام فہم زبان میں مطالب بیان کئے جائیں تاکہ وہ بآسانی ان مطالب کو سمجھ سکیں اور [illegible] یں اس طرح ان کے مسلک کی اشاعت ہو سکے

خواجہ صاحب کے تین رسالے مشہور ہیں۔ معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور سہ بارہ۔ ان میں سے معراج العاشقین کو اردو نثر میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ رسالہ قرآن اور سنت کے حوالوں سے تصوف کے جملہ مسائل کی شرح کرتا ہے۔ خواجہ صاحب بتاتے ہیں کہ انسان کس طرح عاشق یعنی حضرت محمدؐ کے ذریعے ذات خداوندی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

معراج العاشقین اردو نثر کی ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔ یہ کتاب اردو نثر کے نئے بنتے ہوئے ڈھانچے اور اس کے ادبی اسلوب کی روشن مثال ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر اس عہد میں کس طرح سے زبان کا دامن وسیع کرنے میں مصروف تھے اور کس طرح سے بیان میں نئی صلاحیتیں پیدا ہو رہی تھیں جن سے اردو نثر کا ایک نیا وجود تشکیل پانے لگا تھا۔

ص ۳۵۶

عبداللہ الحسینی

عبداللہ الحسینی نے حضرت عبدالقادر جیلانی کی تصنیف نشاط العشق کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے معتقدین تک ان کی آواز پہنچ سکے اور وہ اپنے بزرگوں کے ارشادات عالیہ سے مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھا مگر اب یہ نسخہ ناپید ہے۔

ص ۳۵۶

شاہ میراں جی شمس العشاق

شاہ میراں جی دکن کے اکابر صوفیا میں سے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بقول آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور کچھ دنوں بعد ہندوستان تشریف لائے۔ ان کا سنہ پیدائش نامعلوم ہے۔ سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ بقول مولوی عبدالحق وہ ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶ء میں فوت ہوئے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶ء ان کا سنہ پیدائش ہے اور ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء سنہ وفات۔

شاہ میراں جی کا فیضان عام تھا۔ بیجاپور میں لاکھوں آدمی ان کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہوتے تھے۔ شاہ میراں جی کے نظم و نثر میں کئی رسائل ملتے ہیں۔ ان کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ شہادت الحقیقت

۲۔ خوش نامہ

۳۔ خوش نغز

۴۔ گنج عرفان

شاہ میراں جی کی نثری تصانیف حسب ذیل مشہور ہیں:

۱۔ گل باس

۲۔ جل ترنگ

۳۔ سب رس یا تاج الحقائق

۴۔ شرح مرغوب القلوب

ص ۳۵۶

شاہ برہان الدین جانمؔ

شاہ برہان الدین جانم سولہویں صدی عیسوی کے صوفی بزرگ ہیں۔ آپ بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند تھے اور باپ کے بعد مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ جانم نے علوم ظاہری اور علوم باطنی کی تربیت اپنے والدگرامی سے حاصل کی۔ آپ بہت رقیق القلب بزرگ تھے اور صوفیا کے مسلک کے مطابق انسانوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دکن میں ان کے زہد و تقویٰ کی دھوم تھی اور دور دور سے خلق خدا ان سے رشد و ہدایت کا درس لینے آتی تھی۔ وہ ایک منبع کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس سے روحانی فیضان مستقل طور پر جاری رہتا تھا اور ہر آنے والا اس سے اپنی روحانی پیاس کی تسکین کرتا تھا۔

برہان الدین جانم کی سترہ تصانیف کا اب تک سراغ مل سکا ہے جن کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ ارشاد نامہ

۲۔ منفعت نامہ

۳۔ سک سہیلا

۴۔ حجۃ البقاء

۵۔ نسیم الکلام

۶۔ رموز الواصلین

۷۔ بشارت الذکر

۸۔ وصیت الہادی

۹۔ نکتہ واحد

۱۰۔ کفر نامہ

شاہ برہان الدین جانم کی نثری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کلمۃ الحقائق

۲۔ مقصود ابتدائی

۳۔ ذکر جلی

۴۔ کلمۃ الاسرار

۵۔ معرفت القلوب

۶۔ ہشت مسائل

۷۔ رسالہ تصوف

ان رسائل کی تفصیلات کے لئے دیکھئے ۰ اردو نثر کا آغاز و ارتقاء از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ۔

ص ۳۵۶

میراں یعقوب

میراں یعقوب، میراں حسینی خدا نما کے مرید تھے۔ ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی شہرت کا سبب ان کی کتاب 'شمائل الاتقیا' ہے۔ اصل کتاب فارسی میں برہان الدین غریب کے مرید شیخ رکن الدین نے شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں مصنف نے فارسی، عربی کی تقریباً سو کتابوں سے تصوف کے متعلق بہت سے مقولے اور روایات جمع کر دی تھیں۔ اس کی فہرست میراں یعقوب نے اپنے ترجمے میں بھی دی ہے۔

میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ چار حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں پچاس موضوع شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں تیس اور چوتھے حصے میں گیارہ گیارہ یعنی اس طرح کل اکانوے مسائل پر اس میں بحث کی گئی ہے۔

کتاب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ میراں یعقوب نے اس کتاب کا ترجمہ اپنے مرشد زادے شاہ امین الدین ثانی کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں ختم نہ ہو سکی کیونکہ ان کا انتقال ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء میں ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بھانجے خدا نما کے نواسے شاہ میراں ثانی ابن سید حسین خلیفہ ہوئے تو میراں یعقوب نے یہ کتاب ختم کر کے ان کی خدمت میں پیش کی۔

شمائل الاتقیاء کی نثر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اس دور کی ترقی پذیر نثر کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم لغت کی جگہ اب نئی لغت زبان کا حصہ بن رہی ہے اور نئے لفظ زبان کی فصاحت کو بڑھا رہے ہیں۔ یہ اسلوب نثر دکن کے نئے اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے کونسی مثبت تبدیلیاں ترقی کر رہی تھیں۔